علامہ شبلی نعمانی

سیرۃ النبی ﷺ

اوّل

دار المصنفین شبلی اکیڈمی

اعظم گڑھ یو۔پی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی یا ایہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما

کتاب مستطاب

سیرۃ النبیؐ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حصہ اول

از ولادت تا ختم سلسلہ غزوات مع مقدمہ مشتمل بر نقد فن سیرۃ و تاریخ عرب قبل ظہور و بعثت

تالیف

حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

کتاب : سیرۃ النبی حصہ اول

مصنف : علامہ شبلی نعمانیؒ

صفحات : ۵۱۲

ایڈیشن : طبع جدید ۱۹۹۶ء

قیمت : مجلد - ۱۹۰ روپے، غیر مجلد - ۱۷۰ روپے

مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ (الہند)

ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ (الہند)

سیرۃ النبی حصہ اوّل کا یہ اضافہ شدہ ایڈیشن
ڈاکٹر نسیم جہاں صاحبہ (حفیدۂ مصنفؒ)
کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔

باہتمام

عبدالمنان ہلالی

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حصہ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع جدید

سیرۃ النبیؐ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کی سب سے مقدس و مقبول کتاب ہے، جس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

تقریباً ایک صدی پہلے جب **علامہ شبلیؒ** نے پورے جوش و سرمستی سے یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی تو ان کی زندگی کی شام ہو چکی تھی، اور وہ طرح طرح کی بیماریوں اور مختلف قسم کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے، اُس وقت آج کل کی طرح حوالے کی کتابیں بھی دستیاب نہیں تھیں، لیکن اس کے باوجود وہ ایسی عظیم الشان کتاب دنیا کو دے گئے جس کا جواب مشکل ہے ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشآء واللہ ذو الفضل العظیم ۝

تاہم انسان کے کام میں کور کسر رہ ہی جاتی ہے، اس لئے مصنف کے سعادت مند شاگرد اور سلسلۂ سیرت کے متمم مولانا **سید سلیمان ندویؒ** نے وقتاً فوقتاً اس میں تصحیح و اضافہ کی ضرورت محسوس کی، آخری مرتبہ انہوں نے ۱۳۶۴ھ میں تصحیح کی تھی۔ جو چوتھے ایڈیشن سے اب تک برابر اس میں شامل چلی آرہی ہے۔ اس عرصہ میں بھی اس جلد کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ بار بار چھپنے اور بعض دوسری وجہوں سے اب پھر اس میں متعدد قسم کی غلطیاں راہ پا گئی تھیں اس لئے قدردانوں کی طرف سے **سیرۃ النبیؐ** کے ایسے صحیح و محقق ایڈیشن کا تقاضا برابر ہو رہا تھا، جس کی طباعت بھی اچھی ہو۔

یہ بہت وقت طلب مگر ضروری کام تھا اس لئے ہمارے رفقا سال دو سال سے **سیرۃ النبیؐ** کی تمام جلدوں کی تصحیح میں لگے ہوئے ہیں، جلد اوّل کی تصحیح و مراجعت کا کام مولوی **محمد عارف** عمری نے مقدور بھر محنت سے کیا اور اس کی **ببلوگرافی** بھی تیار کی جو کتاب کے آخر میں شامل ہے، پرانی فہرست میں بھی کسی قدر رد و بدل کی ضرورت محسوس کی گئی جو کر دی گئی ہے۔

گذشتہ کئی مہینوں سے یہ ناچیز بھی اسی جلد کی تصحیح و مقابلہ کے کام میں مصروف رہا،

اس کے دوران اصل کتاب کو بار بار پڑھنے کے علاوہ پچھلے ایڈیشنوں اور مصنف کے اصل مبیضہ نیز کافی حد تک مآخذ و مراجع سے مقابلہ و مراجعت کرنی پڑی۔ تاکہ نئے ایڈیشن میں مطبع کے اغلاط اور دوسری فروگزاشتوں کی تصحیح ہو جائے، ظاہر ہے اس اہتمام کے بعد بھی غلطیاں رہ گئی ہوں گی، اس لئے قارئین سے ان کی نشاندہی فرمانے کی درخواست ہے۔

پندرہ[۱۵] سولہ[۱۶] برس پہلے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم پاکستان تشریف لے گئے تھے تو وہاں سے دارالمصنفین کی بعض کتابوں کے اشاریے بھی اپنے ساتھ لائے تھے، جن میں سیرۃ النبیؐ حصہ اول کا اشاریہ بھی تھا، اس کو مفید سمجھ کر ترمیم کے بعد اس ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا ہے، یہ انڈکس جناب روحی طیبی صاحبہ نے ۱۹۷۹ء میں تیار کیا تھا، اُس وقت وہ جامعہ کراچی میں ایم۔ اے فائنل کی طالبہ تھیں۔

کتابت کی دشواری پر قابو پانے اور صاف ستھری طباعت کے لئے دارالمصنفین نے کمپیوٹر خریدا اور اپنے ایک حوصلہ مند و جواں سال کارکن عبدالرحمٰن عباسی قمر کو کمپیوٹر کی ٹریننگ دلائی، انہوں نے بجا طور پر اپنے کام کا آغاز اسی جلد سے کیا اور بڑی دلچسپی، شوق اور محنت سے اس کی کمپوزنگ کی۔ اب وہ دوسری جلدوں کا کام بھی انشاء اللہ اسی لگن اور محنت سے کریں گے۔

سیرۃ النبیؐ کی پہلی اشاعت کے مصارف نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال نے اپنے ذمے لے لئے تھے، یہ حسن اتفاق ہے کہ اس نئے ایڈیشن کی اشاعت بھی ایک خاتون ڈاکٹر نسیم جہاں صاحبہ کے عطیہ خاص سے ہو رہی ہے، جن کو مصنفؒ سیرت کی پوتی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں نیک بخت خواتین کو جنت الفردوس نصیب کرے آمین!

ناچیز

ضیاء الدین اصلاحی

۷/ شوال المکرم ۱۴۱۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبعِ چہارم سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اوّل

سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت بخشی وہ مصنف اور جامع دونوں کے لئے بڑی نعمت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات کے بعد جب سیرۃ کا مسودہ مصنف کی وصیت کے مطابق اس ہیچمدان کے ہاتھ آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاد سے ہونی چاہئے، استاد کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا، اگر کبھی بہ ضرورت ایسی گستاخی کرنی پڑتی تھی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا، مسودہ کا بیضہ مصنف کے سامنے ہو چکا تھا، اس لئے اس بیضہ کا مقابلہ مسودہ سے اور نہ مسودہ کا مقابلہ اصل ماخذوں سے میں نے کیا، بلکہ مصنف کی امانت جوں کی توں ناظرین کے سپرد کر دی، بجز اس کے کہ بعض مقامات پر مصنف کے اشاروں کے مطابق بعض چیزوں کا اضافہ ہلالین میں کر دیا جس کی تصریح دیباچہ میں موجود ہے۔

اس کے بعد اس نسخہ کی نقل در نقل چھپتی رہی، اور مقابلہ اور تصحیح ماخذ کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن اس اثنا میں کبھی کبھی مراجعت کے وقت بعض مقاموں پر تصحیح اور اضافہ کی نئی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور اس کے مطابق ایک نسخہ پر یہ تصحیحات اور اضافے وقتاً فوقتاً کرتا رہا۔

اس دفعہ جب نئے نسخے کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودہ کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسیوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا، اور ہزاروں صفحوں کو الٹنا، متعدد مختلف روایتوں کو پرکھنا، اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی، مجھے یہ لکھنے میں بڑی خوشی ہے کہ لائق عزیز مولانا محمد اویس نگرامی ندوی اس کام میں میرے دست و بازو ثابت ہوئے، واقعات کی تلاش اور جانچ، روایتوں کی چھان بین اصل عبارتوں سے مسودہ کی تطبیق اور حدیث اور سیرت کی کتابوں کی طرف از سرِ نو مراجعت میں ان سے بڑی مدد ملی۔

کچھ مقام ایسے بھی تھے جہاں اس ہیچمداں جامع کو مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، اس دفعہ وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا، کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا دفعِ شبہہ کی ضرورت تھی، وہاں اس ضرورت کو پورا کیا گیا، بعض مسامحات پر تنبیہہ مناسب تھی وہ کی گئی، کہیں فرو تر ماخذ کا حوالہ تھا، اور اثنائے مطالعہ میں اس سے بالاتر ماخذ ملا تو اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دو چار مقام میں عدد کی غلطی جو اردو ہندسوں میں اکثر ہو جاتی ہے اصل بیضہ میں بھی موجود تھی، مراجعت کے وقت ان کی غلطی معلوم ہوتی، اور اب ان کی تصحیح کر دی گئی، مثلاً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کی قیمت سوا روپئے چھپ گئی تھی، حالانکہ وہ سوا سو ہے، اسی طرح غزوۂ احزاب میں کفار کے لشکر کی تعداد ۲۴ ہزار درج ہوتی تھی، حالانکہ وہ بعض روایات میں ۱۴ ہزار لیکن صحیح روایات میں ۱۰ ہزار ہے۔

مولانا کی زندگی میں اس کی تصنیف کے وقت ان کو بعض کتابیں قلمی ملی تھیں، جیسے روض الانف جس سے پورا استفادہ دقت طلب تھا، اب وہ چھپ گئی ہے، بعض کتابوں کی ان کو تلاش ہی رہی، مگر ان کو مل نہ سکی، جیسے کتاب البدایہ والنہایہ ابن کثیر، مصنف سے اکثر حسرت کے ساتھ سنا کہ افسوس تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب وہ چھپ کر عام ہو گئی، مستدرک حاکم اس وقت تک ناپید تھی اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی، غرض ان کتابوں کے ہاتھ آجانے سے بہت سے نئے معلومات بڑھ گئے، چنانچہ اس نسخہ کی تصحیح و اضافہ میں ان سے کام لیا گیا۔

اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ پوری کتاب کے واقعات کو ازسرِ نو حدیث و سیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے، اور اس میں جہاں نقص نظر آیا دور کیا گیا ہے۔

۲۔ تصحیحِ بیان دفعِ شبہہ، رفعِ ابہام اور تشریح کے لئے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں۔

۳۔ مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہہ کی گئی ہے۔

۴۔ کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے تھے، اس نسخہ میں ان کو بڑھا دیا گیا ہے، کہیں صرف

کتابوں کے نام تھے، اس دفعہ ان کے صفحے یا باب بھی لکھ دیئے گئے۔

۵۔ جہاں صرف صفحوں کے حوالے تھے، ابواب اور فصول کے حوالے بھی دے دیئے گئے، تاکہ جس کے پاس ماخذ کی کتاب کا جو ایڈیشن ہو اس میں نکال کر دیکھ لیا جاسکے۔

۶۔ طبع اوّل کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابیں چھپی تھیں، ان سے استفادہ کر کے اگر کوئی نئی بات ان میں ملی ہے تو اس کا اضافہ کیا گیا۔

۷۔ اگر کوئی حوالہ پہلے کسی نیچے درجہ کا تھا، اور بعد کو اس سے اعلیٰ درجہ کا حوالہ ملا، تو اس کو بڑھایا گیا۔

۸۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ مبارک کے ساتھ صلعم کے اختصار کے بجائے پورا (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھنے کا اہتمام کیا گیا، تاکہ اس تساہل سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو۔

غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلے میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمدان کے خطاکار قلم سے حضرت کعبؓ بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی، جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے، اور اب میں اپنی اس غلطی و نادانی کو مان کر اس عبارت کو قلمزد کر کے صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی براءت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں۔

بندہ ہماں بہ کہ زتقصیرِ خویش　　عذر بہ درگاہ خدا آورد

جن لوگوں کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہوں وہ اپنے نسخہ سے (۱) ان سطروں کو کاٹ دیں تو بڑی مہربانی ہو، اب یہ موجودہ نسخہ طبع اوّل سے بہت سی باتوں میں بہتر ہو گیا ہے، اس موجودہ نسخہ میں انسانی استطاعت کے مطابق پوری طرح تصحیح کی بھی کوشش کی گئی ہے، تاہم انسان انسان ہے، خطا و نسیان اس کا خمیر ہے، کسی ناظرِ کتاب کو اب بھی کوئی غلطی معلوم ہو تو وہ ضرور مطلع فرما کر ممنونِ کرم کریں۔

آخر میں پاک پروردگار کی بارگاہ عالی میں دعا ہے کہ وہ میری خطا و نسیان سے درگذر فرما کر اس خدمت کو قبول کا شرف بخشے، اور مسلمانوں کو اس سے بیش از بیش مستفید

(۱) یہ عبارت سیرۃ النبیؐ جلد اوّل کے صفحہ ۳۰۵ کی سطر ۹ تا ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ اور طبع مابعد کے صفحہ ۳۲۳ کی سطر ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ میں ہے۔

فرما کر اس گنہگار کے لئے بخشائش کا ذریعہ بنائے و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہیچمداں

سید سلیمان ندوی

یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچۂ طبعِ دوم

سیرۃ نبویؐ جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے۔ اس اثناء میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ خاکسارانِ دار المصنفین کے لئے فخر و نازش کا سرمایہ ہے، نہ صرف یہ کہ عام قدردانوں نے اس کو جان و دل سے خریدا، اور امراء اور والیانِ ممالک نے اس کی خدمت کو سعادتِ دارین سمجھا بلکہ خواص اور علماء کے طبقہ نے بھی اس کی قدرشناسی کی۔

ہندوستان میں اہلِ علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے اپنے فن کی میزانِ نقد میں سیرت کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیاتِ قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہلِ تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پرتال کی، اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص و محبت سے انہوں نے اپنے نتائج افکار سے ہم کو مطلع کیا، اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

طبع اول میں جیسا کہ خاتمہ میں ہم نے اقرار کیا تھا، چھاپہ کے اغلاط اور سہو کے چند مسامحات رہ گئے تھے، اس طبع میں جہاں تک امکانِ انسانی ہے تصحیح کی انتہائی کوشش کی گئی ہے اور یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ اغلاط اور مسامحات سے پاک ہوگا، جو لوگ سیرت پر نقد کرنا چاہتے ہوں، ان کو یہی نسخہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

طبعِ اول بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی لوگوں کا اصرار تھا کہ طبع ثانی کتابی تقطیع پر شائع ہو، تاکہ وہ بہ آسانی ہر وقت استعمال میں آسکے، یہ ان کی تعمیل ہے، انشاء اللہ ہر جلد کے طبع اول کی بڑی تقطیع کے بعد طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتی رہے گی۔

سید سلیمان ندوی

۲۸/ ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچۂ طبع اوّل

سیرۃ نبویؐ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے، آج ۲ سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے۔ میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ استادِ مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا، الحمدللہ کہ اس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہوتا ہوں، ع

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرت ناک منظر بھی سامنے ہے کہ مصنفؒ اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کر سکا اور حسنِ عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر اس کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا۔

مصنف مرحوم کو سیرۃ نبویؐ کے لکھنے کا خیال **الفاروق** کے بعد ہی پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں اس کا ایک مختصر سا حصہ یعنی غزوۂ اُحد تک وہ لکھ بھی چکے تھے (۱) کہ بعض مشکلات کی بنا پر رک گئے، لیکن ملک کا تقاضائے شوق برابر جاری رہا، بالآخر انہوں نے ۱۳۳۰ھ میں اس بارِ امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ پچاس ہزار روپے کے سرمایہ کے لئے انہوں نے قوم میں مرافعہ پیش کیا۔ سیکڑوں مسلمان اس خدمت کے لئے آگے بڑھے، ان میں فقرائے امت بھی تھے اور امرائے ملت بھی، لیکن یہ سعادت اخروی ازل ہی سے خادمۃ الملۃ النبویہ مخدومۃ الامۃ المحمدیۃ **نواب سلطان جہاں بیگم** تاج الہند فرماں روائے بھوپال متع اللہ المسلمین بطول بقائہا و دوام ملکہا کے لئے مقدر تھی، اس لئے وہ سب کے آگے بڑھیں اور سوانح نگارِ نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایہ سعادت کو اپنے خزانہ عامرہ میں شامل کر لیا۔ فرماں روا خواتینِ اسلام نے جو مذہبی

(۱) یہ مسودہ اب تک موجود ہے۔

کارنامے اب تک انجام دیئے ہیں، آیندہ مورخ غالبا اس کارنامے کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق اس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد شاید دوبارہ اس خدمت گذاری کے لئے مسلمانوں میں قرعہ اندازی ہوتی، لیکن فرماں روائے بھوپال نے مصنفؒ کے جانشینوں کے لئے بھی سلسلہ فیض کو برابر جاری رکھا، مصنف مرحوم کے منشا کے مطابق (۱) اس موقع پر منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخِ بھوپال کا نام لینا بھی ضروری ہے، جن کی مروحہ جنبانی سے نسیمِ سعادت کے جھونکے اس باغِ قدس میں دوبارہ آئے۔

مصنف مرحوم نے جو مسودہ چھوڑا تھا، اس میں اس حصہ تک بیضہ صاف تھا، البتہ تین چار مقامات پر اضافہ کی علامت بنی تھی، اور مطالب کا اشارہ تھا ان کو بڑھا دیا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ کی تکمیل کے بعد ان کو خیال آیا کہ قدیم مورخین کی طرح سنہ وار واقعات کی ترتیب رکھ کر ہر سنہ کے آخر میں جزئی حالات " واقعات متفرقہ " کے عنوان سے لکھ دیئے جائیں، چنانچہ بیضہ پر سنہ ۴ ھ تک اپنے قلم سے وہ لکھ سکے، یہ امانت جب میرے سپرد ہوئی تو میں نے بقیہ سنین کے آخر میں اسی قسم کے جزئیات متفرقہ کا اضافہ کردیا، حواشی یا حوالے کہیں کہیں چھوٹ گئے تھے، وہ ڈھونڈھ کر لکھے، لیکن اس کی کامل احتیاط کی گئی کہ جامع کا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف مصنفؒ کی عبارت میں نہ ملنے پائے، چنانچہ ان تمام جزئی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی گئی ہے، اس بنا پر لفظ صلعم یا جملہ ہائے معترضہ کے سوا جو چند فقرے اور عبارتیں قوسین میں ہیں وہ اضافہ ہیں۔

یہ پہلے خیال تھا کہ جلد اوّل کو وفات تک وسعت دی جائے، لیکن جب کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضخامت ۸۰۰ صفحے تک پہنچ جائے گی اور اس سے جلد کی نفاست کو صدمہ پہنچے گا، سامانِ طبع کی گرانی سے جو تعویق پیدا ہو رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ پہلی جلد سلسلہ جنگ و غزوات پر ختم کردی گئی اور دوسری جلد اسلام کی امن کی زندگی، تنظیم و تنسیق، اشاعتِ اسلام، وفات اور اخلاق کی

(۱) مکاتیب جلد اول صفحہ ۲۶۱۔

الگ کردی گئی۔ خدا وند تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی طبع و اشاعت کی توفیق عطا فرمائے، حسبی اللہ ونعم الوکیل۔

مصنف مرحوم کتاب کا سرنامہ لکھنے نہ پائے تھے۔ ان کے مسودات میں اتفاقاً یہ تحریر قلم زدہ مل گئی، اسی کو غنیمت سمجھ کر تبرکاً داخلِ کتاب کیا جاتا ہے۔

جامع

سید سلیمان ندوی

دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ ٢٠/ربیع الثانی ١٣٣٩ھ

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا، شہنشاہِ کونین
کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی
نذر لے کر آیا ہے'

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

"شبلی"

شوال ۱۳۳۰ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

(فن روایت)

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلامُ عَلیٰ رَسُولِہ مُحَمَّدٍ وَّآلِہ وَاَصحَابِہ اَجمَعِین

سیرۃ نبوی ﷺ کی تالیف کی ضرورت

عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض، اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے، یعنی پہلے ہر قسم کے فضائلِ اخلاق، زہد و تقویٰ عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں، اور پھر تمام عالم میں ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جاکر تمام ملک میں پھیلائی جائیں، اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسن اخلاق کی تعمیل کرائی جائے، اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں، اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا، لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے، جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو، جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے، اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامرِ سلطانی بن جائے، دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے، سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اور اسباب صرف ایوان تمدن کے نقش و نگار ہیں۔

پیغمبروں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت

لیکن اس وقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اس نے اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کئے ہیں، وہ فضائل اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتب درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائل اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراق تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اس لئے عالم انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامع کامل (۱) کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر و نگین بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہان بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریادل بھی، یہ برزخ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفہ یزدانی عالم کون کی آخری معراج ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ۔ ۵: ۳)

عالم فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لئے یہ ہستی جامع دنیا میں آکر ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اس لئے ضرور ہے کہ اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا، اس کے حلیہ وجود کے ایک ایک خط و خال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحل زندگی میں جہاں ضرورت

---

(۱) یہاں پر کتاب کی اس عبارت بالا کے مخاطب اہل کتاب ہیں جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیاء کے جو احوال مذکور ہیں وہ اسی صورت میں ہیں، اس لئے مصنف نے ان کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک باکمال اور ہمہ کمال ہستی کی ضرورت پر ان کے سامنے حجت قائم کی ہے۔

لیکن چونکہ ازروے اسلام ایک طرف تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے،

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ۔ ۲: ۲۸۵) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے،

اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالات نبوت سے متصف مانا جائے، دوسری طرف ارشاد ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ۔ ۲: ۲۵۳)

یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا اور ہم نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس یعنی جبریل سے فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے، ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے،

حضرات انبیاء علیہم السلام تمام کمالات نبوت و فضائل اخلاق سے یکساں سرفراز تھے، مگر زمانہ اور ماحول کے ضروریات

پیش آئے، رہنمائی کے کام آئے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام داعیان مذہب جامعیت کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، ان کے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں، جناب مسیحؑ کی ۳۳ سالہ زندگی میں صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں، فارس کے مصلحان دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر، افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے اس کا ذریعہ صرف موجودہ توراۃ ہے جو حضرت موسیٰ کے ۳۰۰ برس بعد عالم وجود میں آئی، یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ ان کے کارنامے اور اصول تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل وروایت کے آئینہ میں جس قدر ان کا ناتمام عکس اترا، اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا، قدرت خود ضرورت کی اندازہ داں ہے، اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔

تمام ارباب مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اسی قدر عزیز ہے، جس قدر دوسرے کو ہے، اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیت کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئیں گی، لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے، کہ دنیا میں وہ کون شخص گذرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی اس طرح قلمبند ہوا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) اور مصالح الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور، تمام انبیاء میں یکساں نہیں ہوا بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا، اور دوسرے کمال کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی، بہ مصلحت یہ کمال ظہور نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع و محل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس سے نفس کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے، اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورت حال ان انبیائے کرامؑ کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات وفضائل سے متصف نہ تھے۔

غزوہ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینے کا اور حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شدت و رحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں، اے ابو بکر تمہاری مثال ابراہیمؑ و عیسیٰؑ کی اور اے عمر تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے یعنی ایک فریق سے رحم و کرم کا اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا، (دیکھئے مستدرک حاکم غزوۂ بدر)

اس حدیث میں اسی نقطۂ اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے مختلف احوال مبارکہ میں رونما ہوا ہے، لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی تھی، اس لئے بہ ضرورت احوال آپؐ کے تمام کمالات آپؐ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوئے، اور آپؐ کی نبوت کے آفتاب عالمتاب کی ہر کرن دنیا کے لئے مشعل ہدایت بنی، اور ظلمتکدہ عالم کا ہر گوشہ آپؐ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پُر نور ہوا، صلی اللہ علیہ وسلم، اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ پیدا نہ ہونے پائے، جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین یا کسر شان پیدا ہو اس سے ایمان کے ضائع جانے کا خطرہ ہے۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے (معارف محرم وصفر ۱۳۷۶ھ میں مضمون "خلیل کی بشریت") "س"

ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہوسکا، اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، طریق معاشرت کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے، (محمد عربی فدیتہ بابی و امی)

سیرت کی ضرورت علمی حیثیت سے

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصد تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم و فنون کی صف میں سیرت (بیاگرفی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیل راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے، اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی و عمل، جد و جہد، ہمت و غیرت کی جو عجیب و غریب نیرنگیاں سکندر اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو "شخص" کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں، وہ کس وسعت اور استقصاء و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحل زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ و خم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فرد کامل، اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں، تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں، بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے، جس کا نام مبارک "محمد" (رسول اللہ) ہے، اللھم صل علیہ وسلم صلوۃ کثیرۃ یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے، اور مختصر یہ کہ مجموعہ ضروریات دینی و دنیوی ہے۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرۃ نبویؐ کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جراءت نہ کرسکا تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔

علم کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت

اگلے زمانہ میں سیرۃ کی ضرورت، صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مورخین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں، اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے، جو پیغمبرؐ کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے، جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا، کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرۃ نبویؐ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا، یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہو سکتی۔

سیرت اور حدیث میں فرق

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ خاص سیرت (۱) پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا، حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، سیرۃ نبویؐ میں لکھتے ہیں،

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ماصح وماقد انکرا

یعنی طالب فن کو جاننا چاہیئے کہ سیرۃ میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں صحیح بھی اور قابل انکار بھی۔

---

(۱) اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے، جو آج کل کی قلت علم اور ناآشنائی فن نے پیدا کر دی ہے، بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فن حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے، یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں، تو یہ سیرت بن گئی، اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں، مثلاً صحیح بخاری، مسلم، تو یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ "سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی" اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے، محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں، اور

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں، اس بنا پر ضرور تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث و رجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں، اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے ایک مستند تصنیف تیار کی جائے، لیکن سینکڑوں کتابوں کا استقصاء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵) سیرت بھی، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں، فقہ کی بھی یہی اصطلاح ہے، فقہ میں جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں، اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا چنانچہ تیسری صدی تک، جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں، مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فن حدیث سے ایک الگ چیز ہے، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام ارباب سیر ایک طرف ہوتے ہیں، اور امام بخاری و مسلم ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے، کہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہے، لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے، ہم اس موقع پر ایک دو واقعہ مثال کے طور پر لکھتے ہیں۔

غزوات میں ایک غزوہ ذو قرد کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا، لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے، جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے۔

لایختلف اهل السیر ان غزوة ذی قرد کانت قبل الحدیبیة فیکون ما وقع فی حدیث سلمة من وهم بعض الرواة

اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوہ ذی قرد، حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا، تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے وہ کسی راوی کا وہم ہوگا۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (ذکر غزوہ ذی قرد) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں۔

فعلی هذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوة ذی قرد اصح مما ذکره اهل السیر

تو اس بنا پر صحیح (مسلم) میں غزوہ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے، جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے۔

دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں انہوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے، جو آج بھی موجود ہے اس میں انہوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی، لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی، لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے، اس لئے نہ کر سکے۔ حافظ ابن حجر خود دمیاطی کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ودل هذا علی انه کان یعتقد الرجوع عن کثیر مما وافق فیه اهل السیر وخالف الاحادیث الصحیحة وان

اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انہوں نے ارباب سیرت سے اتفاق کر کے احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے ان سے رجوع کریں گے اور

کے ساتھ دیکھنا، اور ان سے معلومات کا اقتباس کرنا ایک شخص کا کام نہ تھا، اس کے ساتھ ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے واقفیت حاصل کی جائے، میں بدقسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا، اس لئے ایک محکمۂ تصنیف کی ضرورت تھی، جس میں قابل عربی داں اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں، خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے، تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبرؐ کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصاء کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے، اور نہ آئندہ توقع کی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے افعال اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶)

ذالک کلن بہ قبل تضلعہ منہا و لخروج نسخ کتابہ و انتشارہ لم یتمکن من تغیرہ (زرقانی بر مواہب جلد ۲ ص ۱۱)

یہ کہ یہ امر ان سے مہارت فن کے قبل صادر ہوا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے، اس لئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے۔

(۲) ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا، اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں۔

واما شیخہ الدمیاطی فادعی غلط الحدیث الصحیح وان جمیع اھل السیر علی خلافہ فتح الباری جزء ہفتم صفحہ ۳۲۲

باقی ان کے شیخ دمیاطی تو انہوں نے حدیث کی نسبت غلطی کا دعوی کیا ہے اور یہ کہ تمام اہل سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا رد بھی کیا ہے۔

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہ فن حدیث نہیں ہے اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

(۳) مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں، وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں، اس سے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

(۴) جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیر کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج بیسیوں کتابیں قدما سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں، مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیل مذکورہ بالا سے ظاہر ہوا ہو گا کہ ہماری اس عبارت کا کہ "سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی" اس کا کیا مطلب ہے اور کہاں تک صحیح ہے۔

اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے، اور اس زمانہ میں کئے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا، طبقات ابن سعد، کتاب الصحابہ لابن السکن، کتاب لعبد اللہ بن علی ابن جارود، کتاب العقیلی فی الصحابہ، کتاب ابن ابی حاتم الرازی، کتاب الازرق، کتاب الدولابی، کتاب البغوی، (۱) طبقات ابن ماکولا، اسد الغابہ، استیعاب، اصابہ فی احوال الصحابہ صرف انہی بزرگوں کے حالات میں ہیں، کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقاء میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درج تحریر ہو سکے ہیں۔

سیرۃ نبویؐ کے متعلق قدماء نے جو ذخیرہ (۲) مہیا کیا، اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کر دیتے ہیں کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لئے اس ذخیرہ سے کیونکر کام لیا جاسکتا ہے، اور کہاں تک تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔

فن سیرت کی ابتداء اور تحریری سرمایہ

عام طور پر یہ خیال ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا، اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ سے (تقریباً ۱۴۲ھ میں) ہوا، اس لئے اس زمانہ تک سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا، زبانی تھا، تحریری نہ تھا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج (گو کم سہی) مدت سے چلا آتا ہے، بہت قدیم زمانہ میں حمیری اور نابتی خط تھا، جس کے کتبے آج نہایت کثرت سے یورپ کی بدولت مہیا ہو گئے ہیں، اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا جو عربی خط کہلاتا ہے، اور جس نے بہت سی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتدا کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں، اکثر افسانہ ہیں، مثلاً ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اول اول جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا، ان کے یہ نام تھے، ابو جاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص، قریشیات (یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں،) اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدمؑ نے ایجاد کئے تھے، ابن الندیم نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا وہ تین شخص قبیلۂ بولان (قبیلۂ طے کی ایک شاخ) کے تھے، جو انبار میں آباد تھے، ان کے نام مرامر بن مرۃ، اسلم بن سدرہ، عامر بن جدرہ تھے۔

ان تمام روایتوں میں جو قرین قیاس ہے، وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمر بن شبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے، یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا، جو بنو مخلد ابن نضر بن کنانہ کے خاندان سے تھا، اور غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب قریش نے عروج حاصل کر لیا تھا، اور

(۱) ان کتابوں کا ذکر، استیعاب کے دیباچہ میں ہے۔ (۲) یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں، جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں، تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے، یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے حدیث کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

تجارت کے ذریعہ سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے، ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی جو عبدالمطلب بن ہاشم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کے یہ الفاظ تھے۔

حق عبد المطلب بن هاشم من اهل مكة على فلان ابن فلا ن الحميرى من اهل وزل صنعا عليه الف درهم فضة كيلا بالحديدة ومتى دعاه بها اجابه شهد الله والملكان (۱)

یہ عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا بادشاہ ہے) کا قرضہ فلاں شخص پر ہے، جو صنعاء کا رہنے والا ہے، یہ چاندی کے ہزار درہم ہیں، جب طلب کیا جائے گا وہ ادا کرے گا خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں۔

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیئے تھے، خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا (اور شاید کرام کاتبین کا) اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں ۱۷ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے، یعنی حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، طلحہؓ، زیدؓ، ابو حذیفہؓ، ابو سفیانؓ، شفاؓ بنت عبداللہ (۲) وغیرہ۔

بدر کی لڑائی جو سنہ ۲ھ میں ہوئی، اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے، ان سے فدیہ لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے، جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے ذمہ لے کر ان کو لکھنا سکھاوے، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو کاتب وحی ہیں اسی طرح لکھنا سیکھا تھا (۳)۔

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا، البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوئی تھیں یا نہیں، اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں، تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے قلمبند کرنے سے منع فرمایا تھا، مسلم کے یہ الفاظ ہیں۔

لاتكتبوا عنى ومن كتب عنى غير القران فليمحه ،

مجھ سے جو سنو اس کو قلمبند نہ کرو (بجز قرآن کے) اور کسی نے قلم بند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہیئے۔

---

(۱) ابن ندیم ص ۷، ۸ طبع مصر "س" (۲) فتوح البلدان ذکر خط ص ۴۷۱ مطبوعہ یورپ (۳) طبقات ابن سعد غزوہ بدر ص ۱۴۰

آنحضرتؐ کے زمانہ کی تحریریں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے کیونکہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے زمانہ میں بعض صحابہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت سے آپؐ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے، صحیح بخاری (باب العلم) میں حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے کہ "صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں، البتہ عبداللہ بن عمروؓ مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جو سنتے تھے، لکھ لیا کرتے تھے، قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، عبداللہ بن عمروؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ نے دہان مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے"۔(۱)

خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبداللہؓ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیثیں قلمبند کرلیا کرتے تھے، صادقہ (۲) تھا۔

ایک دفعہ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لاچکے ہیں، ان کے نام قلمبند کئے جائیں، چنانچہ پندرہ سو ۱۵۰۰ اصحابہ کے نام دفتر میں درج کئے گئے۔ (۳)

خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ "جب لوگ کثرت سے حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لئے جمع ہوجاتے تھے، تو وہ ایک جنگ نکال لاتے تھے، کہ "یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سن کر لکھ لی تھیں"۔

متعدد قبائل کو آپؐ نے جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھیجے وہ تحریری تھے، اور کتب احادیث میں بعینہا منقول ہیں، اسی طرح سلاطین کو دعوت اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے۔

صحیح بخاری (باب کتابۃ العلم) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کردیا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ناقہ پر سوار ہوکر خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص نے آکر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے، چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ اس شخص کے لئے وہ خطبہ قلمبند کرا دیا جائے۔

غرض اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہوگیا تھا،

(۱) جو حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ

(۱) ابوداؤد جلد ۲ ص ۷۷، (۲) جامع بیان العلم للقاضی ابن عبدالبر مطبوعہ مصر ص ۷۷، میں صادقہ کا ذکر ہے (۳) صحیح بخاری باب الجہاد

وغیرہ (۱) نے قلمبند کیں۔

(۲) تحریری احکام اور معاہدات (حدیبیہ وغیرہ) اور فرامین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل (۲) کے نام بھیجے۔

(۳) خطوط جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین (۳) اور امراء (۴) کے نام ارسال فرمائے۔

(۴) پندرہ سو (۱۵۰۰) صحابہؓ کے نام۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنوالعباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتبخانے سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں (۵)۔

مغازی

عرب میں علوم و فنون نہ تھے، صرف خاندانی معرکے اور لڑائیوں کے واقعات محفوظ رکھتے تھے، اس لحاظ سے قیاس یہ تھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واقعات اور افعال و اقوال میں سب سے پہلے مغازی کی روایتیں پھیلتیں، اور سب سے پہلے اسی فن کی بنیاد پڑتی۔ لیکن روایات کے تمام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر رہا، خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ نے زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال و افعال پر توجہ کی، جن کو شریعت سے تعلق تھا، اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے تھے۔

امام بخاری نے غزوہ احد کے ذکر میں سائب بن یزیدؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

صحبت عبدالرحمن بن عوف وطلحة بن عبیداللہ و المقداد و سعدا فما سمعت احدا منھم یحدث عن النبی صلی اللہ علیه وسلم الا انی سمعت طلحة یحدث عن یوم احد

میں عبدالرحمنؓ بن عوفؓ اور طلحہؓ بن عبیداللہؓ اور مقداد اور سعدؓ کی صحبت میں رہا لیکن میں نے ان کو کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حدیث بیان کرتے نہیں سنا۔ بجز اس کے کہ طلحہؓ غزوہ احد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور طلحہؓ و مقدادؓ و سعدؓ وقاص، اکابر صحابہؓ میں ہیں، ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اس لئے اس عبارت کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ غزوات کے واقعات نہیں بیان کرتے تھے، بجز اس کے کہ طلحہؓ جنگ احد کے واقعات بیان کیا

(۱) بخاری جلد ۱ ص ۲۱ و ۲۲ صحیفہ علیؓ و کتابتہ لرجل من الیمن (۲) سنن ابن ماجہ ص ۱۳۰ و ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۵۵۔۱۵۶ (۳) بخاری جلد ۱ ص ۵ و ایضاً ص ۱۵ (۴) بخاری جلد ۱ ص ۱۵ (۵) تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی۔ تذکرہ امام زہری۔

کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ علماء میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنالیا تھا، وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے، خواص میں اس قدر مستند نہیں خیال کئے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذّاب کہتے ہیں، ابن اسحاق کو ایک گروہ ثقہ کہتا ہے لیکن اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار سمجھتا ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

ثلاثة كتب ليس لها اصول المغازى والملاحم والتفسير (۱)

تین قسم کی کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں مغازی اور ملاحم اور تفسیر۔

خطیب بغدادی نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ امام ابن حنبل کی مراد ان خاص کتابوں سے ہوگی جو بے اصل ہیں، پھر لکھا ہے۔

اما كتب التفسير فمن اشهر ها كتابا الكلبى و مقاتل بن سليمان وقد قال احمد فى تفسير الكلبى من اوله الى آخره كذب

باقی تفسیر کی کتابیں تو ان میں سے کلبی اور مقاتل کی کتابیں بہت مشہور ہیں، امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ کلبی کی تفسیر اول سے اخیر تک جھوٹ ہے۔

پھر لکھتے ہیں۔

واما المغازى فمن اشهر ها كتاب محمد بن اسحاق و كان يا خذ من اهل الكتاب وقد قال الشافعى كتب الواقدى كذب،

باقی مغازی تو اس فن کی مشہور کتاب محمد ابن اسحاق کی کتاب ہے اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے، اور امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔

باوجود ان باتوں کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصہ نظر انداز کر دیا جاتا، اس لئے اکابر صحابہؓ اور محدثین نہایت احتیاط کے ساتھ جو واقعات جہاں تک خوب محفوظ ہوتے تھے، روایت کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کی ابتداء سلطنت کی وجہ سے ہوئی

صحابہ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا، لیکن بنو امیہ نے حکماً علماء سے تصنیفیں لکھوائیں، قاضی ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

كنا نكره كتاب العلم حتى اكرهنا عليه هؤلاء الا مراء (۲)

ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء نے ہم کو مجبور کیا۔

(۱) موضوعات ملا علی قاری مطبع مجتبائی ص ۸۵ (۲) مطبوعہ مصر ص ۱۳۶

سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر قدماء کی تاریخ مرتب کرائی جس کا نام اخبار الماضیین (۱) ہے۔

امیر معاویہؓ کے بعد عبدالملک بن مروان نے جو سنہ ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، ہر فن میں علماء سے تصنیفیں لکھوائیں، سعید بن جبیر جو اعلم العلماء تھے، ان کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی، عطا بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے، ان ہی کی تفسیر ہے، عطاء کو خزانہ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آ گیا تھا (۲)۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا تو انہوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی، تمام ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبویؐ مدون اور قلمبند کی جائیں سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے، ان سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلمبند کرائے اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے، علامہ ابن عبدالبر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں:۔

عن سعد بن ابراهيم قال امرنا عمر بن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبنا ها دفترا دفترا فبعث الى كل ارض له عليها سلطان دفترا (۳)	سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا ہم نے دفتر کے دفتر لکھے، عمرؓ نے جہاں جہاں ان کی حکومت تھی ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانے کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاد اور مدینہ کے قاضی تھے، ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا (۴)

حضرت عائشہؓ کی روایتیں

حدیث میں حضرت عائشہؓ کی مرویات کی ایک خاص حیثیت ہے، یعنی ان سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں، جو عقائد یا فقہ کے مہمات مسائل ہیں، اس لئے عمرؓ بن عبدالعزیز نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا، عمرۃ بنت عبدالرحمنؒ ایک خاتون تھیں، ان کو حضرت عائشہؓ نے خاص اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، وہ بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں، تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے ابو بکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرۃ کے مسائل اور روایات قلمبند کر کے بھیج دیں۔ (۵)

مغازی پر خاص توجہ

اب تک مغازی و سیر کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا تھا، حضرت عمرؓ ابن عبدالعزیز نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور حکم دیا کہ غزوات نبویؐ کا خاص حلقہ درس قائم کیا جائے، عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری المتوفی سنہ ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے ان کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں (۶)

(۱) فہرست ابن الندیم ص ۱۳۲۔ (۲) میزان الاعتدال ترجمہ عطاء بن دینار۔ (۳) مطبوعہ مصر ص ۳۶۔ (۴) طبقات ابن سعد جزء ثانی قسم ثانی ص ۱۳۴۔ (۵) تہذیب التہذیب ترجمہ ابو بکر بن محمد و عمرۃ بنت عبدالرحمن و طبقات ابن سعد جزء دوم حصہ دوم ص ۱۳۴ (۶) تہذیب التہذیب ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ

امام زہری اور فن سیرت

اسی زمانہ میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے: یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی، امام زہری اس زمانہ کے اعلم العلماء تھے، فقہ اور حدیث میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں، انہوں نے حدیث و روایات کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے، جوان بڈھے، عورت، مرد، جو مل جاتا، یہاں تک کہ پردہ نشیں عورتوں سے جاکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و حالات پوچھتے، اور قلمبند کرتے، (۱) وہ نسباً قریشی تھے، سنہ ۵۰ ھ میں پیدا ہوئے، بہت سے صحابہؓ کو دیکھا تھا، سنہ ۸۰ ھ میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے، اس نے بہت قدر و منزلت کی، کتاب المغازی غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت کے موافق لکھی، یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، اور مقربین خاص میں داخل تھے، ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم ان کے سپرد کی تھی، سنہ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

امام زہری کے تلامذہ

امام زہری کی وجہ سے مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا، ان کے حلقۂ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے، ان میں سے یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمار، عبدالرحمن بن عبدالعزیز، فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں ان لوگوں کا امتیازی وصف صاحب مغازی لکھا جاتا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ اور سیرت

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی، اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس فن کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ خاندان زبیر کے غلام تھے، عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا تھا، فن حدیث میں امام مالک ان کے شاگرد ہیں، امام مالک ان کے نہایت مداح تھے، اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے، کہ فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو، ان کے مغازی کے جو خصوصیات ہیں، یہ ہیں۔

(۱) مصنفین اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے، انہوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا۔

(۲) عام مصنفین کا یہ مذاق تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کئے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آجاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی اور صرف وہی روایتیں لیں، جو ان کے نزدیک صحیح ثابت ہوئیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب بہ نسبت اور کتبِ مغازی کے مختصر ہے۔

(۳) چونکہ روایتِ حدیث کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ بچپن اور آغاز شباب ہی سے حلقہ درس میں شامل ہو جاتے تھے، اور حدیثیں سن کر لوگوں سے روایت کرتے تھے،

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ امام زہری (محمد بن مسلم)

لیکن چونکہ اس عمر تک واقعات کا صحیح طور سے سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے اکثر روایتوں میں تغیر اور اختلاط ہو جاتا تھا، موسیٰ نے بخلاف اور لوگوں کے کبر سن میں اس فن کو سیکھا تھا، (۱) سنہ ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں، لیکن ایک مدت تک شائع و ذائع رہی، اور سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں کثرت سے اس کے حوالے آتے ہیں۔

محمد بن اسحاق اور سیرت

محمد بن اسحاق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امام فن مغازی کے نام سے مشہور ہیں، شہرت عام میں اگرچہ واقدی، ان سے کم نہیں لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلمہ عام ہے، اور اس لئے ان کی شہرت بدنامی کی شہرت ہے، محمد بن اسحاق تابعی ہیں، ایک صحابی (حضرت انسؓ) کو دیکھا تھا، علم حدیث میں کمال تھا، امام زہری کے دروازہ پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے، لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں، ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے، امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں، امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان کی روایت نہیں لی، لیکن جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے تاریخ میں تو اکثر واقعات انہی سے لیتے ہیں۔

فن مغازی کو انہوں نے اس قدر ترقی دی، اور اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ خلفائے عباسیہ جو زیادہ تر اور قسم کی تصنیفات کا مذاق رکھتے تھے، ان میں مغازی کا مذاق پیدا ہو گیا، چنانچہ ابن عدی نے اس احسان کا خاص طرح پر ذکر کیا ہے، ابن عدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس فن میں کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے رتبہ کو نہیں پہنچی (۲)۔

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ ان یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے، اور چونکہ یہ واقعات انہوں نے یہودیوں سے سنے ہوں گے، اس لئے ان پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا، علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے، اور ان کو ثقہ سمجھتے تھے، سنہ ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابو بکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا، اس کا قلمی نسخہ الہ آباد میں ہماری نظر سے گذرا ہے۔

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی، اور بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کئے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ منقح اور اضافہ کر کے مرتب کیا، جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے چونکہ اصل کتاب آج کم ملتی ہے اس لئے آج اس کی جو یادگار

---

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ موسیٰ بن عقبہ (۲) تہذیب التہذیب۔

موجود ہے، وہ یہی ابن ہشام کی کتاب ہے۔

ابن ہشام اور سیرت

ابن ہشام کا نام عبدالملک ہے، وہ نہایت ثقہ اور نامور محدث اور مورخ تھے، حمیر کے قبیلہ سے تھے، اور غالباً اسی تعلق سے سلاطین حمیر کی تاریخ لکھی جو آج بھی موجود ہے، انہوں نے سیرت میں یہ اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں، ان کی تفسیر بھی لکھی، سنہ ۲۱۳ یا ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت ابن ہشام کی مقبولیت کی بنا پر لوگوں نے اس کو نظم کیا، چنانچہ ابونصر فتح بن موسیٰ خضراوی المتوفی سنہ ۶۶۳ھ و عبدالعزیز بن احمد المعروف بہ سعدیری المتوفی فی حدود سنہ ۶۰۷ھ و ابو اسحاق انصاری تلمسانی و فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی سنہ ۷۹۳ ہجری نے منظوم کیا، اخیر کتاب میں قریباً دس ہزار شعر ہیں، اور اس کا نام فتح الغریب فی سیرۃ الحبیب ہے۔

ابن سعد اور سیرت

واقدی خود تو قابل ذکر نہیں لیکن ان کے تلامذۂ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔

ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابل اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابلِ سند ہیں، خطیب بغدادی نے ان کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں:

کان من اھل العلم و الفضل و الفھم و العدالۃ صنّف کتاباً کبیراً فی طبقات الصحابۃ و التابعین الی وقتہ فاجادفیہ و احسن (۱)

یہ موالیٔ بنی ہاشم سے تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بغداد میں سکونت اختیار کرلی تھی، بلاذری جو مشہور مورخ ہیں، انہی کے شاگرد ہیں، سنہ ۲۳۰ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ان کی کتاب کا نام طبقات ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے، دو جلدیں خاص آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں ہیں، اور یہ حصہ دراصل سیرۃ نبوی ہے، باقی جلدیں صحابہؓ (و تابعین) کے حالات میں ہیں اور چونکہ صحابہؓ کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر آتا ہے، اس لئے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

یہ کتاب تقریباً ناپید ہو چکی تھی، یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا، شہنشاہ جرمن کو اس کی طبع و اشاعت کا خیال ہوا، چنانچہ لاکھ روپے جیب خاص سے دیئے اور پروفیسر ساخو کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے اجزاء فراہم کر کے لائیں، پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر جا بجا سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں، یورپ کے بارہ پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی، چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ)

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ محمد بن سعد۔

میں چھپ کر شائع ہوا۔

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں، اس لئے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کر لی جاسکتی ہیں۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، چنانچہ کشف الظنون وغیرہ میں ان کے نام مذکور ہیں، لیکن چونکہ نام کے سوا ان کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں نہ ان کا آج وجود ہے، اس لئے ہم ان کے نام نظر انداز کرتے ہیں۔

امام بخاری اور سیرت

سیرت کے سلسلہ سے الگ تاریخی تصنیفات ہیں، ان میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں، یعنی جن میں روایتیں بہ سند مذکور ہیں ان میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے، وہ بھی دراصل سیرت نبویؐ ہے، ان میں سب سے مقدم اور قابل استناد امام بخاری کی دونوں تاریخیں ہیں، لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں، تاریخ صغیر چھپ گئی ہے، اس میں سیرت نبویؐ کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں، یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں، اور ان میں بھی کوئی ترتیب نہیں کبیر البتہ بڑی ہے میں نے اس کا نسخہ جامع ایا صوفیہ میں دیکھا تھا، لیکن سوانح نبوی اس میں بہت کم ہیں، اور جستہ جستہ واقعات بلا ترتیب مذکور ہیں۔

امام طبری اور سیرت

تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے، طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین ان کے فضل و کمال، وثوق اور وسعت علم کے معترف ہیں، ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے، محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ دنیا میں، میں کسی کو ان سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا، سنہ ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے:۔

ھذا رجم بالظن الکاذب بل ابن جریر من کبار ائمۃ الاسلام المعتمدین	یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں۔

علامہ ذہبی نے اسی موقع پر لکھا ہے کہ "ان میں فی الجملہ تشیع تھا، لیکن مضر نہیں" تمام مستند اور مفصل تاریخیں، مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابو الفدا وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں، یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی

فہرست متقدمین علمائے سیرت

جو لوگ خاص فن سیرت کے ارکان اور معتمد ہیں، ان کا اور ان کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں (۱)۔

(۱) حاشیہ کے لیے ص ۱۸ دیکھیے۔

حالات	سنہ وفات	نام مصنف
حضرت زبیرؓ کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے، حضرت عائشہؓ کے آغوش تربیت میں پلے تھے، سیرت ومغازی میں کثرت سے ان کی روایتیں ہیں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے متعلق لکھا ہے، کان عالما بالسیرۃ. صاحب کشف الظنون نے مغازی کے بیان میں لکھا ہے کہ بعضوں کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی۔	سنہ ۹۴ھ	عروہ بن زبیر
مشہور محدث ہیں، اکثر فنون میں کمال رکھتے تھے، خلافت دمشق کی طرف سے سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے، فن مغازی وسیر میں ان کو اس درجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ "گو میں ان غزوات میں بذات خود شریک تھا، مگر یہ مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہیں"۔	سنہ ۱۰۹ھ	شعبی
یمن کے عجمی خاندان سے تھے، حضرت ابوہریرہؓ سے کچھ حدیثیں سنی تھیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کتب عہد قدیم کی بشارت اور پیشین گوئیاں کثرت سے انہی سے مروی ہیں۔	سنہ ۱۱۴ھ	وہب بن منبہ
مشہور تابعی ہیں، حضرت انسؓ اور اپنے باپ اور اپنی دادی رمیثہ سے روایت کرتے ہیں، مغازی اور سیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے، خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے مسجد دمشق میں بیٹھ کر اس فن کی تعلیم دیتے تھے۔	سنہ ۱۲۱ھ	عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری
ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔	سنہ ۱۲۴ھ	محمد بن مسلم بن شہاب زہری
نہایت ثقہ تھے، عمال اور گورنر انتظام ملکی میں ان سے مدد لیتے تھے، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا، سیرت نبویؐ کے عالم تھے، ان کا دادا اخنس بن شریق وہی شخص ہے جو رسول اللہ	سنہ ۱۲۸ھ	یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس بن شریق الثقفی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷) ان مصنفین کی تصنیفات اکثر ناپید ہیں (یہ فہرست تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے) ان کے نام لکھنے سے یہ غرض ہے کہ آج جو تصنیفیں ملتی ہیں ان میں اکثر ان کے حوالے آئے ہیں اس لئے ناظرین کو ان حوالوں کی صحت وعدم صحت یا قوت وضعف کے فیصلہ کرنے کا کچھ موقع حاصل ہوگا۔

		صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔
موسیٰ بن عقبۃ الاسدی	سنہ ۱۴۱ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔
ہشام بن عروہ ابن زبیر	سنہ ۱۴۶ھ	زیادہ تر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، زہری کے بھی شاگرد ہیں، علمائے مدینہ میں ان کا شمار ہے، بغداد میں جو روایتیں انہوں نے لیں، محدثین کا بیان ہے، کہ ان میں تساہل سے کام لیا ہے، سیرت کے ذخیرۂ روایات میں ان کا بہت بڑا حصہ شامل ہے، جن کو وہ اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں، فن سیرت میں ان کے متعدد نامور تلامذہ ہیں۔
محمد بن اسحاق بن یسار المطلبی	سنہ ۱۵۱ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔
عمر بن راشد الازدی	سنہ ۱۵۲ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے، اساطینِ علمِ حدیث میں تھے، مغازی میں ایک کتاب ان کی تصنیف ہے جس کا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہے۔
عبدالرحمن بن عبدالعزیز الاوسی	سنہ ۱۶۲ھ	زہری کے شاگرد تھے، مسلم نے ان سے ایک روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں، فن سیرت کے عالم تھے، ابن سعد نے ان کے متعلق لکھا ہے، کان عالما بالسیرۃ
محمد بن صالح بن دینار التمار	سنہ ۱۶۸ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاذ ہیں، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابوالزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو۔
ابومعشر نجیح المدنی	سنہ ۱۷۰ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے، ثوری اور واقدی نے ان سے روایت کی ہے، گو محدثین نے روایت حدیث میں تضعیف کی ہے، لیکن سیرت و مغازی میں ان کی جلالت شان کا اعتراف کیا ہے، امام ابن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فنّ میں صاحب نظر ہیں، ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے، کتبِ سیرت میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے۔

عبداللہ بن جعفر ابن عبدالرحمٰن المخزومی	سنہ ۱۷۰ھ	مشہور صحابی مسور بن مخرمہ کے پڑپوتے تھے۔ فن حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے۔ سیرت نبویؐ کے اکابر علماء میں تھے۔ ابن سعد نے ان کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں "من رجال اهل المدينة عالما بالمغازی"۔
عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن عمر بن حزم الانصاری	سنہ ۱۷۶ھ	فن حدیث وسیر میں ان کا خاندان ہمیشہ نامور رہا، ان کے دادا وہ شخص ہیں، جنہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؓ کے حکم سے سب سے پہلے فن حدیث کی تدوین کی، ان کے رشتہ کی دادی عمرةؓ حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ تھیں، یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے، اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی، خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو قاضی مقرر کیا تھا، لوگ ان سے مغازی سیکھتے تھے، اس فن میں ان کی ایک تصنیف کتاب المغازی بھی ہے۔
علی بن مجاہد الرازی الکندی	بعد سنہ ۱۸۰ھ	ابو معشر نجیح کے تلامذہ میں تھے، امام ابن حنبل نے ان سے روایت کی ہے، مغازی کے جامع اور مصنف ہیں، لیکن ارباب نقد کے نزدیک ان کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں۔
زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی	سنہ ۱۸۳ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ہشام کے استاد تھے، ان دونوں بزرگواروں کے واسطۃ العقد یہی ہیں، سیرت کے عشق میں گھر بار بیچ کر استاد کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے، اور مدت تک سفر و حضر میں ان کے شریک رہے، محدثین کی بارگاہ میں گو ان کا اعزاز کم ہے لیکن کتاب السیرۃ کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں۔
سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری	سنہ ۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ان کی سیرت کے راوی ہیں الرے کے قاضی تھے، اہل نقد کے نزدیک قابل احتجاج نہیں لیکن ابن معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں، مغازی میں ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیر تہائے نبویؐ کہتے ہیں، طبری میں انکے واسطہ سے اکثر روایتیں مروی ہیں۔

ابو محمد یحییٰ بن سعید ابن ابان الاموی	سنہ ۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا، ابن سعد نے لکھا ہے کہ گو قلیل الروایت ہیں، لیکن ثقہ ہیں، صاحب کشف الظنون نے مصنفینِ مغازی میں ان کا نام بھی لیا ہے۔
ولید بن مسلم القرشی	سنہ ۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے، شام میں ان کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا، تاریخ و مغازی میں وکیع سے ان کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا، ان کی تصنیفات کی تعداد ستر، ہے، جن میں ایک کتاب المغازی ہے، کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے۔
یونس بن بکیر	سنہ ۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابن اسحاق کے شاگرد ہیں، فن روایت وحدیث میں ان کا متوسط درجہ ہے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، علامہ ذہبی نے تذکرہ میں ان کا نام بہ لقب صاحب المغازی لیا ہے انہوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے (زرقانی مواہب جلد ۳ ص ۱۰)۔
محمد بن عمر الواقدی الاسلمی	سنہ ۲۰۷ھ	سیرت نبویؐ کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں، کتاب السیرۃ، اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں، کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے، کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ ان ہی کی تصانیف ہیں، ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے، کہ "اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے، تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں"۔
یعقوب بن ابراہیم الزہری	سنہ ۲۰۸ھ	حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی اولاد میں تھے، زہری اور ان کے تلامذہ کے شاگرد ہیں، مغازی میں ان کا یہ رتبہ تھا، کہ ابن معین جیسا ناقدِ رجال ان سے اس فن کی تحصیل کرتا تھا۔
عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری	سنہ ۲۱۱ھ	ثقات محدثین میں ان کا شمار ہے، مزاج میں کسی قدر تشیع تھا، ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائیں، تب بھی ہم ان سے روایت حدیث ترک نہیں کر سکتے، آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی، اس

2616

		لئے اس زمانہ کی حدیثیں ناقابلِ سند ہیں، فن مغازی میں ان کی ایک تالیف ہے۔
عبدالملک بن ہشام الحمیری	سنہ ۲۱۳ یا ۲۱۸ھ	ان کا ذکر گذر چکا ہے۔
علی بن محمد المداینی	سنہ ۲۲۵ھ	ابو معشر نجیح اور سلمۃ بن الفضل وغیرہ کے شاگرد تھے، تاریخ وانساب عرب میں نہایت وسیع المعلومات تھے، محدثین میں ان کا شمار نہیں، لیکن مورخین کے امام ہیں اغانی کے دفتر بے پایاں کا مخزن یہی ہیں، تاریخ و انساب میں ان کی کثرت سے تصنیفات ہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں ان کی کتاب نہایت مبسوط ہے، اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد اور متنوع عنوان قائم کئے ہیں۔
عمر بن شبۃ البصری	سنہ ۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری اور نحو کے امام ہیں، مکہ مبارکہ، مدینہ طیبہ، اور بصرہ کی تاریخیں لکھی ہیں، علم سیر میں نہایت بلند پایہ تھے، حدیث میں ابن ماجہ اور تاریخ میں بلاذری، اور ابو نعیم ان کے شاگرد تھے۔
محمد بن عیسیٰ ترمذی	سنہ ۲۷۹ھ	مشہور محدث ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے، سیرت نبوی میں ان کا خاص رسالہ ہے جس کا موضوع گذشتہ تصانیف سے الگ ہے، اس رسالہ کا نام کتاب الشمائل ہے، جس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذاتی حالات وعادات و اخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے، کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہوں، اس رسالہ پر متعدد علماء نے شروح و حواشی لکھے۔
ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	سنہ ۲۸۵ھ	محدثین کبار میں شمار ہے، مسند صحابہؓ ان کی تالیف ہے جس کے آخر میں کتاب المغازی شامل ہے
ابو بکر احمد بن ابی خیثمۃ البغدادی	سنہ ۲۹۹ھ	حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد اور تاریخ وسیر کے جلیل القدر عالم تھے، تاریخ کبیر ان کی تصنیف ہے، جس میں سیرت نبوی کا حصہ بھی شامل ہے،

محمد بن عائذ دمشقی	ان کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے، حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر اس کے حوالے دیتے ہیں۔
فہرست متاخرین علمائے سیرت	یہ قدماء کی تصنیفات تھیں، مابعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں، یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابوں

سے ماخوذ ہیں، اس نقشہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے، جو قدماء کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہ مستقل تصنیفات ہیں، اور ان میں جس قدر ذخیرۂ معلومات ہے خود اصل کتابوں میں نہیں۔

روض الانف: سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے، مصنف کا نام عبدالرحمن سہیلی ہے جنہوں نے سنہ ۵۸۱ھ میں وفات پائی، یہ اکابر محدثین میں سے ہیں، اور تمام مصنفین مابعد سیرتِ نبویؐ کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق اُن کے خوشہ چین ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ میں نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابوں کی مدد سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ ہمارے استعمال میں ہے۔

سیرت دمیاطی: حافظ عبدالمومن دمیاطی المتوفی سنہ ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں، اس کتاب کا نام المختصر فی سیرۃ سیّد البشر، ہے قریباً سو ۱۰۰ صفحوں میں ہے، پٹنہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

سیرتِ خلاطی:۔ علاء الدین علی بن محمد خلاطی حنفی کی تصنیف ہے، سنہ ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت گازرونی:۔ شیخ ظہیرالدین علی بن محمد گازرونی المتوفی سنہ ۶۹۴ھ کی تصنیف ہے (۱)۔

سیرت ابن ابی طے:۔ مصنف کا نام یحییٰ بن حمیدۃ المتوفی سنہ ۶۳۰ھ ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔

سیرت مغلطائی (۲):۔ مشہور کتاب ہے، اور مصر میں چھپ گئی ہے، علامہ عینی نے اس کے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے، جس کا نام کشف اللثام ہے۔

شرف المصطفیٰ:۔ حافظ ابو سعید عبدالملک نیشاپوری کی تصنیف ہے، آٹھ جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں، ان میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے، کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔

شرف المصطفیٰ:۔ للحافظ ابن الجوزی۔

---

[۱] بمبئی کے کتب خانہ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ [۲] ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیرت کے عنوان میں ہے۔

اکتفاء فی مغازی المصطفیٰ والخلفاء الثلاثۃ، حافظ ابوالربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی المتوفی سنہ ۶۳۴ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں۔

سیرت ابن عبدالبر، ابن عبدالبر مشہور محدث اور امام ہیں، اس کتاب کے حوالے اکثر آتے ہیں۔

عیون الاثر، ابن سید الناس کی تصنیف ہے، ابن سید الناس اندلس کے مشہور عالم ہیں، سنہ ۷۳۴ھ میں وفات پائی، یہ کتاب نہایت متین اور جامع ہے، معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے، اور جس سے جو کچھ نقل کیا ہے، سند بھی نقل کی ہے، اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے، اور ہمارے پیش نظر ہے۔

نور النبراس فی سیرۃ ابن سید الناس، عیون الاثر کی شرح ہے، مصنف کا نام ابراہیم ابن محمد ہے، یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے، اور بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور ندوہ کے کتب خانہ میں اس کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے۔

سیرت منظوم، حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، نظم میں لکھی ہے، لیکن دیباچہ میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب ویابس سب کچھ ہے۔

مواہب لدنیہ: مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے، اس کے مصنف قسطلانی ہیں، جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم رتبہ تھے، یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے، لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔

زرقانی علی المواہب، یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی، آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے، اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

سیرت حلبی: مشہور اور متداول ہے۔

صحت ماخذ سیرت نبویؐ کے واقعات جو قلمبند کئے گئے، وہ تقریباً نبوت کے ۱۰۰ سو برس کے بعد قلمبند ہوئے، اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے، یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں، تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کرلی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کرلئے جاتے ہیں، جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

اسلامی فن تاریخ کا پہلا اصول فن روایت لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا، کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس

شخص کی زبان سے بیان کیا جائے، جو خود شریک واقعہ تھا، اور اگر خود نہ تھا، تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے، ؟ کیسے تھے، ؟ کیا مشاغل تھے، ؟ چال چلن کیسا تھا، ؟ حافظہ کیسا تھا، ؟ سمجھ کیسی تھی، ؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ ؟ سطحی الذہن تھے، یا دقیقہ بیں ؟ عالم تھے یا جاہل ؟ ان جزئی جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے، ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے۔

اسماء الرجال کی تدوین

ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں، اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر (۱) کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ پہنچ جاتی ہے۔

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی، بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں، اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔

اس سلسلہ میں سیکڑوں تصنیفات تیار ہوئیں، جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح و تعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی، وہ اس رتبہ کے شخص تھے، کہ امام احمد بن حنبل نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا"۔ ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا، اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

نام مصنف	کیفیت
رجال عقیلی	خاص ضعیف الروایہ لوگوں کے حال میں ہے۔
رجال احمد بن عبد العجلی المتوفی سنہ ۲۶۱ھ	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے
رجال امام عبدالرحمن بن حاتم الرازی المتوفی سنہ ۳۲۷ھ	بہت ضخیم کتاب ہے۔

(۱) ڈاکٹر اسپرنگر جرمن کے مشہور عربی داں فاضل ہیں، مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کام کیا، اصابہ کا نسخہ ان ہی کی تصحیح سے کلکتہ میں چھپا، اسی کتاب کے دیباچہ میں صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ "کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"۔

کیفیت	نام مصنف
مشہور محدث ہیں، یہ کتاب خاص ضعیف الروایۃ اشخاص کے حال میں ہے۔	رجال امام دار قطنی
اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے، اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔	کامل ابنِ عدی

یہ کتابیں قریباً آج ناپید ہیں، لیکن بعد کی تصنیفات جو انہی سے ماخوذ ہیں، آج بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب تہذیب الکمال ہے، جو علامہ مزی (یوسف بن الزکی) کی تصنیف ہے، جنہوں نے سنہ ۷۴۲ھ میں وفات پائی، علاء الدین مغلطائی المتوفی سنہ ۷۶۲ھ نے تیرہ جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا۔

علامہ ذہبی المتوفی سنہ ۷۴۸ھ نے اس کا اختصار کیا، اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے، اور بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب تہذیب التہذیب لکھی، جو بارہ جلدوں میں ہے، اور آج کل حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے، مصنف نے کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے، کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوئے ہیں، اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب میزان الاعتدال ہے، جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا، جس کا نام لسان المیزان ہے۔

اسماء الرجال کی پیش نظر کتابیں

اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبہ النسبۃ ذہبی، انساب سمعانی، تہذیب الاسماء، ہماری نظر سے گذری ہیں۔

تحقیق روایت کا اصول قرآن وحدیث میں

اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کردی تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (حجرات - ۴۹: ۶)

مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے، تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو۔

حدیث ذیل بھی اسی کی موید ہے۔

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔

آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کردے۔

دوسرا اصول

درایت

تحقیق واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟

درایت کی ابتداء

یہ اصول بھی در حقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کر دیا تھا، حضرت عائشہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہؓ تک مغالطہ میں آگئے، چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے، کہ حضرت حسانؓ بھی قاذفین میں شریک تھے، اور اسی بنا پر حد قذف جاری کی گئی، قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْکِ عُصْبَۃٌ مِّنْکُمْ۔ (نور۔ ۲۴:۱۱)	جن لوگوں نے تہمت لگائی، وہ تمہارے گروہ میں سے ہیں۔

تفسیر جلالین میں مِنْکُمْ کی تفسیر حسب ذیل کی ہے۔

جماعۃ من المومنین	یعنی یہ تہمت لگانے والے، مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہؓ کی براءت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ قُلْتُمْ مَّا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَکَلَّمَ بِھٰذَا سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ۔ (نور۔ ۲۴:۱۶)	اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا مناسب نہیں، سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کئے جاتے، پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایہ ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی شہادت لی جاتی، لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلاف قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے قطعاً سمجھ لینا چاہئیے کہ غلط ہے۔

اس طرز تحقیق یعنی درایت کی ابتداء، خود صحابہؓ کے عہد میں ہو چکی تھی۔

فقہا میں بعض اس بات کے قائل ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف منسوب کیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ اگر یہ صحیح ہو تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو (۱)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابو ہریرہؓ کو ضعیف الروایہ نہیں سمجھتے تھے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی، اس لئے انھوں نے تسلیم نہیں کی، اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہوگی۔

(۱) صحیح ترمذی باب الوضو۔

محدثین کے اصولِ درایت

جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

قال(۱) ابن الجوزی و کل حدیث رأیته یخالف العقول اویناقض الاصول فاعلم انه موضوع فلا یتکلف اعتباره ای لاتعتبر رواته ولا تنظر فی جرحهم اویکون ممایدفعه الحس والمشاهدة اومباینا لنص الکتاب والسنة المتواترة او الاجماع القطعی حیث لایقبل شئی من ذلک التاویل او یتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر او بالوعدالعظیم علی الفعل الیسیر وهذاالاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والصوفیة ومن رکة المعنی لاتاکلوا القرعة حتی تذبحوها ولذاجعل بعضهم ذلک دلیلا علی کذب راویه وکل هذا من القرائن فی المروی وقد تکون فی الراوی کقصة غیاث مع المهدی .... او انفراده بشیء مع کونه مما

ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے۔ اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر۔ اسی طرح سے وہ حدیث قابل اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ یا کتاب وسنت متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو، یا معمولی کام پر بہت بڑا ثواب کا وعدہ ہو (اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کے ہاں پائی جاتی ہیں) یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے، مثلاً یہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ، اس لئے بعض محدثین نے لغویت کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے، یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں، اور کبھی یہ قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں، مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ ...... یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے نہ بیان کی ہو، اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے، اس سے ملاقات نہ ہو، یا وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے حالانکہ بات ایسی ہے، کہ اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب بغدادی

(۱) فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۳۔ افسوس یہ ہے کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہے، اس لئے بعض عبارتیں ہم نے اسی نسخہ کے موافق غلط نقل کی ہیں، یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں ہیں، بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے۔ ۱۲

يلزم المكلفين علمه وقطع العذر فيه كما قرره الخطيب فی اول الكفاية او بامر جسيم يتوفر الدواعی علی نقله كحصر العدو للحاج عن البيت ۔

نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے۔ یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہے، کہ اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے، مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے حاجیوں کو کعبہ کے حج سے روک دیا۔

روایت کے اصول

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی، اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

۱۔ جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

۲۔ جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

۳۔ محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

۴۔ قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو، اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

۵۔ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

۶۔ معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

۷۔ وہ روایت رکیک المعنی ہو، مثلاً کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ۔

۸۔ جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے، کہ کسی اور نے نہیں کی، اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

۹۔ جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو بایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

۱۰۔ جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا، تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے، باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

موضوع حدیثوں کی شناخت کے اصول

ملا علی قاری نے موضوعات (۱) کے خاتمہ میں حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں، اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں، ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

۱۔ جس حدیث میں فضول باتیں ہوں، جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے نہیں نکل سکتیں، مثلاً یہ کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے

(۱) نسخہ مطبوعہ مجتبائی دہلی، صفحہ ۹۲ تا خاتمہ کتاب۔

جس کے ستر، زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر، ہزار لغت ہوتے ہیں" الخ۔

۲۔ وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "بیگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔"

۳۔ وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

۴۔ جو حدیث واقع کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ وہ حدیث جو انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا"۔

۶۔ وہ حدیثیں جن میں آیندہ واقعات کی پیشین گوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ "فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا"۔

۷۔ وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں، مثلاً یہ کہ "ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے" یا یہ کہ "مسلمان شیریں ہوتا ہے، اور شیرینی پسند کرتا ہے"۔

۸۔ وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہیں، مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ۳ ہزار گز کا تھا۔

۹۔ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو، مثلاً دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے، کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہر شخص بتادے گا، کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دیر ہے، حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

۱۰۔ وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

۱۱۔ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

۱۲۔ وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں، حالانکہ یہ حدیثیں تفسیر بیضاوی اور کشاف وغیرہ میں منقول ہیں۔

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا، اور ان کی بنا پر بہت سی روایتیں رد کر دیں، مثلاً ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا، اور معافی کی دستاویز لکھوادی تھی" ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں، کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

۱۔ اس معاہدہ پر سعد بن معاذؓ کی گواہی بیان کی جاتی ہے، حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پا چکے تھے۔

۲۔ دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے۔

۳۔ اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

۴۔ دستاویز میں تحریر ہے کہ "یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی" حالانکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

۵۔ خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، ان سے جزیہ کیوں معاف کیا جاتا۔

۶۔ عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا، حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی، تو خیبر والے کیونکر معاف ہو سکتے تھے۔

۷۔ اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی، کہ وہ اسلام کے ہوا خواہ اور دوست اور واجب الرعایۃ ہیں، حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دئے گئے۔

تبصرہ
(فن سیرت پر)

سیرت کی یہ ایک اجمالی اور سادہ تاریخ تھی، اب ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں

امہات کتب سیرت

۱۔ سیرت پر اگرچہ آج بھی سیکڑوں تصنیفیں موجود ہیں، لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین ۳ چار ۴ کتابوں پر منتہی ہوتا ہے۔ سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، طبری، ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں، وہ ان سے متاخر ہیں، اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں، زیادہ تر ان ہی کتابوں سے لئے گئے ہیں، (کتب حدیث کا جو ٹکڑا ہے، اس سے اس مقام پر بحث نہیں) اس بنا پر ہم کو مذکورہ بالا کتابوں پر زیادہ تفصیل اور تدقیق سے نظر ڈالنی چاہیے۔

ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے، محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں، کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑا سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلمبند نہیں کر سکتا۔

واقدی کے سوا باقی اور تینوں مصنفین، اعتبار کے قابل ہیں، ابن اسحاق کی نسبت اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے جرح کی ہے، تاہم ان کا یہ رتبہ ہے، کہ امام بخاری اپنے رسالہ "جزء القراۃ" میں ان کی سند سے روایتیں نقل کرتے ہیں، اور ان کو صحیح سمجھتے ہیں، ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور اور راویوں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں، اس کے علاوہ ابن اسحاق کی اصلی کتاب (ہندوستان میں) موجود نہیں، ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا، وہی آج موجود ہے۔ لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ

کے شخص ہیں، تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں، ابن مدینی (امام بخاری کے استاد) کہتے ہیں کہ "وہ ضعیف ہے، اور میں نے اس کو ترک کر دیا"، ابو حاتم کہتے ہیں وہ استناد کے قابل نہیں، نسائی کہتے ہیں، "وہ ضعیف ہے"۔

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے، جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے، باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔

طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمۃ ابرش، ابن سلمۃ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں۔

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ، کتب حدیث کا ہم پلہ نہیں، البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے، وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

کتب حدیث و سیرۃ میں فرق مراتب

سیرت کی کتابوں کی کم پائگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی گئی، یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں، جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں، ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں ضرورت نہیں، حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرت منظوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ماصح و ماقد اُنکرا	طالب کو جاننا چاہیئے کہ سیرت میں سبھی طرح کی روایتیں ہوتی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔

فن سیرت میں محدثین کی مسامحت

یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں، شائع ہو گئیں، اور بڑے بڑے علماء نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا، علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل (۱) میں لکھتے ہیں۔

قدرواہ من صنف فی عمل یوم ولیلۃ کابن السنی و ابی نعیم وفی مثل ھذہ الکتب احادیث کثیرۃ موضوعۃ لا یجوز الا عتماد علیھا فی الشریعۃ با تفاق العلماء	اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے جنہوں نے رات دن کے اعمال میں کتابیں تصنیف کی ہیں، مثلاً ابن السنی اور ابو نعیم اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں، جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے، کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے کہا "اے خدا میں تجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے" خدا نے کہا "تم نے محمد کو کیونکر جانا" حضرت آدمؑ نے کہا "میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس سے

(۱) مطبوعہ مطبع المنار ص ۹۹۔

میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے، وہ ضرور تجھ کو محبوب ترین خلق ہو گا" خدا نے کہا" آدم! تم نے سچ کہا، اور محمدؐ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا"، حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ علامہ ابن تیمیہ حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

واما تصحيح الحاكم لمثل هذا الحديث وامثاله فهذا مما انكره عليه ائمة العلم بالحديث و قالوا ان الحاكم يصحح احاديث وهي موضوعة مكذوبة عند اهل المعرفة بالحديث...... وكذالك احاديث كثيرة في مستدركه يصححها وهي عندائمة اهل العلم بالحديث موضوعة (۱)

حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں، اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بہت سی حدیثیں ہیں، جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے، حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔

علامہ موصوف ایک اور موقع پر ابوالشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں۔ (ص ۱۰۵ و ۱۰۶)

وفيها احاديث كثيرة قوية صحيحة وحسنة واحاديث كثيرة ضعيفة موضوعة واهية وكذالك ما يرويه خيثمة بن سليمان في فضائل الصحابة وما يرويه ابو نعيم الاصبهاني في فضائل الخلفاء في كتاب مفرد وفي اول حلية الاوليا......
وما يرويه ابو بكر الخطيب و ابو الفضل بن ناصر وابو موسى المديني وابو القاسم بن عساكر

اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی ہیں صحیح ہیں اور حسن ہیں، اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خثیمہ بن سلیمان صحابہؓ کے فضائل میں روایت کرتے ہیں، اور وہ حدیثیں جو ابو نعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب میں خلفاء کے فضائل میں روایت کی ہیں اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابوالفضل اور ابو موسیٰ مدینی اور

(۱) کتاب التوسل مطبوعہ المنار ص ۱۰۱ (نیز تذکرۃ الحفاظ ذہبی ترجمہ حاکم)

و الحافظ عبدالغنی و امثالهم ممن له معرفة بالحدیث۔

ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ، روایت کرتے ہیں

غور کرو، ابو نعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا، کہ صرف حلال وحرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے، ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلہ سند نقل کر دینا کافی ہے۔ تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

موضوعات ملا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ "قیامت میں خدا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا"۔ امام ابن جریر طبری نے سنا تو بہت برہم ہوئے، اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ دیا کہ "خدا کا کوئی ہم نشیں نہیں"۔ اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے، اور امام موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں (۱)۔

اس موقع پر ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے، یہ مسلم ہے کہ حدیث و روایت میں امام بخاری اور امام مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابو نعیم، بزار طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا، بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے، مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) عالم وجود میں آئے تو ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر پڑے، آتش فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہو گیا، بیہقی، ابو نعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری اور مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی، بیہقی، ابو نعیم وغیرہ) سے ماخوذ ہیں، اس لئے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہو گئیں، اور اسی بنا پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سیر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں۔

محدثین نے جو اصول قرار دیئے تھے، سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کر دیئے، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں

(۱) موضوعات ملا علی قاری، ص ۱۳، مطبوعہ دہلی۔

مذکور ہیں، اکثر منقطع ہیں، صحابہ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں، جس کی عمر آنحضرتؐ کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابو بکرؓ ہیں، وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، ان میں سے اکثر متصل نہیں اور اسی بنا پر بہت دور ازکار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابو نعیم نے آنحضرتؐ کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے، کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے تو بہت سے پرند آکر مکان میں بھر گئے، جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے، پھر ایک سفید بادل آیا، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اٹھالے گیا، اور ندا آئی کہ اس بچہ کو مشرق و مغرب اور تمام دریاؤں کی سیر کراؤ کہ سب لوگ پہچان لیں (۱)۔

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے لیکن ان کی اکثر روایتیں، جو سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں، منقطع ہیں۔

تصانیف سیرت میں کتب احادیث کیطرف سے بے اعتنائی

۲۔ نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے، کہ جن بڑے بڑے نامور مصنفین مثلاً امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا، اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا۔

بعض واقعات نہایت اہم ہیں، ان کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسے مفید معلومات موجود ہیں، جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے، لیکن سیرت اور تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں مثلاً یہ امر کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس کی طرف سے شروع ہوئی؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے، تمام ارباب سیر اور مورخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے، کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابتدا کی، لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث موجود ہے، کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن اُبی کو یہ خط لکھا کہ تم نے محمدؐ کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے، ان کو نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمدؐ دونوں کا استیصال کر دینگے (۲)، سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

مصنفین سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا، اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ ان کی تصنیف پھیل چکی تھی، اس لئے اس کی اصلاح نہ ہو سکی، حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

---

(۱) مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے، اس میں بے انتہا مبالغہ آمیز باتیں ہیں، میں نے معمولی ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔
(۲) غزوۂ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کے اصلی الفاظ نقل کریں گے۔

ودلّ هذا على انّه كان يعتقد الرجوع عن كثير ممّا وافق فيه اهل السير وخالف الاحاديث الصحيحة وانّ ذالک كان منه قبل تضلّعه منها ولخروج نسخ كتابه وانتشاره لم يتمكن من (۱) تغيره۔

یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی، اپنی رائے سے رجوع کیا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے پھیل گئے تھے، اس لئے اس کی اصلاح نہ کرسکے۔

مصنفین سیرت کی تدلیس

۳۔ سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں، انہی کے نام سے کیں، ان کے مستند ہونے کی بنا پر لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا، اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتی تھیں، اس لئے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے، اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہو گئیں، اس تدلیس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں، لیکن ان ہی روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں حالانکہ ابن سعد کی اصلی کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

اصول روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا

۴۔ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے، صحابہ کے متعلق ان سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا، مثلاً اصول روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی راوی نہایت ضابط، نہایت معنی فہم، نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، صحابہؓ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت پر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں، اور جن کا ذکر اوپر گذر چکا، اسی بنا پر کیں۔

روایت میں اختلاف مراتب

اختلاف مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مسائل کی بنیاد قائم ہے، مثلاً دو روایتوں میں تعارض پیش آجائے تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے، (گو دونوں راوی ثقہ ہیں) اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا۔

---

(۱) زرقانی، جلد ۳ ص ۱۱۔

تمام صحابہ کے عدول ہونے کی بحث

لیکن صحابہؓ میں آکر یہ اصول بیکار ہوجاتا ہے، فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمرؓ ہی سے مروی ہے، اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے، جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ لیا تھا، تواب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہوجاتا ہے، علامہ مازری مشہور محدث ہیں، علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں اکثر ان سے استناد کرتے ہیں، انہوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ (ص ۱۰و۱۱) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لسنا نعني بقولنا الصحابة عدول كل من رآه (صلى الله عليه وسلم) يوما ما اوزاره لماماً او اجتمع به لغرض وانصرف عن كثب وانما نعني به الذين لازموه وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذي انزل معه اولئك هم المفلحون۔

یہ مقولہ کہ صحابہ عادل ہیں، ہم اس سے ہر ایسے شخص کو مراد نہیں لیتے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتفاقاً دیکھ لیا، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی غرض کے لئے ملا، اور پھر فوراً واپس چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بالالتزام رہے اور آپ کی اعانت و مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی، علامہ مازری نے بے شبہہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربین صحابہؓ سے مخصوص کردیا، اس بناپر محدثین کی مخالفت ان سے بیجا نہیں، لیکن اس میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے، کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہوسکتیں، خصوصاً ان روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

واقعات میں سلسلۂ علت و معلول نہیں قائم کیا گیا

۵۔ ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے، اگرچہ اس میں شبہہ نہیں، کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے، یورپین مورّخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے، اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلولات پیدا کرتا ہے، اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے، وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنالیتا ہے، تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، بخلاف اس کے اسلامی مورّخ نہایت سچائی اور انصاف، اور خالص بے طرفداری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی، کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر،

اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلہ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہو گئی، اس بات سے بچنے کے لئے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا، اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے، مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں، کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں، لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے، جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے، کہ کفار پر حملہ کرنے، اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے، کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے، کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں، وہ پہلے سے آمادۂ جنگ، اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم کیا گیا

۶۔ یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے، مثلاً ایک راوی جو ثقہ ہے، ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے، جو عموماً پیش آتا ہے، اور پیش آسکتا ہے، تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائیگی، لیکن فرض کرو وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے، جو غیر معمولی ہے، تجربہ عام کے خلاف ہے، گرد و پیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاجِ ثبوت ہے، اس لئے اب راوی کا معمولی درجہ وثوق کافی نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل، زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ دان ہونا چاہیئے۔

کم سن راویوں کی روایت

مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لئے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے، کہ ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کر سکتا ہے، یا مثلاً اگر کسی صحابی نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کسی قول یا فعل کی روایت کی، تو قابل اعتبار ہوگی، محدثین کا اس پر استدلال یہ ہے، کہ محمود بن الربیعؓ ایک صحابی تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وفات فرمانے کے وقت وہ پانچ برس کے بچے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک دفعہ اظہار محبت کے طور پر ان کے منہ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا، اس واقعہ کو انہوں نے جوان ہو کر لوگوں سے بیان کیا، اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہوا، کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہو سکتی ہے (۱)۔

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے، کہ کم سن کی روایت قابل حجت نہیں، فتح المغیث میں ہے۔

---

(۱) یہ پوری بحث فتح المغیث صفحہ ۱۶۶ تا ۱۶۸ میں ہے۔

ولكن قد منع قوم القبول هنا اى في مسئلة الصبى خاصة فلم يقبلوا من تحمل قبل البلوغ لان الصبى مظنّة عدم الضبط وهو وجه للشافعية.......... وكذا كان ابن المبارک يتوقف في تحديث الصبى (کتاب مذکور ص ۱۶۴)

(لیکن ایک جماعت یہاں قبول روایت سے منع کرتی ہے، خصوصاً بچوں کی روایت کے مسئلہ میں، بلوغ سے پہلے جو روایت کسی بچہ نے سنی ہو، اس کو وہ قبول نہیں کرتی، شوافع کی یہی رائے ہے، اسی طرح عبداللہ ابن مبارک بھی بچہ کی روایت حدیث کرنے میں توقف کرتے ہیں)

لیکن اثبات ونفی، دونوں پہلو بحث طلب ہیں، بے شبہ ۵ برس کا بچہ اگر یہ واقعہ بیان کرے کہ میں نے فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے، یا وہ بوڑھا تھا، یا اس نے مجھ کو گودیوں میں کھلایا تھا، تو اس روایت میں شبہ کرنے کی وجہ نہیں، لیکن فرض کرو کہی بچہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا، تو شبہ ہوگا کہ بچہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں؟

فقہا نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے، فتح المغیث میں شرح مہذب سے نقل کیا ہے۔

قبول اخبار الصبى المميز في طريقة المشاهدة بخلاف ما طريقة النقل كا لا فتاء ورواية الاخبار ونحوه (نسخه مطبوعه لکھنو ص ۱۳۲)

باتمیز لڑکے کی روایت ان واقعات کے متعلق جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہوں، لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں، مثلاً فتویٰ یا حدیث کی روایت ان میں ان کی روایت مقبول نہیں۔

لیکن عام طور سے یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا، فتح المغیث میں ہے۔

ثم الضبط نوعان ظاهر وباطن فالظاهر ضبط معناه من حيث اللغة والباطن ضبط معناه من حيث تعلق الحكم الشرعى به وهو الفقه و مطلق الضبط الذى هو شرط فى فى الراوى هو الضبط ظاهرا عند الأكثر لانه يجوز نقل الخبر بالمعنى

پھر ضبط (۱) کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی، ظاہری کے یہ معنی ہیں کہ لفظ کے لغوی معنی کا لحاظ رکھا جائے، باطنی کے یہ معنی کہ شرعی حکم جس بنا پر متعلق ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اس کو فقہ کہتے ہیں، لیکن مطلقاً جو ضبط راوی کے لئے مشروط ہے، اکثروں کے نزدیک وہ صرف ظاہری ضبط ہے، کیونکہ ان

(۱) ضبط کا لفظ محدثین کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی کسی روایت کے الفاظ اور مطلب کو اچھی طرح سمجھنا اور ادا کرنا۔

فيلحقه تهمة تبديل المعنى بروايته قبل الحفظ او قبل العلم حين سمع ولهذا المعنى قلت الرواية عن اكثر الصحابة لتعذر هذا المعنى قال و هذا الشرط وان كان على ما بينا فان اصحاب الحديث قل ما يعتبرونه في حق الطفل دون المغفل فانه متى صح عند هم سماع الطفل او حضوره اجازوا روايته ۔ (ص ۱۲۱)

لوگوں کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے، اسی بنا پر سنتے وقت قلت حفظ، یا قلت علم کے سبب سے روایت کے ادا کرنے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہ ہو سکتا ہے، یہ وجہ ہے کہ اکثر صحابہؓ نے بہت کم حدیثیں روایت کیں، کیونکہ مفہوم کا بعینہ روایت میں قائم رکھنا مشکل ہے، لیکن محدثین بچہ کے حق میں (بے عقل کے حق میں نہیں) اس کا اعتبار نہیں کرتے، بلکہ بچہ ان کے نزدیک جب سننے اور مجلس میں شریک ہونے کے قابل ہو گیا، تو اس کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔

راویوں میں فقاہت کی شرط

ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہؓ فقیہ نہ تھے، ان کی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو، تو واجب العمل ہو گی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحر العلوم، امام فخر الاسلام کا مذہب نقل کر کے لکھتے ہیں:۔

ووجه قول الا مام فخر الاسلام ان النقل بالمعنى شائع و قلما يوجد النقل باللفظ فان حادثة واحدة قد رويت بعبارات مختلفة ثم ان تلک العبارات ليست مترادفة بل قدروى ذلک المعنى بعبارات مجازية فاذا كان الراوى غير فقيه احتمل الخطاء فى فهم المعنى المرادى الشرعى **** ولا يلزم منه نسبة الكذب متعمدا الى الصحابى معاذالله عن ذالک
(شرح مسلم مطبوعہ لکھنو ص ۴۳۲)

امام فخر الاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی عام طور پر شائع ہے، اور ایسا بہت کم ہوتا ہے، کہ روایت باللفظ کی جائے کیونکہ ایک ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور یہ الفاظ باہم مرادف بھی نہیں، بلکہ اکثر مجازی عبارتوں میں مطالب ادا کئے گئے ہیں اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہو گا، تو احتمال ہو گا، کہ اس نے مطلب مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اس سے معاذاللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔

محدثین اس اصول سے کہ واقعہ جس درجہ کا اہم ہو، شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہئیے بے خبر نہ تھے، امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں۔

اذا روينا عن النبى (صلى الله عليه وسلم)

جب ہم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)

فی الحلال و الحرام و الاحکام شددنا فی الاسانید و انتقدنا فی الرجال و اذا روینا فی الفضائل و الثواب و العقاب سهلنا فی الاسانید و تسامحنا فی الرجال (فتح المغیث ص ۱۲۰)

ہے حلال وحرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں، تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں، لیکن جب فضائل اور ثواب وعقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انکاری کرتے، اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

امام احمدؒ بن حنبل کا قول ہے۔

ابن اسحاق رجل تکتب عنه هذه الاحادیث یعنی المغازی ونحوها اذا جاء الحلال و الحرام اردنا قوما هکذا و قبض اصابع یدیه الاربع (فتح المغیث ص ۱۲۰)

ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جاسکتی ہیں، لیکن جب حلال وحرام کے مسائل آئیں تو ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں، یہ کہہ کر انھوں نے چار انگلیاں بند کر کے دبالیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیت کی بنا پر راوی کے درجہ کا لحاظ رکھتے تھے، اسی بنا پر ابن اسحاق کی نسبت امام ابن حنبل نے یہ تفریق کی کہ حلال وحرام میں ان کی شہادت معتبر نہیں، لیکن مغازی میں ان کا اعتبار ہے، یہ وہی اصول ہے، کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیئے، اور یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی اہمیت بدل جاتی ہے، لیکن واقعہ کی اہمیت احکام فقہیہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔

نوعیت واقعہ کی اہمیت کا خیال فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا، اسی بنا پر ان کا مذہب ہے، کہ جو روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہیئے کہ راوی فقیہ اور مجتہد بھی ہے یا نہیں! منار میں ہے۔

والراوی ان عرف بالفقه و التقدم فی الاجتهاد کالخلفاء الراشدین و العبادلة کان حدیثه حجة یترک به القیاس خلافا لمالک وان عرف بالعدالة و الضبط دون الفقه کانس وابی هریرة ان وافق حدیثه القیاس

راوی اگر تفقہ واجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدینؓ یا عبادلہؓ تھے، تو اس کی حدیث حجت ہوگی، اور اس کے مقابلہ میں قیاس چھوڑ دیا جائیگا، (بخلاف امام مالک کے) اور اگر راوی ثقہ اور عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے کہ حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ ہیں،

عمل به و ان خالفه لم یترک الا بالضرورة

تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا، ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے گا۔ (نور الانوار ص ۱۷۶، ۱۷۷)

حضرت ابوہریرہؓ کی مثال اگرچہ قابل بحث ہے، کیونکہ اکثر علما کے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ فقیہ اور مجتہد تھے، لیکن یہ جزوی بحث ہے، گفتگو اصل مسئلہ میں ہے۔

روایت میں قیاس کا کس قدر حصہ شامل ہے

۷۔ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل بحث بات یہ ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے، اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے، اور کس قدر راوی کا قیاس ہے، تفحص اور استقراء سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے، وہ اس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں، اس کی بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں، یہاں ہم صرف ایک دو واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب ازواج مطہراتؓ سے ناراض ہو کر تنہا نشین ہو گئے تھے، تو یہ مشہور ہوا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازواج کو طلاق دیدی، حضرت عمرؓ نے یہ خبر سنی تو مسجد نبویؐ میں آئے، یہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازواج کو طلاق دیدی، حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ نہیں میں نے طلاق نہیں دی۔

یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ بہ اختلافِ الفاظ مذکور ہے کتاب النکاح میں جو روایت ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وان الا خبار التی تشاع ولو کثر ناقلوها ان لم یکن مرجعها الی امر حسی من مشاهدة اوسماع لا تستلزم الصدق فان جزم الا نصاری فی روایته بوقوع التطلیق وکذا جزم الناس الذی رآهم عمر عندالمنبر بذالک محمول علی انه شاع بینهم ذالک من شخص بناه علی التوهم الذی توهمه من اعتزال النبی نسائه فظن لکونه لم تجر عادته

جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو ان کے راوی کثرت سے ہوں، لیکن اگر ان خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضروری نہیں چنانچہ انصاری نے اور ان صحابہ نے جن کو حضرت عمرؓ نے منبر کے پاس دیکھا تھا، طلاق کا جو یقین کر لیا وہ یوں ہوا ہو گا کہ کسی شخص نے آنحضرتؐ کو دیکھا کہ آپ نے ازواج مطہرات سے علحدگی اختیار کر لی ہے، اور چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ عادت نہ تھی، اس لئے اس نے یہ

بذالک انّه طلقهن فاشاع انّه طلقهنّ فشاع ذلک فتحدث الناس به و اخلق بهذا الذی ابتداء باشاعة ذالک ان یکون من المنا فقین کما تقدّم (فتح الباری شرح بخاری طبع اول مصر جلد ۹ ص ۲۵۷)

قیاس کیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے طلاق دیدی۔ اس نے یہ خبر پھیلا دی اور ایک دوسرے سے اس کو بیان کرنے لگے۔ اور قیاس یہ ہے کہ اوّل جس شخص نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہوگا۔

غور کرو، مسجد نبویؐ میں تمام صحابہؓ جمع ہیں، اور سب بیان کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی، صحابہؓ عموماً ثقہ اور عادل ہیں، اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے، باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے، کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا، حافظ ابن حجر نے بڑی جرات کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ راوی اوّل منافقین میں سے ہوگا، حضرت عائشہؓ صدیقہ کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں، جن میں سے ایک واقعہ افک ہے، ان کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہئیے جو حافظ ابن حجر نے یہاں ظاہر کیا، یعنی یہ کہ منافقین نے ان کی طرف منسوب کر دیئے ہوں گے، پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

فن تاریخ و روایت پر خارجی اسباب کا اثر

۸۔ فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا، حدیثوں کی تدوین بنوامیہ کے زمانہ میں ہوئی، جنھوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہ کی توہین کی، اور جمعہ میں سر منبر حضرت علیؓ پر لعن کھلوایا سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہؓ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں، عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں، لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کردی، کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں، آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے، اور بنو امیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے، اسی مقام پر نظر آتے ہیں، جہاں ان کو ہونا چاہئیے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المومنین! اگر تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتقال کے وقت موجود ہوتا، تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے"۔ وہیں سرِ دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا تو جھوٹ کہتا ہے، امیر المومنین کا باپ (حضرت عباسؓ جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا، اس کو کس نے پوچھا،؟ مامون الرشید کو بھی

اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔

تاہم یہ عالمگیر موثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے مغازی میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم و نسق اور تمدن و معاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے، یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں پڑتی تھی، اسلام میں جب تالیف و تصنیف کی ابتداء ہوئی تو یہی نمونے پیش نظر تھے، اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھا گیا، جس طرح سلاطین کی تاریخیں جنگ نامہ و شاہنامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں، چنانچہ سیرت کی ابتدائی تصنیف مثلاً سیرت موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح سنین کو عنوان بناتے ہیں، اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں، یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں، اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت و حکومت کی تاریخ کے لئے بھی صحیح نہیں تھا، لیکن نبوّت کی سوانح نگاری کے لئے تو ناموزوں ہے، پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے، پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط و خال، تقدس، نزاہت، حلم و کرم، ہمدردی عام اور ایثار ہوتا ہے، بلکہ عین اس وقت جب کہ اس پر سکندر اعظم کا دھوکا ہوتا ہے، ژرف بیں نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتۂ یزدانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے۔

تمام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب بنو نضیر کا محاصرہ کیا تو حکم دیا کہ ان کے نخلستان کاٹ ڈالے جائیں (قرآن مجید میں بھی اس کا اجمالی ذکر ہے) ارباب سیر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے اس حکم کی نسبت یہ اعتراض کیا کہ "یہ انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے"۔ لیکن مورخین یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب نہیں دیتے، اور یونہی گذر جاتے ہیں۔

قیاس و درایت

۹۔ نہایت مہتم بالشان بحث یہ ہے کہ کوئی روایت اگر عقل، یا مسلمات، یا دیگر قرائن صحیحہ کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہوگی یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں اور سلسلۂ سند متصل ہے؟ علامہ ابن جوزی نے اگرچہ لکھا ہے (جیسا کہ اوپر گذر چکا) کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو، اس کے رواۃ کی جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا، عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے حامیانِ روایت لکھتے

ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا، انکار کر دے گا کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور سلسلہ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو، وہ باوجود خلافِ عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں، ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

(۱) تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى ، کی حدیث کو جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دیئے جن میں بتوں کی تعریف ہے، بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار کہا تھا، اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ بیان کی تھی۔

لو وقع لارتد کثیر ممّن اسلم ولم ینقل ذالک ،

اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام سے پھر جاتے حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں

حافظ ابن حجر، فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

وجمیع ذالک لا یتمشّی علی القواعد فان الطرق اذا کثرت وتباینت مخارجها دلّ ذلک علی انّ لها اصلا (۱)

یہ تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں سکتے، اس لئے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے ہیں اور ان کے مآخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے۔

(۲) صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین ۳ دفعہ جھوٹ بولے تھے، امام رازی نے اس حدیث سے اس بنا پر انکار کیا کہ "اس سے حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، اس لئے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں، علامہ قسطلانی امام رازی کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

فلیس بشیء اذا الحدیث صحیح ثابت ولیس فیه نسبة محض الکذب الی الخلیل وکیف السبیل الی تخطیة الرّاوی مع قوله اِنی سقیم و بل فعله کبیرهم هذا وعن سارة اختی اذظاهر هذه الثلاثة بلا ریب غیر مراد (۲)

امام رازی کا قول بالکل ہیچ ہے اس لئے کہ حدیث ثابت ہے، اور اس میں محض کذب کی نسبت حضرت خلیلؑ کی طرف نہیں ہے، اور راوی کا، تخطیہ کیونکر ہوسکتا ہے جب کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول موجود ہے اِنِّیْ سَقِیْمٌ اور بَلْ فَعَلَهٗ کَبِیْرُهُمْ هٰذَا اور سارة اختی کیونکہ ان تینوں جملوں میں ظاہر لفظ قطعاً مراد نہیں۔

(۱) فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۳۳۳ مطبوعہ مصر (۲) قسطلانی جلد ۵ ص ۳۸۹

اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں ہم نے اختصار کے لحاظ سے صرف دو مثالیں نقل کیں۔

صحابہ میں دو گروہ

ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے۔ جو دلائل عقلی اور قرائن حالی کی بنا پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے۔ اور یہ طریقہ خود صحابہؓ کرامؓ کے عہد میں شروع ہو گیا تھا۔ اور محدثین کے اخیر دور تک قائم رہا، چونکہ یہ رائے عام خیال کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اس کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے"۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا "اس کی بنا پر تو لازم آتا ہے کہ ہم گرم پانی سے بھی وضو نہ کریں"، حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا "بھتیجے جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو" (۱)۔

(۲) صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حضرت علیؓ کے قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے) پیش کئے گئے، حضرت ابن عباسؓ اس کی نقل لیتے جاتے تھے، اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ

واللہ	ما	قضی بھذا	خدا کی قسم علی نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گمراہ ہو کر کیا
علیٌ	الاّ	ان	ہے (لیکن چونکہ وہ گمراہ نہ تھے اس لئے یہ فیصلہ بھی
یکون	ضلّ		نہ کیا ہو گا)۔

اسی روایت کے بعد صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس لوگ ایک کتاب لائے، جس میں حضرت علیؓ کے فیصلے قلمبند تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب مٹادی (۲)۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کر لیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے، اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔

(۳) صحیح بخاری (باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ) میں ہے کہ محمود بن ربیع نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ "جو شخص خالصاً خدا کے لئے لا الہ الاّ اللہ کہے گا۔ خدا اس پر آگ حرام کر دے گا"۔ اس جلسہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی موجود تھے، جن کے مکان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ، مہینہ تک قیام فرمایا تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے یہ حدیث سن کر کہا۔

---

(۱) ابن ماجہ و ترمذی حدیث الوضوء مما مست النار (۲) نووی شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب ملاطفہ کی شکل میں لکھی تھی (جس طرح اگلے زمانہ میں خطوط کو لمبان میں جوڑ کر جمع کرتے تھے، اور لپیٹ کر رکھتے تھے۔)

اذا انسدّت طرق تاویلها نسبنا الکذب الی رواتها [۱]	جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائینگے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔

(۳) بخاری میں روایت ہے کہ خدا نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا حافظ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

ویشکل علی هذا مایوجد الآن من آثار الامم السالفة کدیار ثمود، فانّ مساکنهم تدلّ علی ان قاماتهم لم تکن مفرطة الطول علی حسبما یقتضیه الترتیب السابق...... ولم یظهر الآن مایزیل هذا الاشکال [۲]	اور اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں مثلاً قوم ثمود کے مکانات، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے جیسا کہ ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے۔ ......اور اس وقت تک مجھ کو اس اشکال کا جواب نہیں معلوم ہوا۔

(۴) صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ اے خدا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رسوا نہ کرے گا، اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

وقد استشکل الاسماعیلی هذا الحدیث من اصله وطعن فی صحته [۳]	اور اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے، اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے

اسماعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر نے جواب دیا ہے، لیکن اسماعیلی کا درجہ فن حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے اس لئے گو اسماعیلی کا اعتراض غلط ہو، لیکن قابل لحاظ ہو سکتا ہے، کہ ان کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے۔

(۵) عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا، جس نے زنا کیا تھا، اس پر بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا، حافظ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں اس بنا پر اس حدیث کی صحت میں تامل کیا کہ جانور مکلف نہیں، اس لئے ان کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ اس بنا پر ان کو سزا دی جا سکتی، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

وقد استنکر ابن عبدالبر قصة عمرو ابن میمون هذه وقال فیها اضافة الزنا الی غیر مکلف واقامة الحد علی البهائیم [۴]	ابن عبدالبر نے عمرو بن میمون کے اس قصہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف زنا کی نسبت ہے اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے۔

(۱) نووی شرح صحیح مسلم کتاب الجہاد باب الفیٔ (۲) فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۶ ص ۲۶۰ بدء الخلق (۳) فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۸ ص ۳۸۴ (۴) فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۷ ص ۱۲۲

حافظ ابن حجر نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے، اگر سند صحیح ہے تو غالباً یہ بندر جن رہے ہوں گے"۔

(۶) صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک (۱) دفعہ عبداللہ بن ابی کے طرفداروں اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ میں جھگڑا ہو گیا، اس پر یہ آیت اتری:۔

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (حجرات ۴۹:۹)	اگر مسلمانوں کے دو ۲ گروہ آپس میں لڑجائیں تو ان میں صلح کرادو۔

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا، اس بنا پر ابن بطال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیت قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں، اور یہاں عبداللہ بن ابی کا گروہ علانیہ کافر تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلۂ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اس کے موافق ہیں یا نہیں۔

روایت بالمعنیٰ (۱۰) ایک بڑا مرحلہ روایت بالمعنیٰ کا ہے، یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یا صحابہؓ نے جو الفاظ فرمائے تھے، بعینہٖ وہی ادا کرنے چاہئیں، یا ان کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے، محدثین اس باب میں مختلف الرائے ہیں، اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا، تو الفاظ کی پابندی ضرور نہیں، لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا، ایک اجتہادی بات ہے اسی بنا پر بعض محدثین مثلاً عبدالملک بن عمر، ابوزرعہ، سالم بن جعد، قتادہ، امام مالک، ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے (۲)، لیکن یہ ظاہر ہے کہ سیکڑوں راویوں میں صرف دو ۲ چار ۴ اشخاص ایسی پابندی کر سکتے تھے، اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا، عام حالت یہی تھی کہ راوی حدیث کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے، جامع ترمذی، کتاب العلل میں سفیان ثوری کا قول نقل ہے۔

ان قلت لكم انى احدثكم كما سمعت	اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں بعینہٖ

(۱) صحیح بخاری کتاب العلم، روایت میں جھگڑے کی تفصیل ہے، ہم نے محض خلاصہ ذکر کر دیا ہے۔ (۲) صحیح ترمذی کتاب العلل میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے۔

فلا تصدقونی، انماھو المعنی، وہی ادا کر دیتا ہوں تو تم میری بات نہ مانو میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں۔

ترمذی نے اسی مضمون کے اور اقوال واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی وغیرہ سے نقل کئے ہیں۔

جو صحابہؓ بہت محتاط تھے، حدیث کی روایت کے وقت ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔

سنن ابن ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ میں عبداللہ ابن مسعودؓ کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا تھا، میں نے کبھی ان کو یہ کہتے نہیں سنا کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرمایا"۔ ایک دن ان کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا تو دفعتہً سر جھکا لیا، پھر میری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں، قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں، گلے کی رگیں پھول گئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یوں کہا یا یوں یا اس سے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم، یا اس کے مشابہ۔

امام مالک کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے، تو خوف زدہ ہو جاتے، اور کہتے کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرمایا تھا، یا یوں فرمایا تھا" امام شعبی کہتے ہیں کہ "میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں سال بھر حاضر رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا"۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ "میں نے سعد بن مالکؓ کے ساتھ مکہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا، لیکن اس تمام راہ میں انہوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت نہیں کی" (حالانکہ وہ صحابی تھے) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنے والد سے پوچھا کہ "میں نے آپ کو اور صحابہؓ کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا" انہوں نے کہا "میں جب سے اسلام لایا ہوں نے کبھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ نہیں چھوڑا، لیکن میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو چاہیے کہ اپنا گھر آگ میں بنائے" (۱)۔

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منبر پر ارشاد فرمایا تھا:۔

ایاکم و کثرۃ الحدیث عنّی (۲) خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کرو۔

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہو سکتا، لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں

---

(۱) یہ تمام اقوال صحیح ابن ماجہ دیباچۂ کتاب میں مذکور ہیں، دیکھو ص ۴ و ۵، مطبوعہ اصح المطابع لکھنو (۲) ابن ماجہ ص ۵۔

غلطی کا ہو جانا ممکن ہے، اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر انکار کیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت بیان کی گئی،

ان المیت لیعذب ببکاء الحی — مردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطی (۱) — تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو، نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں، لیکن کان غلطی کر جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا:

اما انہ لم یکذب ولکنہ نسی او اخطاء (۲) — ہاں وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔

روایت احاد

(۱۱) ایک اور بحث روایت احاد کی ہے، روایت احاد وہ ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو، یعنی کوئی دوسرا راوی اس کا موید نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و ظنی ہونے کے متعلق اہل فن کا اختلاف ہے، معتزلہ روایات احاد کے تسلیم سے قطعاً منکر ہیں، لیکن یہ در حقیقت انکار بداہت ہے، ہم روزمرہ واقعات زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلا حجت و اصرار فوراً یقین کر لیتے ہیں، ہم سے ایک شخص آکر کہتا ہے کہ "زید تم کو بلاتا ہے" اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبر احاد ہے اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے، معتزلہ کے مقابل میں اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں، لیکن یہ در حقیقت تفریط ہے، خود صحابہؓ کا طرز عمل اس کے خلاف ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عمرؓ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلبی کی، چونکہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا، وہ واپس چلے گئے، حضرت عمرؓ نے کام سے فارغ ہو کر ان کو بلوا بھیجا، اور واپسی کا سبب پوچھا، انہوں نے کہا "میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد جواب نہ ملے تو واپس جاؤ" حضرت عمرؓ نے کہا "اس روایت پر گواہ لاؤ، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔" حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا، حضرت عمرؓ خدانخواستہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو غلط گو نہیں جانتے تھے، لیکن چونکہ حضرت عمرؓ بارگاہ نبوت میں برسوں رہے تھے، اور انہوں نے یہ حدیث آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نہیں سنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو عموماً پیش آتا ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔

حضرت ابو بکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی، میراث کا

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنائز (۲) مسلم کتاب الجنائز۔

دعویٰ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا "قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں، اور نہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے"، مغیرہ بن شعبہؓ نے شہادت دی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان کی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی، اور جب ایک اور صحابی محمد بن مسلمہؓ نے شہادت دی، تب حضرت ابو بکرؓ نے اس عورت کو میراث دلائی۔

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی، اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں ہیں۔

(اسی بنا پر روایت احاد کے متعلق فقہائے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ یہ ظنی الثبوت ہیں، ان سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے، "اصل یہ ہے کہ روایات احاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے، ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ "زید نے تم کو بلایا ہے۔" تو راوی کی ثقاہت و اعتبار کے مسلم ہونے کے بعد ہم کو کبھی اس واقعہ کی تسلیم سے انکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ "تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے۔" تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس و پیش کرتے ہیں، اور اس کے ثبوت کے لئے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی یہ بیان کرتا ہے کہ "آپؐ ایک بار سپید کرتہ پہن کر باہر تشریف لائے۔" تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں۔ لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ "ایک بار آپؐ برہنہ تن باہر نکل آئے۔" (اس قسم کی ایک روایت ہے) تو قطعاً ہم تنہا شہادت اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں سمجھیں گے۔

نتائج مباحث مذکورہ

گذشتہ صفحات میں ہم نے روایت و حدیث کے متعلق صحابۂ کبارؓ کا جو طرز عمل پیش کیا ہے اور علمائے نقد و حدیث کے جن قواعد و اصول کی تفصیل کی ہے، ذیل میں بہ ترتیب نتائج کے طور پر ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں، پھر عام احادیث میں کرنی چاہئیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

(۲) کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

(۳) سیرت کی روایتیں بہ اعتبار پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اس لئے بصورت اختلاف، احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

(۴) بصورت اختلافِ روایات احادیث، رواۃ اربابِ فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

(۵) سیرت کے واقعات میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

(۶) نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے۔

(۷) روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے و فہم کا کس قدر جزء شامل ہے۔

(۸) اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے؟

(۹) جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدہ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی۔

(۱۰) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کرلینی چاہئیے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

(۱۱) روایات احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائنِ حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیے۔

ان اصول کے تقرر و تفصیل کے بعد نظر آسکتا ہے کہ اسلامی فن روایت عقل و درایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ علمائے حدیث نے تصحیح روایت کے لئے کتنی محنت و جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی اور کتنی دقت رسی صرف کی ہے، کیا اس اہتمام و اعتنا کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ و روایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلامؐ میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لائف کے لئے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد و اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟) (۱)

---

(۱) زیادت از صفحہ ۴۳ تا ۵۵ س"

یورپین تصنیفات

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف بلدی برٹ سے لے کر جو ۱۱۲۹ء میں موجود تھا، آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ ان کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ ان کے وسائلِ معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوء ظن کا کہاں اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں، کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جابجا ان تصنیفات سے کام لینا، یا ان سے تعرض کرنا پڑا ہے۔

یورپ کی پیغمبر اسلام سے ابتدائی واقفیت

یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا، جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا۔ ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:-

"عیسائیت، اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھراتی اور حکم بجا لاتی تھی، لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل رد کیے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں منھ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے"۔ (۱)

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے، یوں بیان کرتا ہے:-

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرونِ وسطیٰ سے رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں، مسلمانوں کے مذہب

(۱) محمد اینڈ محمڈنزم از باسورتھ اسمتھ صاحب (ص ۶۳)
B. Smith ; Mohammad & Mohammadanism P63

کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوئی ہیں،
جو غلطیاں اور بد گمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، ان
کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں، ہر مسیحی شاعر، مسلمانوں کو
مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا، اور حسب ترتیب درجات
ان کے تین خدا تسلیم کئے جاتے تھے، ماہوم یا ماہون یا ما فومیڈ
(یعنی محامڈ) اور اپلین اور تیسرا ٹرگامان، ان کا خیال تھا کہ محمدؐ
نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی اور سب سے
عجیب تر یہ ہے کہ محمدؐ (وہ محمدؐ جو بت شکن اور دشمن اصنام تھا)
لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا"۔

اسپین میں جب عیسائی مسلمانوں پر غالب آئے، اور ان کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا، تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا، اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے "اپلین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا، اس پر وہ پل پڑے اور اس کو نہایت سخت سست کہا اور اس کو گالیاں دیں اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی اور اس کو پاؤں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے، اور ماہوم کو (جو ان کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڑھے میں ڈال دیا، اس کو سور اور کتوں نے نوچ ڈالا، اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی، اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی، اور از سر نو تلف شدہ بتوں کو بنایا، اسی بنا پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دے دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں، وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا۔

ایک دوسرا شاعر ریچر خدا سے دعا کرتا ہے کہ "وہ ماہوم کے بت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے" اس کے بعد وہ امرا کو جنگ صلیبی کے لئے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے۔ "اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرگامان کے بتوں کو اوندھا کر دو، اور ان کو آگ میں ڈال دو، اور ان کو اپنے خداوند کی نذر کر دو"۔ (۱)

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے۔ (کسی اور حصہ میں ہم اس کو مفصل لکھیں گے)

سترہویں اور اٹھارہویں صدی

سترہویں صدی کے سنین وسطیٰ یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، یورپ کی جد و جہد، سعی و کوشش اور

(۱) ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری بہ زبان عربی مطبوعہ مصر از ص ۸ تا ۱۰

حریت و آزادی کا دور، اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی وہ مستشرقین یورپ کا وجود ہے، جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس، علمی و سیاسی اغراض سے جا بجا ملک میں قائم ہوئے، اور اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا۔

اس دور کی خصوصیت اول یہ ہے کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بہ موقع معلومات سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ الگ ہو گئے، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو ۲ جماعتیں الگ ہو گئیں، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و غیر متعصب گروہ، اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارپی نیوس (Arp) مارگولیوس (Margoliouth) ایڈورڈ پوکاک (Pococke) اور ہاٹنجر (Hattinjer) ذکر کے قابل ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتداءً جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا، وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں، جو قرون ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے، یعنی سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی ۹۳۹ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا، اور ابن العمید المکین المتوفی ۱۲۷۳ء جو سلاطینِ مصر کا ایک درباری تھا، اور ابوالفرج ابن العبری الملطی المتوفی ۱۲۸۶ء مصنف تاریخ الدول۔

ابن العمید المکین کی تاریخ، طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، ارپی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا، لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولت اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اخیر اٹھارہویں صدی

یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہو گئی، جس نے "اوریئنٹلسٹ" کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی، جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کئے اور ینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک

سوسائٹی قائم کی۔اس کی تقلید میں انگریزوں نے بہ مقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہو گئیں۔ عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتبخانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کر کے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں، اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا، سب سے پہلے رسک (Reiske) المتوفی ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابوالفداء مع ترجمہ لاطینی و حواشی پانچ جلدوں میں شائع کیں ۱۸۰۹ء میں کیپٹن اے متھوس (A.N.Mathews) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا، ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (Kremer) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی، ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی کوٹنگن (Cottingen) سے اشاعت کی۔اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخِ معارف طبع کرائی، ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G.Weil) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا، ۱۸۷۷ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمۂ فرانسیسی پروفیسر ڈی مانیارڈ نے شائع کی، والہوسن (Wellhausen) نے ۱۸۸۲ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان "محمد بہ مدینہ" برلن سے شائع کیا، ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے ہاؤتسما (Houtasma) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو ۲ جلدوں میں چھپی، ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۲ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادرالوجود تاریخ بارتھ (J.Barth) اور نولدیکی (Noldeke) وغیرہ نے شائع کی، اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (Sachau) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادرالوجود طبقات، جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں، تقریباً ۱۹۰۰ء سے گذشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت، ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگارانِ پیغمبر عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:۔

"محمد کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے، جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے

لیکن اس میں جگہ پانا قابلِ فخر چیز ہے"۔ (۱)

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں جو بہ تخصیص آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں یا اسلام کے اصولِ عقائد پر لکھی گئیں، اور جن میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں، یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۱	ڈاکٹر جی۔ بی (؟)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وائیٹ (White) واعظ اوکسفورڈ	"	بیمفٹن سرمنز اسلام اور پیغمبر اسلام پر	اوائل ۱۸۰۰ء
۳	گارڈفری ہگنس ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (GodfreyHiggins)	"	اپالوجی	۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے اے۔ مولر (Muller)	جرمن	اسلامزم	۱۸۳۰ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی (Garcin De Tossy)	فرانس	اسلام و قرآن	از ۱۸۳۱ء تا ۱۸۷۴ء
۶	ایڈورڈ لین (Edward Lane)	انگلستان	انتخابات القرآن	۱۸۴۳ء
۷	ڈاکٹر ویل (Weil)	جرمن	ترجمہ و تحشیہ ابن ہشام و کتاب محمدؐ پیغمبرؐ	۱۸۴۵ء تا ۱۸۴۶ء
۸	کارلائل (Corlyle)	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	۱۸۴۶ء
۹	کوسن ڈی برسیوال (Caussin De Perceval)	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۴۷ء
۱۰	واشنگٹن ارونگ (W.Irving)	انگلستان	سیرت محمدؐ	۱۸۴۹ء
۱۱	ڈاکٹر اسپرنگر (Springer)	جرمن	سیرت محمدؐ	۱۸۵۱ء
۱۲	وان کریمر (VonKremer)	"	ترجمہ و تحشیۂ واقدی	۱۸۵۶ء
۱۳	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	مضمون "محمد"	۱۸۵۸ء
۱۴	ڈوزی (Dozy)	ہولینڈ	تاریخ اسلام	۱۸۶۱ء
۱۵	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	بزرگ ترین عرب	۱۸۶۱ء

(۱) مارگولیتھ، محمد، دیباچہ، صفحہ ۱۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۱۶	ڈی لین (Delane)		سیرت محمدؐ	۱۸۶۱ء
۱۷	میور (Muir)	انگلستان	سیرت محمدؐ	۱۸۶۱ء
۱۸	برتھالی سینٹ ہلیر (Hilaire)	فرانس	محمدؐ و قرآن	۱۸۶۵ء
۱۹	نولدیکی (NoldeKy)	جرمن	مضامین قرآن و اسلام	۱۸۶۹ء
۲۰	دوشیف مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	انگلستان	اسلام	۱۸۶۹ء
۲۱	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	"	محمدؐ	۱۸۷۲ء
۲۲	جولیس چارلس (JuliusCharles)	فرانس	تاریخ بانیِ اسلام	۱۸۷۴ء
۲۳	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمدؐ اور اسلام	۱۸۷۵ء
۲۴	باسورتھ سمتھ (BosworthSmith)	"	" "	"
۲۵	سیدیو (Sedillot)	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۷۷ء
۲۶	ولہوسن (Wellhousen)	جرمن	تبصرہ بر واقدی	۱۸۸۲ء
۲۷	ابل کرابل (Krehl)	جرمنی	سیرت محمدؐ	۱۸۸۴ء
۲۸	گولڈزہر (Goldziher)		مطالعۂ اسلام	۱۸۹۰ء
۲۹	رینان (Renan)	فرانس	تاریخ مذاہب	۱۸۹۲ء
۳۰	ایچ. گریم (Grimme)	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	۱۸۹۴ء
۳۱	ہنری دی کاستری (HenridеCastery)	فرانس	اسلام پر خیالات	۱۸۹۶ء
۳۲	ایف بوہل (Buhl)	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	۱۹۰۳ء
۳۳	والسٹن (Wallaston)	انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمدؐ کے ساتھ	۱۹۰۵ء
۳۴	مارگولیتھ (Margoliouth)	"	محمدؐ	"
۳۵	کوئل (Koell)	"	محمدؐ اور اسلام	۱۸۹۴ء
۳۶	پرنس کائتانی Caetani	اٹالیہ	تاریخ کبیر محمدؐ و اسلام و سلاطین اسلام	جاری
۳۷	میجر لیونارڈ (Leonard)	انگلینڈ	اسلام کا روحانی و اخلاقی پایہ	۱۹۰۹ء

مصنفین یورپ کی تین قسمیں

مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں۔ ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلانِ طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں۔ لیکن قلیل ماھم

(۲) عربی زبان اور علم ادب و تاریخ و فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں۔ ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی۔ لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام پر یا شارع اسلامؑ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے۔ اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے۔ لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ وہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا۔ نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے۔ لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے۔ جا بجا صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے رازِ پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

(۳) وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً پامر صاحب یا مارگولس صاحب۔ ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے۔ لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحصِ کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ع

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی ۶ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔ اور ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعوی نہیں ہو سکتا۔ لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب و افتراء اور تادیل و تعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی۔ اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بد منظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی داں ہیں، کئی سال مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے، لکھنؤ میں آکر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گذری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابۃ فی احوال الصحابہ، اول اول ان ہی نے تصحیح کرکے کلکتہ میں چھپوائی، لیکن جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ (۱)

یورپین مصنفین کی غلط کاریوں کے اسباب

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ، استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفات سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، چنانچہ اس کی بحث اوپر گذر چکی ہے، مصنفین سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں مثلاً سیف، سری، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں اس لئے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہو سکتی ہے، لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے، ان کے لئے یہ سرمایہ بے کار ہے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیح منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں، اور ایک آدھ کوئی ہے (مثلاً مارگولیس) تو اوّلاً وہ اس فن کا ماہر نہیں، اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور ہمارے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں حافظہ کیسا ہے اسکے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی۔

---

(۱) یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، میں جرمن نہیں جانتا، لیکن اس کے اقوال اکثر اور مصنفین نے نقل کئے ہیں اور وہ ہماری نظر سے گذرے ہیں۔

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ "اسمائے رجال" کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابل اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو، اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو، لیکن اس کی روایت قبول کرلی جائے گی۔

اس اختلاف اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے، مثلاً اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں، سب موجود ہوتی ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ تک محض زبانوں پر رہیں، ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جراءت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں، ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں، اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصول مشترکہ

یورپین مصنفین، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں۔

(۱) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ جاکر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعۃً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے، اور اس کے جو لوازم ہیں، یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۲) کثرت ازدواج اور میل الی النساء۔

(۳) مذہب کی اشاعت جبر و زور سے۔

(۴) لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

(۵) دنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر ہماری کتاب کے ناظرین کو، تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہئیے، کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار پر ٹھیک اتر سکتے ہیں یا نہیں۔

اس کتاب کی تصنیف و ترتیب کے اصول

ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں، اب ان کے بتانے کا وقت آگیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، ان کو سب پر مقدم رکھا ہے، یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، لیکن لوگوں نے آیات قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی، اس لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

(۲) قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں: ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، ارباب سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں، ان موقعوں پر ڈھونڈھتے ہیں، جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہئیے، اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں، اس لئے اگر عام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈھ کر مہیا کئے، جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔

(۳) روز مرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی جاتی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے، اور تا امکان کدو کاوش کی ہے، اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ابن ہشام، ابن سعد، اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے، جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس روایت کی تحقیق مقصود ہو، یہ آسانی ہو جائے۔

(۴) جن فروگذاشتوں کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، جہاں تک ممکن تھا ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

کتاب کے حصے

اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔

پہلے حصہ میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت سے لے وفات تک عام حالات اور واقعات وغزوات ہیں، اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے، آل و اولاد اور ازواجِ مطہراتؓ کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض، تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاحِ اعمال اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائضِ خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے، قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ باب باندھتے ہیں، لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی ضرورت بھی پیش آگئی ہے، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج یا تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے، یعنی یورپ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایہء معلومات کیا ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیونکر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائلِ اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و عادات یا مسائلِ اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان کے جوابات۔

یہ ضرور نہیں کہ یہ حصے اسی ترتیب سے شائع ہوں، بلکہ جس حصہ کی تیاری کے سامان فراہم ہو جائیں گے اور مرتب ہو جائے گا وہ شائع کر دیا جائے گا۔

استناد اور حوالے

تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے، اس لئے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضرور ہیں۔

(۱) صرف انہی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو خود میری نظر سے گذری ہیں۔

(۲) جو واقعات کسی قدر اہم ہیں ان کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند

تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کد و کاوش نہیں کی ہے۔

(۳) مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں مطبع کا نام بتا دیا گیا ہے۔ قلمی کتابوں کے متعلق تصانیفِ سیرت کی فہرست جو اوپر گذر چکی ہے۔ اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کون سا نسخہ تھا۔

*** وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ***

عرب

وجہ تسمیہ عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں ۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں ۔ اور چونکہ اہل عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے ۔ اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو "عرب" اور دنیا کی تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا ۔

بعض کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربۃ تھا ۔ قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربۃ آیا ہے ۔

ورجّت باحة العربات رجّا ترقرق فی منا کبها الدّماء
وعربة ارض جدّ فی الشر اهلها کما جدّ فی شرب النّقاح ظماء
وعربة ارض مایحل حرامها من الناس الا اللوذعی الحلاحل

عربۃ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں ۔ اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت و صحرا ہے ۔ اس لئے تمام ملک کو عرب کہنے لگے ۔

جغرافیہ عرب کے حدود اربعہ یہ ہیں :-

مغرب ۔ بحیرۂ قلزم

مشرق ۔ خلیج فارس اور بحر عمان

جنوب ۔ بحر ہند

شمال ۔ کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں ۔ بعض مملکت حلب اور فرات تک اس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں ۔

سینا کا جزیرہ نما ۔ جس کا نام التسمیہ ہے ۔ اکثر مصنفین عرب و یورپ اس کو مصر میں شمار کرتے ہیں ۔ لیکن جیالوجی کی رو سے وہ عرب سے متعلق ہے ۔

عرب کی پیمائش باقاعدہ اب تک نہیں ہوئی۔ تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمن اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے۔ طول تقریباً پندرہ سو، عرض چھ سو (٦٠٠) میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ میل مربع ہے۔

ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے، پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے، سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السراۃ ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے، اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فیٹ بلند ہے، بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔

چاندی اور سونے کی کانیں کثرت سے ہیں، علامہ ہمدانی نے "صفۃ جزیرۃ العرب" میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے، قریش جو تجارت کیا کرتے تھے، مورخین نے لکھا ہے زیادہ تر ان کا مال تجارت چاندی ہوتی تھی، برٹن صاحب نے مدین کی طلائی معادن پر خاص ایک کتاب لکھی ہے۔ (۱)

قدیم تاریخ کے ماخذ اسلام سے قبل عرب کی تاریخ کے ماخذ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) زمانہ جاہلیۃ کی بعض تصنیفات، جو سلاطین حیرۃ کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں، اور جو ابن ہشام کو ہاتھ آئی تھیں اور جن کا ذکر علامہ موصوف نے کتاب التیجان میں کیا ہے۔

(۲) زبانی روایتیں جو قدیم سے چلی آتی تھیں، عرب کا حافظہ نہایت قوی تھا، یہاں تک کہ آج اشعار جاہلیت کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے، اسلام کے زمانہ تک زبانی ہی روایت ہوتا چلا آتا تھا، اس بنا پر عرب کی قدیم تاریخ کا کافی سرمایہ محفوظ تھا، عرب کی جو قومیں معدوم ہو چکیں، مثلاً طسم، جدیس، عاد، ثمود، ان کے متعلق بھی اس قدر تاریخی روایتیں محفوظ تھیں کہ ان کے ذریعہ سے مورخین اسلام؛ عرب کی تاریخ قدیم پر معتد بہ تصنیفات مرتب کر سکے، مثلاً ہشام کلبی نے طسم، جدیس، تبابعۂ یمن اور دیگر سلاطینِ عرب پر متعدد کتابیں لکھیں، جن کا ذکر ابن الندیم نے فہرست صفحہ ٩٦ میں کیا ہے۔

---

(۱) Gold mines of medion

(۳) اشعار جاہلیت، جن میں اکثر سلاطین اور اقوام، اور عماراتِ عرب کا ذکر ہے، یہ اشعار صفۃ جزیرۃ العرب اور معجم البلدان میں کثرت سے موجود ہیں، انہی قدیم ماخذوں سے علامہ ہمدانی نے اپنی کتاب "اکلیل" (۱) مرتب کی ہے، جس کا آٹھواں باب خاص سلاطین حمیر کے آثارات قدیمہ اور حمیری کتبات پر مشتمل ہے۔

(۴) یورپ کی قدیم تصنیفات، مثلاً مصنفینِ یونان نے تھیو فراسٹس (جو حضرت عیسیٰ سے چار سو برس قبل تھا) سے لے کر بطلیموس تک بہت سے قبائل عرب کے نام لکھے ہیں، اور ان کی آبادیوں کے نام بھی بتائے ہیں، رومن مورخ پلینی نے بھی عرب کے متعلق لکھا ہے، گو نہایت مختصر ہے۔

(۵) عرب کی قدیم ویران شدہ عمارتوں کے کتبات جو قدمائے اسلام نے دریافت کئے تھے اور جو آج کل یورپ نے نہایت کثرت سے مہیا کئے ہیں۔

عرب کے اقوام و قبائل

مورخین عرب (۲) نے اقوام و قبائلِ عرب کو تین حصوں پہ منقسم کیا ہے:۔

عرب بائدہ یعنی عرب کے قدیم ترین قبائل جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔

عرب عاربہ بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے، اور جن کا اصل مسکن ملک یمن تھا۔

عرب مستعربہ بنو اسمعیل یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی۔

ظہور اسلام کے وقت بنو قحطان اور بنو اسمعیل جن کو عدنانی قبائل بھی کہتے ہیں، ملک کے اصلی باشندے تھے، اور ان کے علاوہ خال خال یہودیوں کی آبادی تھی، اس بنا پر درحقیقت ملک عرب اس وقت تین مختلف عناصر سے مرکب تھا، ہر عنصر کا قوام بے شمار قبائل و فروع سے تھا، جو یمن سے شام تک ہر خطہ زمین میں پھیلے ہوئے تھے، ان کی پھر مختلف چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں، چونکہ اس کتاب میں اکثر ان کے نام آئیں گے اس بنا پر ان کا ایک

(۱) اس کتاب کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ طبقات الامم (مطبوعہ بیروت) میں ہے۔ (۲) یہاں سے "عرب کی قدیم حکومتیں" سے پہلے تک زیادت ہے۔ "س"

مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

بنو قحطان

اس خاندان کی تین بڑی شاخیں ہیں۔

(۱) قضاعہ (۲) کہلان (۳) ازد، حمیر بھی اسی کی شاخ ہے جو یمن کے فرماں روا تھے، لیکن واقعات کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

(۱) قبائل قضاعۃ، عام علمائے انساب قضاعہ کو بنو قحطان میں داخل کرتے ہیں، اور ہم بھی یہاں ان کی پیروی کرتے ہیں، ورنہ ازروے تحقیق وہ بنو اسماعیل ہیں، بہر حال ان کی حسب ذیل شاخیں ہیں۔

بنو کلب، بنو تنوخ، بنو جرم، بنو جہینہ، بنو نہد، بنو عذرہ بنو اسلم، بلی، سلیح، ضجعم، تغلب، نمر، اسد، تیم اللات، کلب۔

(۲) کہلان۔

بجیلہ، خشعم، ہمدان، کندہ، مذحج، طے، لخم، جذام، عاملہ۔

(۳) ازد، انصار اسی کی شاخ تھے۔

اوس، خزرج، خزاعہ، غسان، دوس۔

مشہور عدنانی قبائل جن کا آخری مقسم مضر ہے، حسب ذیل ہیں، قبائل مضر اولا بنی خندف اور بنو قیس دو خاندانوں پہ منقسم ہیں۔

ا۔ خندف

ہذیل، کنانہ، اسد، ضبۃ، مزینہ، رباب، تمیم، ہون۔

ان میں سے ہر ایک کے متعدد فروع ہیں۔

اصول	فروع
کنانہ،	قریش، دول
ہون،	قارہ
رباب	عدی، تیم عکل، ثور
تمیم	مقاعس، قریع، بہدلہ، یربوع، ریاح، ثعلبہ، کلیب،

۲۔ قیس

عدوان، غطفان، اعصر، سلیم، ہوازن

ان میں بعض کے فروع یہ ہیں :-

غطفان :	عبس، ذبیان، فزارہ، مرہ،
اعصر :	غنی، باہلہ
ہوازن	سعد، نصر، جشیم، ثقیف، سلول، بنو عامر

(عامر کی شاخیں بنو ہلال، بنو نمیر، بنو کعب ہیں)

یہود

بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ،

بنو قحطان و آلِ اسمعیل نے اسلام سے پہلے متعدد حکومتیں قائم کی تھیں، جن کے جستہ جستہ واقعات کہیں ملتے ہیں۔]

عرب کی قدیم حکومتیں

کتبوں اور دیگر مورخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گذریں۔

(۱) معینی :	معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے، جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایہ تخت تھا۔
(۲) سبائی	یعنی قومِ سبا۔
(۳) حضر موتی۔	حضر موت، یمن کا مشہور مقام ہے۔
(۴) قتبانی	قتبان، عدن میں ایک مقام ہے جو آج کل گمنام ہے۔
(۵) نابتی	حضرت اسمعیلؑ کے ایک بیٹے کا نام نابت تھا، یہ سلسلہ انہی کی طرف منسوب ہے۔

معینی سلطنت، جنوبی عربستان میں تھی، اس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے، کتبوں سے تقریباً پچیس حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے، محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زمان تھیں یا متقدم و متاخر، گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے، اور حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی، لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیحؑ سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بنا پر سبائی اور معینی دونوں ہم عصر ہیں۔

سبائی دور، جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے، حضرت عیسیٰؑ سے سات سو برس قبل ہے، اس سلطنت کا پایۂ تخت مآرب تھا، اس زمانہ کے سنگی کتبے بہ کثرت موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے، اس دور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے، حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پایۂ تخت بنالیا۔

قریباً ۱۱۵ قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا، کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرماں روا گذرے، حمیر کے بعض کتبوں میں سنہ و سال بھی کندہ ہے، ان کے عہد حکومت میں رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی، اے لیس گالس، جس نے حضرت عیسیٰؑ سے ۱۸ برس قبل عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا، اس کے رہبر دغا بازی سے اس کو صحرا میں لے گئے اور ریگستان میں پہونچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہو گیا (۱)۔

حمیر نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا، اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی، اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی، اس عہد کا ایک کتبہ جو آج کل ہاتھ آیا ہے، اس پر یہ الفاظ ہیں:۔

رحمان، مسیح اور روح القدس کی قدرت و فضل و رحمت سے اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا جو بادشاہ حبش ارا حمیس ذبی مان کا نائب الحکومۃ ہے"۔

سبا اور حمیر کی عظمت اور اقتدار اور وسعت فتوحات کی روایتیں عرب میں اس قدر متواتر ہیں کہ ان کے قدر مشترک سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اشعار میں بھی کثرت سے واقعات مذکور ہیں، عربوں کے خیال کے موافق سلاطین حمیر نے ایران کے انتہائی مقامات فتح کر لئے تھے، ذوالقرنین، جس کو عوام سکندر کہتے ہیں، اہل عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرماں روا تھا، شاہنامہ میں مذکور ہے کہ کیکاؤس کو شاہ ہاماوران نے گرفتار کر لیا تھا، علامہ ثعالبی نے تاریخ ایران میں (جو اب یورپ میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے) لکھا ہے کہ یہ ہاماوران، حمیر کا بادشاہ تھا، اور ہاماوران دراصل وہی عربی حمیر ہے، علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودابہ جو

---

(۱) یہ تمام تفصیل انسائیکلوپیڈیا کے اس آرٹکل سے ماخوذ ہے جو جی ڈبلو تھیاچر صاحب نے عرب پر لکھا ہے، نیز لٹریری ہسٹری آف دی عربس مؤلفہ رینالڈ نکلسن پروفیسر کیمبرج صفحہ ۴ تا ۶۔

کیکاؤس کی زوجہ تھی اور فردوسی کے بیان کے موافق سیاوش پر عاشق ہو گئی تھی، اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی اور اس کا اصلی نام سعدی تھا، ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سودابہ کر لیا تھا۔
یورپ کی تحقیقات حال سے بھی سبا اور حمیر کے اعلا درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے، پروفیسر نولدیکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے:۔

"ولادت مسیح سے ہزار سال قبل، جنوبی و غربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا، اور جو اپنی بارشِ گرما کے باعث زراعت کے لئے نہایت موزوں تھا، تمدن کے اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذبات مدح و ستایش کو تحریک ہوتی ہے، اور اہل یونان و روم نے اس کو "دولت مند عرب" کا جو لقب دیا تھا وہ بے جا نہ تھا ...... توراۃ میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں، چنانچہ ملکۂ سبا کا سلیمانؑ سے ملاقات کا قصہ خاص طرح پر قابل ذکر ہے، (۱۔ سلاطین ۱۰، آیت ا تا ۱۰) قوم ثمود، جن کی عمارات سے ڈاؤٹی یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے، نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے، اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انہی سے حاصل کی ہے۔ کتابت کا فن جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا اب اس کو خود انہوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا، یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری جانب ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا" (۱)۔

نابتی حکومت، جو شام کے حدود سے متصل تھی، اور جو قوم ثمود کی مرادف یا ان کی قائم مقام تھی، اس کی نسبت فارسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں:۔

"ان مختصر بیانات سے معلوم ہوا ہو گا کہ زمانۂ قدیم میں نابت کا نام اور اثر نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا، بلکہ حجاز و نجد کے صوبہ ہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا، نابتی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ اندوز ہونے میں کمال رکھتے تھے،

(۱) مورخین کی تاریخ عالم جلد ۸۔ یعنی ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ تمہیدی آرٹیکل نوشتہ پروفیسر نولڈیکی صفحہ ۵۔

وہاں دوسری طرف بطور سچے بنو اسماعیل کے خطرات جنگ کے لئے بالکل مستعد رہتے تھے؛ فلسطین و شام میں ان کی غارت گریوں اور خلیج عرب میں مصری جہازات پر ان کی رہزنی نے بارہا تاج دارانِ مقدونیہ کو ان کی دشمنی پر آمادہ کر دیا، لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شے انہیں روک نہ سکی اور روما کی اطاعت بھی انہوں نے اسٹرابو کے زمانہ میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کی" (۱)۔

یہ قدیم سلطنتوں کا حال تھا، اسلام کے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں، ان کے بجائے یمن میں صرف بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے، جن کو قیل یا مقول کہتے تھے، عراق میں آل منذر کا خاندان قائم تھا، جو فارس کے زیر اثر تھا، خورنق اور سدیر عرب کی مشہور عمارتیں اسی سلسلہ کی یادگار ہیں، شام کے حدود میں غسانی خاندان فرماں روا تھا، جو قیصرانِ روم کا ماتحت تھا، اور جس کا اخیر فرماں روا جبلہ بن الایہم غسانی تھا۔

تہذیب و تمدن

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے، مانسیو لیبان (۲) فرنساوی نے اصول عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوج کمال تک پہنچ چکا تھا، کیونکہ اصولِ ارتقاء کے رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعۃً اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن تک نہیں پہنچ سکتی"۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے، تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے بعض حصے مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے، یورپ کے محققینِ آثار قدیمہ جنہوں نے یمن کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کی ہے، اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے، وہ یمن کی قدیم تہذیب و تمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔

صنعا اور قلیس کے ذکر میں یاقوت حموی نے معجم میں قدیم آثارات عجیبہ کا تذکرہ کیا ہے، اور گو اس میں بہت کچھ مبالغہ بھی ہے، تاہم اصلیت کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔

اسی طرح عرب کے وہ مقامات جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً حیرہ جو آلِ نعمان کا پایۂ تخت تھا، اور حوران جو خاندانِ غسان کا صدر مقام تھا تہذیب و تمدن سے خالی نہ تھے۔

---

(۱) تاریخی جغرافیہ عرب از ریورنڈ فارسٹر جلد اول از صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۸۔ (۲) تمدن عرب۔

مورخین عرب کا دعویٰ ہے کہ یمن نے ایک زمانہ میں اس حد تک ترقی کی تھی کہ وہاں کے سلاطین نے تمام ایران فتح کر لیا تھا، چنانچہ سمرقند کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ یمن کا ایک بادشاہ جس کا نام شمر تھا، اس نے سمرقند کو کھدوا کر برباد کر دیا تھا، اس بنا پر ایرانی اس مقام کو شمر کند کہنے لگے، پھر معرب ہو کر سمرقند ہو گیا۔

عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کے آثار، جو اب بھی کچھ کچھ باقی ہیں، اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ اس ملک میں کبھی اعلیٰ درجہ کا تمدن موجود تھا، علامہ ہمدانی نے اکلیل میں تمام آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ صفۃ جزیرۃ العرب (۱) میں لکھتے ہیں:۔

المشہور من محافد الیمن و قصورھا القدیمۃ التی ذکرتھا العرب فی الشعر والمثل......... کثیرۃ الذی فیھا من الشعر باب واسع وقد جمع ذلک کلہ الکتاب الثامن من الاکلیل	یمن کے مشہور قدیم قصر اور ایوان جن کا ذکر اہل عرب نے اشعار اور امثال میں کیا ہے......... کثرت سے ہیں، اور ان کے متعلق اشعار کا ایک دفتر ہے، اکلیل کے آٹھویں باب نے ان سب کو جمع کر دیا ہے

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ میں اس موقع پر صرف ان کے نام گنا دیتا ہوں اور وہ یہ ہیں:۔

غمدان، تلعم، ناعط، صرواح، سلحین، ظفار، ھکر، ضھر، شبام، غیمان، بینون، ریام، براقش، معین، روثان، ارباب، ھند، ھنیدہ، عمران، نجیر،

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال، معجم البلدان میں تفصیل سے مذکور ہے اور اس کی عظمت و رفعت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں جن پر ایشیائی مبالغہ کا دھوکہ ہوتا ہے، سلحین کی نسبت لکھا ہے کہ ستر ۷۰ برس میں تعمیر ہوا، شبام کے حال میں لکھا ہے:۔

لھم فیہ حصون عجیبۃ ھائلۃ	اس میں ان کے متعدد ہیبت انگیز قلعے ہیں

قلعہ ناعط وہب بن منبہ کے زمانہ تک موجود تھا، اس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے پڑھا تو معلوم ہوا کہ سولہ سو ۱۶۰۰ برس کی تعمیر ہے، آج کل یورپ کے محققین نے

(۱) (ج ا ص ۲۰۳) "س"

ان مقامات پر جاکر جو تحقیقات کی ہے اس سے بھی حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے۔ تھیاچر صاحب اپنے آرٹکل میں لکھتے ہیں (۱) :-

"جنوبی عربستان میں جہاں حضرت عیسیٰ سے صدیوں پہلے ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا، قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار اب تک موجود ہیں اور ان کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے............ یمن اور حضر موت میں یہ آثار کثرت سے ہیں اور اکثروں پر اب تک کتبے موجود ہیں............ صنعاء کے قریب ایک قلعہ تھا، جس کو قزوینی نے آثار البلاد میں دنیا کے عجائب ہفت گانہ میں سے ایک قرار دیا ہے (دیگر قلعوں کے لئے دیکھو جنرل جرمن اورینٹل سوسائٹی جلد ۱ صفحہ ۲۰ سے آگے)

مارب جو قدیم سبائی دار السلطنت تھا، اس کے آثار قدیمہ کو ارنو، ہالیوے اور گلازر نے دیکھا ہے۔

مارب کے مشہور آثار میں سے ایک بڑی خندق کے آثار باقی ہیں، ان کو دیکھ کر عدن کے دو بارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں، ان کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی، جب گلازر نے وہ دو طویل الذیل کتبے شائع کئے جن میں ان کے عیسوی قرن پنجم و ششم میں دو بارہ تعمیر کا ذکر ہے، یمن میں بہ مقام حران ایک اور خندق ہے جس کا طول تقریباً چار سو پچاس فٹ ہے"۔

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن کی یہ حالت نہ تھی، عربی زبان نہایت وسیع ہے، باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسبابِ معاشرت سے تعلق ہے، ان کے لئے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے، بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں، سکہ کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں، درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں، درہم یونانی لفظ درخم ہے، اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا ہے، چراغ معمولی چیز ہے، تاہم اس کے لئے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا، چراغ کو لے کر سراج کر لیا، پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا مصباح یعنی ایک

(۱) دیکھو انسائیکلو پیڈیا مضمون "عرب"

آلہ جس سے صبح بنالی جاتی ہے۔ کوزہ کے لئے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز کر لیا ہے۔ لوٹے کو ابریق کہتے ہیں، جو آب ریز کا معرب ہے، تشت فارسی لفظ تھا، اسی کو عربی میں طست کر لیا ہے، پیالہ کو کاس کہتے ہیں، وہی کاسہ فارسی لفظ ہے، کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں، یہ بھی فارسی ہے، پائجامہ کو سروال کہتے ہیں، جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لفظ نہ تھے تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی آس پاس لے ممالک کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر کی تھی، اس لئے جو مقامات ان ممالک سے دور تھے، اسی اصلی حالت پر رہ گئے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے، مسئلہ حجاب کے شانِ نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے، کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور نہ تھی، مستورات رفع حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں، ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا وہی آٹا ہوتا تھا، بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، ابو داؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تھا، لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض (۱) کا حرام ہونا نہیں سنا، (۲) اگرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی، لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے، تاریخ اور ادب میں بہ تصریح موجود ہے کہ عرب کھنکھجورا، گوئے، گرگٹ، بہی، اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔

عرب کے مذاہب

عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب تھے، بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے زمانہ یا فطرت (قانون قدرت) ہے، خدا کوئی چیز نہیں، ان ہی لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں ہے۔

وَقَالُوْا مَاهِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ — اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی ہماری

(۱) حشرات الارض کیڑے مکوڑے کو کہتے ہیں۔ (۲) ابو داؤد جلد دوم صفحہ (۱۷۶) باب فی اکل حشرات الارض۔

وَ نَحْیٰی وَمَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ ۴۵: ۲۴)
دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے اور جیتے ہیں، اور ہم کو مارتا ہے تو زمانہ مارتا ہے۔

بعض خدا کے قائل تھے، لیکن قیامت اور جزا و سزا کے منکر تھے، ان کے مقابلہ میں قرآن مجید نے قیامت کے ثبوت پر اس طرح استدلال کیا ہے۔

قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ (یٰسین ۳۶: ۷۹)
کہہ دو کہ (ہڈیوں کو) وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔

بعض خدا اور جزا و سزا کے بھی قائل تھے، لیکن نبوت کے منکر تھے، ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَقَالُوْا مَا لِهٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ (بنی اسرائیل ۱۷: ۹۴)
اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا پیتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔

قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (فرقان ۲۵: ۷)
کہتے ہیں کہ خدا نے آدمی پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہیے، جو حاجاتِ انسانی سے منزہ ہو۔

لیکن عموماً لوگ بت پرست تھے، وہ بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ کہتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کے وسیلے ہیں (۱)۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی (زمر ۳۹: ۳)
ہم ان بتوں کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔

قبیلۂ حمیر جو یمن میں رہتا تھا، آفتاب پرست تھا، کنانہ چاند کو پوجتے تھے، قبیلۂ بنی تمیم، دبران کی عبادت کرتا تھا، اسی طرح قیس، شعریٰ کی، قبیلۂ اسد عطارد کی اور لخم و جذام، مشتری کی پرستش (۲) کرتے تھے۔

مشہور بتوں اور ان کے پوجنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں (۳):۔

---

(۱) یہ تمام تفصیل "ملل و نحل" شہرستانی مذاہب عرب کے ذکر میں ہے۔ (۲) طبقات الامم، لابن صاعد الاندلسی، مطبوعہ بیروت ۱۹۱۲ء صفحہ ۴۳ (۳) بتوں کی تفصیل "ملل و نحل" میں ہے۔

نام بت	مقام	قبیلہ جو اس بت کو پوجتا تھا
لات	طائف	ثقیف
عزیٰ	مکہ معظمہ	قریش و کنانہ
منات	مدینہ منورہ	اوس، خزرج، اور غسّان
ودّ	دومۃ الجندل	کلب
سواع		ہذیل
یغوث		مذحج اور بعض قبائل یمن
یعوق		ہمدان

سب سے بڑا بت ہبل تھا، جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا، قریش لڑائیوں میں اس کی جے پکارتے تھے۔

عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحیٔ تھا، اس کا اصلی نام ربیعۃ ابن حارثہ تھا، عرب کا مشہور قبیلۂ خزاعۃ اسی کی نسل سے ہے، عمرو سے پہلے جرہم کعبہ کے متولی تھے، عمرو نے لڑکر جرہم کو مکہ سے نکال دیا اور خود حرم کا متولی ہو گیا، وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا، وہاں کے لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو پوچھا کہ ان کو کیوں پوجتے ہو، انہوں نے کہا کہ یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں، عمرو نے چند بت ان سے لے لئے اور لاکر کعبہ کے آس پاس قائم کئے، کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا، اس لئے تمام قبائل میں بت پرستی کا رواج ہو گیا، ان میں سب سے قدیم بت مناۃ تھا، یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا، اوس اور خزرج یعنی مدینہ کے لوگ اسی پر قربانی چڑھاتے تھے، اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تھے تو احرام یہیں اتارتے تھے، ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے (۱)۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان (ذکر مکہ) میں لکھا ہے کہ عرب میں بت پرستی کی عام اشاعت کی وجہ یہ ہوئی کہ قبائل عرب جو تمام اطراف سے حج کو آتے تھے واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھا لیتے تھے، اور ان کو اصنام کعبہ کی صورت پر تراش کر ان کی عبادت کرتے تھے۔

اللہ کا اعتقاد عرب گو قریبا سب کے سب بت پرست تھے، لیکن اس کے ساتھ یہ

(۱) یہ تمام تفصیل معجم البلدان ذکر منات میں ہے۔

اعتقاد ان کے دل سے کبھی نہیں گیا کہ اصلی خدائے برتر اور چیز ہے، اور وہی تمام عالم کا خالق ہے، اس خالقِ اکبر کو وہ "اللہ" کہتے تھے، قرآن مجید میں ہے:-

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَأَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ (عنکبوت ۲۹ : ۶۱)

اور ان لوگوں (کافروں) سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا، اور چاند اور سورج کو کس نے تابعدار بنا رکھا ہے تو بول اٹھیں گے کہ "اللہ" پھر کدھر بہکے جا رہے ہیں۔

فَإِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ۔ (عنکبوت ۲۹ : ۶۵)

پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔

قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے جس حقیقت کا اظہار کیا، آج تحقیقات آثار قدیمہ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا (۱) میں مشہور مستشرق نولدیکی کا جو قول نقل کیا ہے اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں:-

"اللہ" جو صفا کے کتبوں میں "ھلہ" لکھا ہوا ہے، نباتی اور دیگر قدیم باشندگان عرب شمالی کے نام کا ایک جزء تھا، مثلاً "زید اللہی"...... نباتی کتبات میں اللہ کا نام بطور ایک علٰحدہ معبود کے نہیں ملتا، لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے، متاخرین مشرکین میں اللہ کا نام نہایت عام ہے، ولہاسن نے عرب قدیم کے لٹریچر میں بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں، جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبود اعظم کے مستعمل ہوا ہے، نباتی طبات میں ہم بار بار کسی دیوتا کا نام پاتے ہیں، جس کے ساتھ اللہ کا لقب شامل ہے، اس سے ولہاسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا لقب جو پہلے مختلف معبودوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، رفتہ رفتہ زمانہ مابعد میں صرف ایک عظیم ترین معبود کے لئے بطور علم کے مخصوص ہو گیا"۔

نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت

اگر چہ زمانہ اور مدت کا تعین مشکل ہے، لیکن یہ تینوں مذہب ایک مدت دراز سے عرب میں رائج ہو چکے تھے، علامہ ابن قیتبہ

(۱) جلد ۱ صفحہ ۶۶۴۔

نے معارف میں لکھا ہے کہ قبائلِ ربیعہ و غسان نصرانی تھے، قضاعہ میں بھی اس مذہب کا اثر پایا جاتا تھا، نصرانیت کو اس قدر ترقی ہو چکی تھی کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے (مثلاً ورقہ بن نوفل) جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے، متعدد ایسے لوگ تھے جنھوں نے شام میں جا کر تعلیم پائی تھی۔

حمیر، بنو کنانہ، بنو حرث بن کعب، کندہ، یہ قبائل یہودی تھے، مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پالیا تھا، اور توراۃ کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں قائم تھیں، جن کو بیت المدراس کہتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ان کا ذکر آتا ہے، قلعہ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی، امراء القیس کا ہم عصر مشہور شاعر سمویل بن عادیا جس کی وفاداری آج تک عرب میں ضرب المثل ہے، یہودی تھا۔

اہل کتاب کی روایتیں مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہوتا تھا اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے تو کفار بدگمانی کرتے تھے کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھاتا ہے، خود قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (نحل ۱۶: ۱۰۳)	اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ محمدؐ کو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔

قرآن مجید میں اس خیال کا ابطال بھی کر دیا ہے، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

قبیلۂ تمیم مجوسی تھا، زرارہ تمیمی نے جو اس قبیلہ کا مشہور رئیس تھا، اسی بنا پر اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، گو اس پر اس کو ندامت ہوئی، اقرع بن حابس بھی مجوسی (۱) تھا۔

مذہب حنیفی

دین ابراہیمی کا ام الاصول توحید خالص تھی، زمانہ کے امتداد اور جہالت کے شیوع سے یہ اصول اگرچہ شرک آلود ہو گیا تھا، یہاں تک کہ خود خانہ خدا میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، تاہم بالکل فنا نہیں ہو سکتا تھا، عرب میں کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نشان نظر آتا تھا، جو لوگ صاحب بصیرت تھے ان کو یہ منظر نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا کہ انسان عاقل، جماد لایعقل کے سامنے سر جھکائے، اس بنا پر بت پرستی کی برائی کا خیال بہتوں کے دل میں آیا، لیکن اس کا تاریخی زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے (۲)، ابن اسحاق نے لکھا ہے ایک دفعہ کسی بت کے سالانہ میلہ میں ورقہ بن نوفل،

(۱) معارف ابن قتیبہ (۲) سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر ص ۷۶۔

عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے، ان لوگوں کے دل میں دفعۃً یہ خیال آیا کہ یہ کیا بیہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے، نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ چاروں قریش کے خاندان سے تھے، ورقہ حضرت خدیجہؓ کے برادر عم زاد تھے، زید حضرت عمرؓ کے چچا تھے، عبداللہ بن جحش حضرت حمزہؓ کے بھانجے تھے، عثمان عبدالعزیٰ کے پوتے تھے۔

زید، دین ابراہیمی کی تلاش میں شام گئے، وہاں یہودی اور عیسائی پادریوں سے ملے، لیکن کسی سے تسلی نہیں ہوئی، اس لئے اس اجمالی اعتقاد پر اکتفا کیا کہ "میں ابراہیمؑ کا مذہب قبول کرتا ہوں"۔ صحیح بخاری میں (باب بنیان الکعبہ سے پہلے) حضرت اسماءؓ (دختر ابوبکر صدیقؓ) سے روایت ہے کہ "میں نے زید کو اس حالت میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے لوگوں سے کہتے تھے، "اے اہل قریش! تم میں سے کوئی شخص بجز میرے، ابراہیمؑ کے دین پر نہیں ہے"۔

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، زید ہی پہلے شخص ہیں جس نے اس رسم کی ممانعت کی، جب کوئی شخص ایسا ارادہ کرتا تو وہ جا کر اس لڑکی کو مانگ لیتے، اور خود اس کی پرورش کرتے۔

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے زید کو دیکھا تھا اور ان سے صحبت رہی تھی، ورقہ اور عبداللہ بن جحش اور عثمان بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔

اسی زمانہ کے قریب امیہ بن ابی صلت نے جو طائف کا رئیس اور مشہور شاعر تھا بت پرستی کی مخالفت کی، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں زبیر بن بکار کی سند سے لکھا ہے کہ امیہ نے زمانہ جاہلیت میں آسمانی کتابیں پڑھی تھیں، اور بت پرستی کو چھوڑ کر دین ابراہیمی اختیار کر لیا تھا

امیہ کا دیوان آج بھی موجود ہے، اگرچہ اس کا بڑا حصہ جعلی ہے، تاہم اصلی کلام بھی اس میں پایا جاتا ہے، وہ غزوہ بدر تک زندہ رہا، عتبہ جو رئیس مکہ اور امیر معاویہؓ کا نانا تھا، امیہ کا ماموں زاد بھائی تھا، امیہ نے اس کے قتل ہونے کی خبر سنی تو اس کو سخت صدمہ ہوا، اور نہایت پر درد مرثیہ لکھا، غالباً اسی کا اثر تھا کہ اسلام قبول نہ کر سکا۔

شمائل میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم ردیف تھے، انہوں نے امیہ کا ایک شعر پڑھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اور"

انہوں نے سو شعر پڑھے، ہر شعر کے ختم ہونے پر آپؐ فرماتے جاتے تھے کہ "اور" اخیر میں آپؐ نے فرمایا "امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا"۔

ابن ہشام نے بت پرستی کی مخالفت کرنے والوں میں انہی چاروں کا نام لکھا ہے، لیکن اور تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اور متعدد اہل نظر پیدا ہوگئے تھے، جنہوں نے بت پرستی سے توبہ کی تھی، ان میں سب سے زیادہ مشہور شخص عرب کا نامور خطیب قس بن ساعدۃ الایادی ہے، اس کا تذکرہ آگے آتا ہے، ایک شخص قیس بن نشبہ تھا، جس کی نسبت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں خدا پرست ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

یہ تحقیق نہیں کہ دین ابراہیمی کو حنیفی کیوں کہتے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اس کے معنی میں اختلاف ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ چونکہ اس دین میں بت پرستی سے انحراف تھا، اس لئے اس کو حنیفی کہتے ہیں، کیوں کہ حنف کے معنی انحراف کے ہیں، عبرانی اور سریانی (۱) زبان میں حنیف کے معنی منافق اور کافر کے ہیں، ممکن ہے کہ بت پرستوں نے یہ لقب دیا ہو، اور موحدین نے فخریہ قبول کر لیا ہو۔

یہ امر اکثر روایتوں سے ثابت ہے کہ عرب اور خصوصاً مکہ اور مدینہ میں متعدد اشخاص بت پرستی کے منکر ہو گئے تھے، اور ملت ابراہیمی کی جستجو میں تھے، یہ اس لئے کہ مجدد ملت ابراہیمی کے ظہور کا وقت قریب آگیا تھا۔

ان چند راہ طلب اور حقیقت جو اشخاص کے وجود کی بنا پر مصنفین یورپ کہتے ہیں کہ مذہب صحیح اور توحید خالص کا رواج عام عرب میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کے ظہور پر اس قدر کیوں ہنگامہ برپا ہوا؟

کیا عرب میں ان مذاہب نے کچھ اصلاح کی

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عرب میں تمام مشہور مذاہب موجود تھے یہودیت بھی، نصرانیت بھی، مجوسیت بھی، حنیفیت بھی، اور عقلی بلند پروازی کی معراج الحاد بھی، لیکن ان سب کا نتیجہ کیا تھا؟ عقائد کے لحاظ سے یا تو خداؤں کی وہ کثرت، جس کو نصرانیت نے بہت گھٹایا، تاہم تین کی تعداد سے کم نہ کر سکی، اس کے ساتھ یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰؑ خود سولی پر چڑھ کر تمام بنی آدم کے

(۱) یہ مارگولیوس کا بیان ہے۔

گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ یا توحید تھی، لیکن خدا اس قسم کا تھا، جو آدمیوں سے کشتی لڑتا تھا (۱)۔

بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی، قمار بازی، شراب خواری، زنا کاری کا رواج عام تھا، بے حیائی کی یہ حالت کہ سب سے بڑا نامور شاعر امراء القیس جو شہزادہ بھی تھا، قصیدہ میں پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے، اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔

لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہِ تیغ کرنا عموماً جائز تھا، عیسائیوں کے بیان کے مطابق عرب قبل اسلام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ عیسائیت سے متاثر تھا، تاہم اس اثر کا کیا نتیجہ تھا؟ اس کو خود عیسائی مورخین کی زبان سے سننا چاہیئے: ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے:۔

"عیسائیوں نے عرب کو پانچ سو برس تعلیم و تلقین کی، اس پر بھی خال خال عیسائی نظر آتے تھے، بنو حارث نجران میں، بنو حنیف یمامہ میں اور کچھ بنی طے میں عیسائی تھے، باقی خیریت .... بالآخر عرب کو من حیث المذہب دیکھئے تو اس کی سطح پر عیسائیوں کی ضعیف کوششوں کی کچھ خفیف سی موجیں لہراتی نظر آتی تھیں، اور یہود کی قوت بھی کبھی بڑی شدت سے طغیانی کرتی نظر آتی تھی، لیکن بت پرستی، اور بنو اسماعیل کے بیہودہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش مارتا ہوا کعبہ سے آکر ٹکراتا تھا (۲)"۔

یہ حالت عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی (اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصہ میں آئے گی) کیا اس عام ظلمت، اس عالمگیر تیرگی، اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی میں ایک آفتابِ عالمتاب کی حاجت نہ تھی؟

---

(۱) توراۃ، تکوین، آیت ۲۲ تا ۲۹ میں حضرت یعقوبؑ کے خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔ (۲) میور صاحب کی لائف آف محمد جلد ۱، دیباچہ۔

سلسلہ اسماعیلی

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مورخین عرب نے عرب کی تین قسمیں کی ہیں۔

عرب کی وہ قدیم قومیں جو بالکل برباد ہو گئیں، مثلاً طسم و جدیس وغیرہ۔

خالص عرب جو قحطان کی اولاد ہیں، مثلاً اہل یمن اور انصار (اور تیسرا سلسلہ اسماعیلی)۔

حضرت اسماعیلؑ جب مکہ میں آباد ہوئے تو حوالی مکہ میں بنو جرہم آباد تھے، حضرت اسماعیلؑ نے اس خاندان میں شادی کی، اس سے جو اولاد ہوئی وہ عرب مستعربہ کہلاتی ہے، اب عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے۔

پیغمبر اسلام اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت اسماعیلؑ ہی کے خاندان سے ہیں، اور جو شریعت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عنایت ہوئی، وہی ہے جو حضرت اسماعیلؑ کو عطا ہوئی تھی، قرآن مجید میں ہے:۔

مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا (حج ۲۲: ۷۸)	تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اسی (۱) نے اس سے پہلے تمہارا نام مسلم رکھا، (اور اس قرآن میں بھی)۔

لیکن یورپ کے بہت سے متعصب مورخ سرے سے ان حقائق کے منکر ہیں، یعنی نہ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ عرب میں آئے، نہ انہوں نے کعبہ کی بنیاد ڈالی، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماعیلؑ کی اولاد ہیں۔

چونکہ ان مباحث نے مذہبی تعصب کی صورت اختیار کر لی ہے اس لئے یہ توقع مشکل ہے کہ ہم اس بحث کو اس طرح طے کر سکیں گے کہ استدلال کی بنیاد یورپ کے مسلمات پر رکھی جائے۔

جو واقعات مختلف فیہ ہیں بہت ہیں، لیکن اصولی امور صرف دو ہیں، جن میں

(۱) اس کا مرجع بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنایا ہے اور بعض نے اللہ تعالیٰ کو، اور یہی صحیح ہے جیسا کہ آیات سے صاف ظاہر ہے۔] " س "

دونوں فریق کا کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتا، یہ اصول جس فریق کے موافق طے ہوں اس کے فرعی جزئیات بھی اسی کے موافق تسلیم کر لینے چاہئیں، اصولِ مذکورہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ عرب میں آکر آباد ہوئے یا نہیں؟

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰقؑ کو قربانی کرنا چاہا تھا یا حضرت اسماعیلؑ کو؟

حضرت اسماعیلؑ کہاں آباد ہوئے؟

یہود مدعی ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ ذبیح ہیں اس بنا پر وہ قربانی گاہ کا موقع شام بتاتے ہیں، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسحٰق نہیں، بلکہ حضرت اسماعیلؑ تھے، تو قربانی گاہ کے موقع کی نسبت عرب ہی کی روایتیں تسلیم کرنی پڑیں گی اور اس حالت میں تاریخ کی تمام کڑیاں متصل ہو جائیں گی۔

توراۃ میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے ہوئی، جس کا نام اسماعیل رکھا گیا، حضرت اسماعیلؑ کے بعد حضرت سارہؑ کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے، حضرت اسماعیلؑ جب بڑے ہوئے تو حضرت سارہؑ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ہاجرہؑ اور اس کے بیٹے کو گھر سے نکال دو، ان واقعات کے بعد توراۃ کے خاص الفاظ یہ ہیں:۔

"تب ابراہیمؑ نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی، اور ہاجرہؑ کو اس کے کاندھے پر دھر کر دی اور اس لڑکے کو بھی رخصت کیا، وہ روانہ ہوئی، بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی، اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا، اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے ٹپے پر دور جا کر بیٹھی، کیونکہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں، سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کر روئی، تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی، اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا، اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے، خدا نے سنی، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا، اور جا کر اپنی مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا، اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا، اور تیر انداز ہو گیا، اور وہ فاران کے بیابان میں رہا، اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی"۔ (توراۃ سفر پیدائش باب ۲۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ جب گھر سے نکالے گئے تو بالکل بچہ تھے چنانچہ حضرت ہاجرہؓ نے مشک کو اور ان کو کاندھے پر اٹھایا، عربی تورات میں صاف یہ الفاظ ہیں:۔

واضعا ایاھا علی کتفھا والولد حضرت ابراہیمؑ نے مشک اور بچہ دونوں کو ہاجرہ کے کندھے پر رکھا۔

لیکن توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی،(۱) اور جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کا ختنہ کیا تو حضرت اسماعیلؑ کی عمر ۱۳ برس کی، اور حضرت ابراہیمؑ کی ننانوے ۹۹ برس کی تھی (۲)۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے گھر سے نکالے جانے کا واقعہ ختنہ کے بعد کا ہوگا، اس لئے اس وقت قطعاً ان کی عمر ۱۳ برس سے زیادہ تھی، اور اس سن کا لڑکا اتنا چھوٹا نہیں ہوتا کہ ماں اسے کندھے پر اٹھائے پھرے، اس واقعہ سے غرض یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ انکو اور ان کی والدہ کو اصلی مقام سکونت سے دور مقام پر لا کر آباد کر سکتے تھے۔

توراۃ کی عبارت مذکورہ میں تصریح ہے کہ حضرت اسماعیلؑ فاران میں رہے اور تیر اندازی کرتے رہے، عیسائی کہتے ہیں کہ فاران اس صحرا کا نام ہے جو فلسطین کے جنوب میں واقع ہے، اس لئے حضرت اسماعیلؑ کا عرب میں آنا خلاف واقعہ ہے۔

جغرافیہ دانانِ عرب عموماً متفق ہیں کہ فاران حجاز کے پہاڑ کا نام ہے، چنانچہ معجم البلدان میں صاف تصریح ہے، لیکن عیسائی مصنفین اس سے اتفاق نہیں کر سکتے، اس کا فیصلہ ایک بڑی طول طویل بحث پر مبنی ہے، جو مباحثہ اور مناظرہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے ہم اس کو قلم انداز کرتے ہیں، البتہ اس قدر بتانا ضروری ہے کہ عرب کی حد شمالی کسی زمانہ میں کس حد تک وسیع تھی۔

موسیو لیبان، تمدن عرب میں لکھتے ہیں:۔

"اس جزیرے کی حد شمالی اس قدر صاف اور آسان نہیں ہے، یعنی یہ حد اس طرح پر قائم ہوتی ہے کہ غزہ سے جو فلسطین کا ایک شہر اور بحر متوسط پر واقع ہے، ایک خط جنوب بحرِ لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک اور دریائے

(۱) پیدائش باب ۱۶۔ (۲) پیدائش باب ۱۷، ۲۴۔۲۵

فرات کے کنارے کنارے لاکر خلیج فارس میں ملادیا جائے۔ پس اس خط کو عربستان کی حد شمالی کہہ سکتے ہیں"۔

اس بنا پر عرب کے حجازی حصہ کا فاران میں محسوب ہونا خلاف قیاس نہیں، توراۃ (۱) میں جہاں حضرت اسماعیلؑ کی جائے سکونت کا بیان ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں:۔

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے، جس سے سور کو جاتے ہیں، بستے تھے"۔

اس تحدید میں مصر کے سامنے جو زمین پڑتی ہے وہ عرب ہی ہو سکتا ہے، نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں جس قدر اعتنا ہے، بنو اسرائیل کے ساتھ ہے، بنی اسماعیلؑ کا ذکر محض ضمنی طور پر آجاتا ہے، اور اس وجہ سے حضرت اسماعیلؑ کا عرب میں آباد ہونا بہ تصریح نہیں ملتا، لیکن مختلف تلمیحات سے مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کا عرب میں آباد ہونا ایک مسلّمہ امر تھا، عہد جدید میں جس کو عیسائی وحی الٰہی سمجھتے ہیں، پولوس کا ایک خط گلیتون کے نام ہے، اس میں یہ عبارت ہے (۲):۔

"ابراہیم کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی سے، دوسرا آزاد سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا، جسم کے طور پر پیدا ہوا، اور جو آزاد سے تھا، سو وعدے کے طور پر، یہ بات تمثیلی بھی مانی جاتی ہے، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہے، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے، اور اب کے یروشلم کا جواب ہے"۔

اگرچہ معلوم نہیں کہ اصلی عبارت کیا تھی، اردو اور عربی دونوں ترجمے ناصاف ہیں، تاہم اس قدر واضح ہے کہ پولوس جو حضرت عیسیٰؑ کے سب سے بڑے جانشین ہیں، حضرت ہاجرہؑ کو عرب کا کوہ سینا کہتے تھے، اگر حضرت ہاجرہؑ عرب میں آباد نہ ہوئی ہوتیں تو ان کو عرب کا کوہ سینا کہنا کیا معنی رکھتا ہے، آگے چل کر بکۃ کے ذکر میں یہ بحث زیادہ موید ہو جائے گی۔

ذبیح کون ہے؟

توراۃ اگرچہ یہودیوں کی عدم احتیاط، اغراض ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتاپا مسخ ہو گئی ہے اور خصوصاً پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس میں جو تصریحات اور تلمیحات تھیں یہود کے دست تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے، تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں، توراۃ میں گو تصریحاً حضرت اسحٰقؑ کا ذبیح ہونا

(۱) سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۱۸۔ (۲) باب ۴ آیت ۲۴۔

لکھا ہے لیکن مطاوی کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے، اور نہ ہو سکتے تھے، امور ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہئیے۔

۱۔ شریعت سابقہ کے رو سے قربانی صرف اس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی جو پہلوٹا بچہ ہو، اسی بنا پر ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی وہ پہلوٹے بچے تھے۔

خدا نے حضرت موسیٰ سے جہاں لاویوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے وہاں فرمایا ہے:

لِاَنَّ لِیَّ کُلَّ بِکْرٍ فِیْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ مِنَ النَّاسِ وَ الْبَهَائِمِ،	کیونکہ بنو اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لئے ہے۔ (عدد ۸۔ ۱۷)

۲۔ پہلوٹے بچہ کی افضلیت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی۔ توراۃ میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوبہ ہو اور دوسری غیر مرغوبہ، تو فضیلت اسی اولاد کو ہوگی جو پہلوٹی ہو، گو وہ غیر مرغوبہ سے ہو۔

فَاِنَّهٗ اَوَّلُ قُدْرَتِهٖ وَلَهٗ حَقُّ الْبُکُوْرِیَةِ (سفر تثنیہ، اصحاح ۲۱، آیت ۱۵ و ۱۷)	کیونکہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے، اور اسی کو اولاد اولین ہونے کا حق ہے۔

۳۔ جو اولاد خدا کو نذر کر دی جاتی تھی اس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا، توراۃ میں ہے:

فی ذٰلک الوقت افرز الرب سبط لاوی لیحملوا تابوت عهد الرب ولکی یقفوا امام الرب لیخدموه ویبارکو اباسمه اِلٰی هذا الیوم لاجل ذالک لم یکن للاوی قسم ولانصیب مع اخوته الرّب هو نصیبه، (توراۃ، اصحاح ۱۰، آیت ۸ و ۹)	تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لئے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور تاکہ خدا کے آگے کھڑا ہو تاکہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں، یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا، کیونکہ ان کا حصہ خدا ہے۔

۴۔ جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا تھا، وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا، اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا، جس طرح آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں، توراۃ میں ہے:

فهاانک تحبلین و تلدین ابنا ولا یعل موسی راسه لان الصبی یکون نذیرا للّٰه (توراۃ، قضاۃ، اصحاح ۱۳۔ ۴)	اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور اس کے سر پر استرا نہ پھیرا جائے، کیونکہ یہ بچہ خدا کے لئے نذر کیا جائے گا۔

۵۔ جو شخص خدا کا خادم بنایا جاتا تھا اس کے لئے "خدا کے سامنے" کا لفظ استعمال

کرتے تھے۔ (توراۃ سفر عدد ۶۔۱۶ و ۲۰ و سفر تکوین، او تشنیہ ۱۰۔۸)

۶۔ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے جو اکلوتا ہو، اور محبوب ہو (توراۃ تکوین، اصحاح ۲۲ آیت ۲)

اب اصل مسئلہ پر غور کرو، لیکن پہلے یہ بتا دینا ضرور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں قربانی کرنا، اور خدا پر نذر چڑھانا ایک بات تھی، یعنی دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے؟

اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھا دو، تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاورت کے لئے گھر سے الگ کر دیا جائے، لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے، توراۃ میں خدا کی زبان سے مذکور ہے۔

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبھائم (عدد اصحاح ۸۔۷)	کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لئے ہے۔

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ "خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم بنی اسرائیل میں سے لاویوں کو لو، اور ان کو خدا کے سامنے پیش کرو کہ خدا کے لئے خاص کر دیئے جائیں اور یہ لوگ دو گایوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں، جو قربانی کی جائیں۔ (اختصاراً)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس سے بھی یہی مراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا، اور اس لئے بعینہ اس کی تعمیل کرنی چاہی لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ تمثیلی خواب تھا، اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو خانہ خدا کی خدمت کے لئے خاص کر دیا، اور جو شرطیں قربانی کی تھیں قائم رکھیں۔

بیانِ مذکورہ بالا کے ذہن نشین کرنے کے بعد دلائل ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

۱۔ حضرت اسحاقؑ کی ولادت حضرت اسماعیلؑ کے بعد ہے، اس بنا پر حضرت اسحٰقؑ اکلوتے بیٹے نہیں، اور چونکہ قربانی کے لئے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے اس لئے حضرت اسحٰقؑ کی قربانی کا حکم نہیں ہو سکتا تھا۔

۲۔ حضرت اسحٰقؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تمام ترکہ دیا، بہ خلاف اس کے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دے کر رخصت کیا، یہ اس بات کا قطعی

قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰقؑ کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا۔

۳۔ حضرت اسماعیلؑ کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے، حج میں احرام کے زمانہ تک جو بال نہیں منڈاتے، یہ اسی سنتِ اسماعیلی کی یادگار ہے۔

۴۔ جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لئے ملت ابراہیمی میں استعمال کئے جاتے تھے، وہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے لئے استعمال کئے نہ کہ حضرت اسحٰقؑ کے لئے، توراۃ میں ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا:

لیت اسمعیل یعیش امامک   کاش اسماعیلؑ تیرے سامنے زندہ رہتا۔

توراۃ میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) انہی معنوں میں ہوا ہے۔

۵۔ حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی محبوب ترین اولاد تھے، توراۃ جو تمام تر حضرت اسحاقؑ کی یک طرفہ داستان ہے، اس میں حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے جو امتیازی خصائص بیان کئے ہیں، یہ ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں (۱)، اور حضرت اسماعیلؑ دعوتِ ابراہیم ہیں، یعنی حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور خواہش سے پیدا (۲) ہوئے، اسی بنا پر خدا نے ان کا نام اسماعیل رکھا، کیونکہ اسماعیل دو لفظوں سے مرکب ہے سمع اور ایل۔ "سمع" کے معنی "سننے" کے اور "ایل" کے معنی خدا کے ہیں (۳)، یعنی خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا "سن لی" توراۃ میں ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ "اسماعیل کے بارے میں میں نے تیری سن لی"۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے اس موقع پر بھی حضرت اسماعیلؑ کو یاد کیا، غرض چونکہ حضرت ابراہیمؑ کو قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو، اس لئے حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ۔

۶۔ حضرت اسحاقؑ کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ ہی یہ بھی بشارت دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی عہد باندھوں گا، توراۃ میں ہے:۔

---

(۱) توراۃ تکوین ۱۷-۱۸ (۲) تکوین اصحاح ۱۵ (۳) تکوین اصحاح ۱۷ و ۱۸۔

"پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی اور اس کا نام اسحاقؑ رکھے گا اور میں ابدی عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا"۔ (توراۃ تکوین اصحاح ۱۷۔ آیت ۱۸)

اس جمال کی تفصیل یہ ہے کہ توراۃ میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا اور فرشتہ نے ندا دی کہ ہاتھ روک لو، تو فرشتہ نے یہ الفاظ کہے:۔

"خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا، میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحلِ بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا"۔ (توراۃ۔ تکوین، اصحاح ۲۲۔ آیت ۱۵)

اب غور کرو کہ خدا نے جب حضرت اسحاقؑ کی بشارت ہی کے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ جس وقت تک حضرت اسحاقؑ (۱) کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی ان کی قربانی کا حکم ہوتا، لیکن حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں، حضرت اسماعیلؑ اکبر اولاد تھے، محبوب تر تھے، قربانی کے وقت بالغ یا قریب البلوغ تھے، قربانی سے پہلے ان کی کثرت نسل کی بشارت نہیں دی گئی، توراۃ میں تصریح ہے کہ چونکہ ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا، اس لئے اس بیٹے کی کثرتِ نسل کا وعدہ کیا گیا، یعنی یہ کثرتِ نسل اسی قربانی کے صلہ میں تھی، اس لئے ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں، کیونکہ حضرت اسحاقؑ کی تکثیرِ نسل کا وعدہ تو ان کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا، جو کسی انعام وصلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔

مقام قربانی:۔ توراۃ میں قربانی گاہ کا جو موقع بتایا ہے وہ "مریا ہے" یہودی کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کا ہیکل تھا، عیسائی کہتے ہیں، یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی۔

لیکن یورپ کے محققوں نے ان دونوں دعووں کی تغلیط کی ہے، سر اسٹانلی لکھتے ہیں:۔

"حضرت ابراہیمؑ صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے جہاں ان کو خدا نے حکم دیا تھا، لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے، جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے، نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے، یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے، اور اس سے بھی بعید مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جبلِ عرفات (۲)

(۱) یہ مسلم ہے کہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد، حضرت ابراہیم کی وفات کے بعد پیدا ہوئی۔ (تکوین، اصحاح ۲۵۔ آیت ۱۱)

(۲) یہ غلط ہے، مسلمان عرفات کو نہیں، بلکہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہیں۔

ہے، غالباً یہ مقام جریزیم کے پہاڑ پر ہے، اور وہی قربانی گاہ سے مشابہ مقام ہے"۔

اس سے تو اتنا ثابت ہوا کہ موریا کے تعین میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعویٰ غلط ہیں، باقی یہ امر کہ مسلمانوں کا دعویٰ بھی غلط ہے اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

موریا کی تعیین میں جو اختلاف پیدا ہوا، اس نے ایک اور اختلاف پیدا کر دیا، یعنی یہ کہ یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے یا وصفی معنیٰ رکھتا ہے، بہت سے مترجموں نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا، اور اس لئے اس کا ترجمہ توراۃ کے بعض نسخوں میں بلوطات عالیہ اور بعض میں "زمین بلند" اور بعض میں مقام الرویا کیا، لیکن زیادہ صائب الرائے لوگوں نے اس کو مقام کا نام سمجھا اور اس لئے لفظ کا ترجمہ نہیں کیا، بلکہ بحال خود رہنے دیا، لیکن امتداد زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہیئت بدل گئی یعنی مریا کا مورہ ہو گیا، خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان میں دونوں لفظوں کا املا قریب قریب ہے۔

مورہ کی نسبت توراۃ میں تصریح ہے کہ عرب میں واقع ہے، توراۃ میں ہے:۔

و کان جیش المدیانیین شمالیھم عندتلّ مورة فی الوادی	اور مدیانیوں (۱) کی فوج شمال کی جانب مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی۔
(قضاۃ۔ اصحاح ۷۔ آیت۔ ۲)	(مدیان عرب میں واقع ہے)

تمام واقعات اور قرائن کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ لفظ مورہ نہیں، بلکہ مروہ ہے، جو مکہ معظمہ کی پہاڑی ہے، اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

عرب کی روایات، قرآن مجید کی تصریح، احادیث کی تعیین، تمام چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحتِ واقعہ کے ممکن نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے:۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربانی گاہ ہیں" (۲)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی، بلکہ منیٰ میں ہوتی تھی، جو مکہ سے تین میل پر ہے، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ ہی کو

---

(۱) مدین عرب کی زمین ہے اور عرب کو اکثر مدیانیون کہتے ہیں، اور مدین کی زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک ہے اور یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں جو قطورا سے تھے (ضمیمہ بائبل ص ۱۱۴) (۲) موطا امام مالکؒ

قربانی گاہ فرمایا، یہ اسی بنا پر تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہیں حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی تھی۔

قرآن مجید میں ہے:

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ (حج۔۲۲: ۳۳) پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے۔

هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ (مائدہ۔۵: ۹۵) قربانی جو کہ کعبہ میں پہنچے۔

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے، ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے، منیٰ نہیں، لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

قربانی کی یادگار

یہودی حضرت اسحٰقؑ کی اولاد ہیں، اس لئے اگر اسحٰقؑ ذبیح ہوتے تو اس کی کوئی یادگار ان کے یہاں موجود ہوتی۔ بخلاف اس کے حضرت اسماعیل کے خاندان، بلکہ تمام مسلمانوں میں جو حضرت اسماعیلؑ کی روحانی اولاد ہیں، قربانی کی تمام رسمیں آج تک موجود ہیں۔

اولاد اسماعیلؑ میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں، اور حج جو ایک بڑا فریضہ اسلام ہے، تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے، چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا تو پکارا، اے ابراہیم! حضرت ابراہیمؑ نے کہا "میں حاضر ہوں" (۱)۔

حج کے وقت مسلمان جو ہر قدم پر لبیک کہتے چلتے ہیں، یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں، جن کا لفظی ترجمہ وہی ہے "میں حاضر ہوں" (۲)۔

۲۔ شریعت ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے، یا خدا کے لئے نذر دیتے تھے، وہ بار بار معبد یا قربانی گاہ کے پھیرے کرتا تھا۔

حج میں صفا و مروہ کے درمیان جو سات بار سعی کرتے ہیں، یہ اسی کی یادگار ہے۔

۳۔ نذر کے فرائض میں ایک یہ تھا کہ ایامِ نذر تک بال نہیں کترواتے تھے، حج میں بھی یہی دستور ہے، جب احرام اتارتے ہیں، تب بال کترواتے یا منڈاتے ہیں خود قرآن مجید میں اس شعار کا ذکر ہے:

مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ (فتح ۲۸: ۲۷) سروں کو منڈائے ہوئے۔

---

(۱) توراۃ۔ تکوین اصحاح ۲۲۔ آیت ۱ (۲) توراۃ لاویین اصحاح ۸۔ آیت ۲۷۔

۴۔ حج کا ایک ضروری رکن قربانی ہے، یہ وہی حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں فرمایا ہے:

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (صافات۔ ۳۷: ۱۰۷)	اور حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے بدلے ہم نے ایک بڑی قربانی کی۔

یہ دلائل توراۃ کی تصریحات و کنایات کی بنا پر تھے، قرآن مجید کے رو سے قطعاً حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت ہے، اگرچہ بہت سے مفسرین نے غلطی سے یہودیوں ہی کی روایت کی تائید کی ہے، قرآن مجید میں قربانی کا واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ، قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی الخ۔ (صافات۔ ۳۷: ۹۹ تا ۱۰۲)	اور حضرت ابراہیم نے کہا میں اپنے خدا کی طرف جاؤں گا، وہ مجھ کو راستہ دکھائے گا، خدایا مجھ کو وہ اولاد دے کہ جو نیک چلن ہو تو ہم نے اس کو ایک سمجھدار لڑکے کی خوش خبری دی، پھر جب وہ لڑکا اس کے ساتھ چلنے لگا تو ابراہیم نے کہا بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تیری کیا رائے ہے۔ الخ

آیت بالا میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اولاد کے لئے دعا مانگی اور خدا نے قبول کی اور وہی لڑکا قربانی کے لئے پیش کیا گیا۔

توراۃ سے ثابت ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے پیدا ہوا، وہ حضرت اسماعیلؑ ہیں، اور اسی لئے ان کا نام اسماعیلؑ رکھا گیا کہ خدا نے ان کے بارہ میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواست سنی، اس بنا پر اس آیت میں جس کا ذکر ہے وہ حضرت اسماعیلؑ ہیں، اسحاقؑ نہیں۔

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کا ذکر ہے، اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اوپر ہوا وہ حضرت اسحٰقؑ نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ ہیں۔

مسلمانوں کا نام جو مسلم رکھا گیا، یہ وہ نام ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے ایجاد کیا تھا، قرآن مجید میں ہے:

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ	تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اسی نے

الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ (حج۔ ۲۲: ۷۸) پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا (۱)۔

اس تسمیہ کی تاریخ قربانی سے شروع ہوتی ہے، یعنی حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو قربانی کرنا چاہا اور ان سے کہا کہ "مجھ کو خدا کا یہ حکم ہوا ہے، تمہاری کیا رائے ہے"؟ تو حضرت اسماعیلؑ نے نہایت استقلال کے ساتھ گردن جھکادی کہ یہ سر حاضر ہے، اس موقع پر خدا نے "اَسْلَمَا" کا لفظ استعمال کیا جو اسلام سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی "تسلیم" اور "حوالہ کردینے" کے ہیں۔

فَلَمَّا اَسْلَمَا (صافات۔ ۳۷: ۱۰۳) پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو (ہمارے) حوالہ کردیا،

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم و رضا ہے، یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکادیں، یہ وصف مقبولِ بارگاہ ہوا اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا یہی شعارِ مذہبی قرار پایا، اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروانِ ملت کا نام مسلم رکھا۔

قربانی، ایثار اور اسلام در حقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا، اگر حضرت اسحٰقؑ قربان ہوتے تو یہ لقب ان کی اولاد یا ان کی امت کو ملتا۔

قربانی کی حقیقت

اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے، جب اس پر غور کیا جاتے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس سے اصلی مقصود کیا تھا؟ قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیا کرتی تھیں، یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی، مخالفینِ اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا، لیکن یہ سخت غلطی ہے،

اکابر (۲) نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں، دو قسم کے ہوتے ہیں، عینی اور تمثیلی، عینی میں بعینہ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی

[(۱) ابھی ص ۸۶ کے حاشیہ میں گذر چکا ہے کہ بعض مفسرین نے قربِ لفظ کی وجہ سے سمّٰی کا فاعل حضرت ابراہیمؑ کو قرار دیا ہے، تابعین میں حضرت ابن زید اور حضرت حسن بصری کا یہی مسلک ہے اور ابو حیان نے اسی تائید کی ہے۔ لیکن صحابہ میں حضرت ابن عباسؓ اور تابعین میں مجاہد ضحاک، قتادہ اور سفیان نے اللہ کی طرف ضمیر پھیری ہے، اور یہ معنی لیتے ہیں کہ تمہارا نام مسلم قرآن کے نزول سے پہلے بھی اللہ تعالے نے رکھا اور اس قرآن میں اس نے تمہارا یہ نام رکھا۔] "س"

(۲) اس مقام پر مصنف کی یہ عبارت مزید تشریح کی محتاج ہے۔ مصنف نے جیسا کہ لکھا ہے کہ رویا دو ۲ قسم کے ہوتے ہیں، ایک عینی جس میں صورتِ واقعہ بعینہ دکھائی جاتی ہے اور دوسری تمثیلی جس میں صورت واقعہ کسی (بقیہ حاشیہ ص ۹۸ پر)

ہے۔ تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو پورا ادا کرنا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو خواب دکھایا گیا تھا، اس سے یہ مراد تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں۔ یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں، بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے جائیں۔ توراۃ میں جا بجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو عینی خیال کیا، اور بعینہ اس کی تعمیل کرنی چاہی، گویہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاءؑ سے ہو سکتی ہے (گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے) اس بنا پر گو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیئے گئے لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (صافات، ۳: ۱۰۵)	تو نے خواب کو سچا کیا، ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۹۷) مثالی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اس کو بہت سے علما نے تسلیم کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ خواب کی اس دوسری قسم میں اصلی مقصود رویا کی دوسری مثالی صورت ہوتی ہے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے ماں باپ کو آفتاب و ماہتاب اور بھائیوں کو ستاروں کی شکل میں دیکھنا، یا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کی وبا کو ایک بڑھیا کی شکل میں دیکھنا، اور احد میں مسلمان شہداء کو مذبوح گایوں کے رنگ میں دیکھنا۔

محدث خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں:۔

وبعض الرويا مثل يضرب ليتاؤل على الوجه الذي يجب ان يصرف اليه معنى التعبير في مثله وبعض الرويا لا يحتاج الى ذلك بل ياتي كالمشاهدة ۔ (فتح الباری جلد ۱۲ ص ۳۰۲)	بعض خواب تمثیلی ہوتے ہیں جس کو اس مثالی صورت میں اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

امام ابو بکر ابن العربی مالکی احکام القرآن میں اسی حقیقت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس رویا کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں کہ۔ بعض رویا نام کی طرح ہوتے ہیں (یعنی عینی و تصریحی جو بالکل لفظاً لفظاً واقعہ کے عین مطابق ہوتے ہیں۔) اور بعض مثل کنیتوں کی طرح ہوتے ہیں، یعنی کسی مناسبت معنوی کے سبب سے وہ کسی دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ خواب اسی دوسری قسم کا تھا۔ (احکام القرآن جلد ۲ ص ۱۹۶ مصر)

مصنف سیرت نے اس مقام پر ان ہی بعض علماء کی تقلید کر کے حضرت ابراہیمؑ کے اس خواب کو تمثیلی کہا ہے اور اسی بنا پر ان کو یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اس خواب کو جو تمثیلی تھا اپنی خطائے اجتہادی سے عینی و حقیقی سمجھے اور اس کی بعینہ تعمیل پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن عین وقت پر ان کو وحی الٰہی نے ان کی اس اجتہادی خطا پر متنبہ کر دیا، اور حضرت اسماعیلؑ کی بعینہ قربانی سے روک کر ان کی جگہ جانور کی قربانی پیش کی۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹ پر)

بہر حال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ قربانی سے مقصود خدمت کعبہ کے لئے نذر چڑھانا تھا۔ نذر چڑھانے کے لئے شریعت سابقہ میں جو لفظ مستعمل تھا وہ "خدا کے سامنے" تھا توراۃ میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیلؑ کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی۔

لیت اسماعیل یعیش امامک	کاش اسماعیل تیرے سامنے
(توراۃ۔ تکوین اصحاح ۱۷۔ آیت ۱۸)	زندگی کرتا۔

اسی خواہش کے مطابق ان کو خواب میں تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حضرت اسحاق کی قربانی کا نہیں، بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۹۸) ہیچمدان جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو محبت الٰہی سے سرشار تھے، خطائے اجتہادی سے نہیں بلکہ غلبۂ شوقِ اطاعت و محبت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بالکل بعینہٖ و بلفظہٖ کرنے پر آمادہ ہوگئے، تاکہ اس ابتلاء میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ اس کی خدمت توحید و تولیت کعبہ کے لئے وقف کر دینے کی تاویل کا سہارا لے کر نفس کی متابعت کے شبہ اور دھوکے سے پاک رہیں، تاآنکہ اللہ تعالیٰ خود اس حقیقت کو اپنے لفظوں میں واضح فرمادے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، آواز آئی۔

يَآ اِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَآ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (صافات۔ ۳۷: ۱۰۵)	ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔
وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (صافات۔ ۳۷: ۱۰۷)	اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کی عوض میں دیا۔

اور امت پر یہ قربانی اسی تمثیلی رنگ میں واجب ٹھہرائی گئی، یعنی جسمانی اطاعت و قربانی کی تمثیل، جانور کی قربانی کی شکل میں۔

یہ تشریح ان بعض علماء کی متابعت میں ہے جو بعض دینی و علمی اسباب کی بنا پر اس کو رویائے تمثیلی سمجھتے ہیں، ورنہ جمہور علماء اس رویا کو عینی سمجھتے ہیں، لیکن عین اس وقت جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر عمل کر کے اپنی طرف سے فرزند کے ذبح کی پوری عزیمت کر کے اپنے کام کو پورا کر چکے تھے، اور تعمیل حکم میں ایک لحہ کی بھی دیر نہیں رہی تھی کہ وحی الٰہی نے آواز دی "اے ابراہیم! تم نے اپنا کام پورا کر دیا اور اپنے خواب کو سچ کر دکھایا" اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اب اس کی جگہ ملت ابراہیم کی یہ سنت عظیم جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ ہر دو صورت یہ جانور کی قربانی جیسا کہ بعض ائمۂ محققین نے لکھا ہے نفس کی قربانی کی تمثیل ہے اور اس قربانی کا گوشت اس روز عید میں قربانی کنندہ کے لئے برکت، احباب کے لئے تحفہ اور فقراء کے لئے سامان دعوت بنا۔

مزید تفصیل کے لئے معارف ذیحجہ ۱۳۵۵ھ مضمون "ذبح عظیم" اور معارف صفر ۱۳۵۶ھ کے شذرات ملاحظہ ہوں۔ "س"

مکہ معظّمہ

حضرت اسماعیلؑ کی بحث مسکن میں گذر چکا کہ وہ عرب تھا، مقامِ ذبح کی تعیین میں یہ ثابت ہو چکا کہ وادیِ مکہ تھا، اس بنا پر مکہ کی نسبت ایک بحث نہایت قدیم زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

متعصب عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ مسلمانوں کا خاص دعویٰ ہے۔ قدیم تاریخوں میں اس کا نشان نہیں (۱) ملتا، اس بنا پر ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بکہ ہے، قرآن مجید میں یہی نام ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ — پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لئے

بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا (آل عمران۔ ۳: ۹۶) — بنایا گیا وہ "بکہ" میں تھا۔

کتاب زبور۔ ۸۴۔ ۶ میں ہے۔

"بکہ کی وادی میں گذرتے ہوئے، اسے ایک کنواں بتاتے، برکتوں سے مورۃ کو ڈھانک لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں"۔

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے، یہ وہی مکہ معظمہ ہے۔ لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی، "رونے" کے ہوں گے، اور یہ وہی عربی لفظ بکاء ہے، چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے، اس لئے بہت سے مترجمین نے عبارت مذکور میں بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے۔ لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادیِ بکا کے کیا معنی ہوں گے؟ زبور کی عبارت مذکور کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نشید میں حضرت داؤدؑ نے مکہ معظمہ اور مروہ اور قربان گاہ اسماعیلی کی نسبت

---

(۱) مرگیولوس اپنی کتاب میں لکھتا ہے "اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البنا قرار دیا ہے، لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی" مرگیولوس نے اس کے ثبوت میں اصابہ کا حوالہ بھی دیا ہے اور ہم کو اس کی صحت سے انکار نہیں، لیکن اس کل بیان میں مغالطہ ہے جس کو ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیا ہے۔

اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے، اوپر کی عبارت یہ ہے (حضرت داؤدؑ خدا سے کہتے ہیں) اے فوجوں کے خدا! تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے.. ...... اے خدا! تیرے قربان گاہ میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارک ہو، ان لوگوں کی جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں"۔ اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں، اب غور کرو حضرت داؤدؑ جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، وہ اس مقام پر صادق آسکتا ہے جس میں حسبِ ذیل باتیں پائی جائیں۔

۱۔ قربانی گاہ ہو۔

۲۔ حضرت داؤدؑ کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کر کے جائیں۔

۳۔ وہ وادیِ بکہ کہلاتا ہو۔

۴۔ وہاں مقام مورہ بھی ہو، ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ بکہ وہی مکہ، معظمہ اور مورہ وہی مروہ ہے، اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہو گا کہ یہودی کس طرح تعصب سے الفاظ کو ادل بدل کر دیتے ہیں، يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهِ، ڈاکٹر ہسٹنگس نے "ڈکشنری آف دی بائبل" میں "وادیِ بکا" پر جو آرٹیکل لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"اس لفظ سے اگر کوئی واقعی وادی مراد ہے تو وہ حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

۱۔ ایک وادی ہے جس میں ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں۔

۲۔ وادی اخور ہے، جو یشوعا باب، ، آیت ۲۴۔ ۲۶ وغیرہ میں مذکور ہے۔

۳۔ وادی رفائیون ہے، جو سامویل دوم باب ۵ آیت ۱۸۔ ۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے۔

۴۔ کوہ سینا کی ایک وادی ہے۔

۵۔ بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے، اس راستہ کی آخری منزل ہے" (دیکھو رینان کی کتاب "حیات عیسیٰ" باب ۴)

لیکن کیا عجیب بات ہے کہ، ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالاتِ کثیرہ میں کہیں مکہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا، مصرع

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدّعا ایں جاست

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ جن جن وادیوں کا نام لیا ہے، ان میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں، یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں، بخلاف اس کے بکا، اور بکہ،

بالکل ایک لفظ ہیں، فرق اسی قدر ہے جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

جدید (۱) "انسائیکلوپیڈیا" میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ مرگیولوس کا ہے، اس میں مکہ معظمہ کی نسبت لکھا ہے کہ

"قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا، بجز اس کے کہ زبور (۸۴-۶) میں وادی بکہ" کا لفظ ہے"۔

لیکن مرگیولوس صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں۔

پروفیسر دوزی جو فرانس کا مشہور محقق اور عبرانی داں عالم ہے، وہ لکھتا ہے:۔(۲)

"بکہ وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ داں ماکر دبہ لکھتے ہیں"۔

لیکن مارگیولوس کو پروفیسر دوزی کے بیان پر بھی اعتماد نہیں۔

کارلائل صاحب نے اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لکھا ہے کہ

"رومن مورخ سیسلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے، اور یہ ولادت مسیحؑ سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے"۔

اگر کعبہ حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے موجود تھا تو مکہ بھی قریباً اسی زمانہ کا شہر ہوگا کیوں کہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے اس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کا عرض اور طول بلد بطلیموس (۳) کے جغرافیہ میں حسب ذیل ہے۔

"طول ۷۸ درجہ عرض ۲۳ درجہ"

بطلیموس نہایت قدیم زمانہ کا مصنف ہے، اگر اس نے اپنے جغرافیہ میں مکہ کا ذکر کیا ہے تو اس سے زیادہ قدامت کی کیا سند درکار ہے۔

مارگیولوس نے جس بنا پر مکہ معظمہ کی قدامت سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اصابہ میں تصریح ہے کہ "مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید بن یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی"۔ لیکن مارگیولوس کو یہ معلوم نہیں کہ مورخین نے جا بجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا طبع اخیر جلد ۱۰، صفحہ ۳۹۹، ارزاں اڈیشن۔ (۲) ایضاً۔ (۳) بطلیموس کے جغرافیہ کا ترجمہ عباسیوں کے زمانہ میں ہو گیا تھا، مسعودی اور ابن الندیم نے اکثر اس کے حوالے دیئے ہیں۔

کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارات بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے اس لئے عمارتیں نہیں بنوائیں، بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے، اور اس طرح مکہ ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔

خانۂ کعبہ کی تعمیر

دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا، قبولِ حق ایک طرف، اس وسیع خطۂ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا، حضرت ابراہیمؑ نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا، مصر آئے، ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا، فلسطین پہنچے، کسی نے بات تک نہ پوچھی، خدا کا جہاں نام لیتے تھے، شرک اور بت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب دب کر رہ جاتی تھی، معمورہ عالم کے صفحے نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے، اب ایک سادہ، بے رنگ، ہر قسم کے نقش و نگار سے معرّا ورق درکار تھا، جس پر طغرائے حق لکھا جائے، یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا، جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو عرب میں لائے اور ان کو یہیں آباد کیا، حضرت سارہؑ نے (جیسا کہ توراۃ میں ہے) کچھ عرصہ کے بعد انتقال کیا، حضرت ابراہیمؑ مکہ میں چلے آئے، حضرت اسماعیلؑ جوان ہو چکے تھے، اعلانِ حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا دونوں نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی (۱)۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ (بقرہ۔ ۲: ۱۲۷)

اور جب کہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانۂ خدا کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔

گھر بن چکا تو وحیِ الٰہی نے آواز دی۔

وَطَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (سورہ حج۔ ۲۲: ۲۶، ۲۷)

ہمارا گھر طواف کرنے والوں (نماز میں) قیام کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کر اور تمام لوگوں کو پکار دے کہ حج کو آئیں، پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی، ہر دور دراز گوشہ سے آئیں گے۔

[(۱) محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی منہدم و بے نشان عمارت کی دوبارہ بنیاد اٹھا کر بلند کی، مزید توضیح کے لئے سیرۃ النبی جلد پنجم باب حج عنوان مکہ اور کعبہ میں دیکھیے] "س"

اس وقت اعلان و اشتہار کے وسائل نہیں تھے، ویران جگہ تھی اور آدمی کا کوسوں تک پتہ نہ تھا، ابراہیمؑ کی آواز حدود حرم سے باہر نہیں جا سکتی تھی، لیکن وہی معمولی آواز کہاں کہاں پہنچی، مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک اور زمین سے آسمان تک۔

علامہ ازرقی نے تاریخِ مکہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو تعمیر کی اس کا عرض و طول حسب ذیل تھا۔

بلندی	زمین سے چھت تک ۹ گز
طول	حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز
عرض	رکن شامی سے غربی تک ۲۲ گز

عمارت بن چکی تو ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تاکہ ایسے مقام پر لگادوں جہاں سے طواف شروع کیا جائے، تاریخ مکہ موسوم بہ اعلام با علام بیت الحرام میں ہے۔

فقال ابراهيم لا سماعيل عليهما الصلوة والسلام يا اسماعيل ايتني بحجر اضعه حتى يكون علما للناس يبتدون منه الطواف	پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لادو تاکہ میں ایسی جگہ نصب کردوں جہاں سے لوگ طواف شروع کریں۔

خدا کا یہ گھر ایسا سادہ تعمیر ہوا تھا کہ نہ چھت تھی، نہ کواڑ اور نہ چوکھٹ بازو تھے۔ جب قصی بن کلاب کو کعبہ کی تولیت حاصل ہوئی تو انہوں نے قدیم عمارت گرا کر نئے سرے سے تعمیر کی اور کھجور کے تختوں کی چھت پاٹی (۱)۔

کعبہ کی برکت اور کشش سے لوگ آس پاس آباد ہونے لگے، چنانچہ سب سے پہلے قبیلۂ جرہم آکر آباد ہوا، اس قبیلہ میں مضاض بن عمرو جرہمی ایک ممتاز شخص تھے، حضرت اسماعیلؑ نے ان کی لڑکی سے شادی کی، ان سے بارہ اولاد ہوئی، جن کے نام توراۃ میں مذکور ہیں، ان میں سے اکثر اہل عرب قیدار کی اولاد ہیں، حضرت اسماعیلؑ کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت کعبہ کے متولی ہوئے، ان کے مرنے کے بعد ان کے نانا مضاض نے یہ منصب حاصل کیا، اور کعبہ کی تولیت خاندانِ اسماعیلؑ سے نکل کر جرہم کے خاندان میں آگئی، لیکن پھر ایک اور قبیلہ خزاعہ نے کعبہ پر قبضہ کر لیا، اور مدت تک اسی خاندان میں یہ منصب رہا،

(۱) اعلام بہ حوالہ کتاب النسب از ابن بکار و ابن الماوردی۔

حضرت اسماعیلؑ کا خاندان موجود تھا، لیکن اس نے کچھ مزاحمت نہیں کی، قصی بن کلاب کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنا آبائی حق حاصل کیا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

حرم کعبہ پر سب سے جس نے پردہ چڑھایا وہ یمن کا حمیری بادشاہ اسعد تبع تھا، یمن میں خاص قسم کی چادریں بنی جاتی ہیں، جن کو بردیمانی کہتے ہیں، یہ پردہ انہی چادروں سے تیار کیا گیا تھا، قصی بن کلاب کے زمانہ سے تمام قبائل پر ایک محصول لگا دیا گیا، جس سے پردہ تیار کیا جاتا تھا، علامہ ازرقی نے لکھا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی یمنی پردہ چڑھایا تھا، لیکن اس روایت کے سلسلہ کا ایک راوی واقدی ہے (۱)۔

خدا کا گھر سیم و زر کی نقش آرائیوں کا محتاج نہ تھا، لیکن دولت اور ملک کی ترقی کے یہ لوازم ہیں۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے پتر چڑھائے، عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں ۳۶ ہزار اشرفیاں اس کام کے لئے بھیجیں، امین الرشید نے ۱۸ ہزار اشرفیاں نذر کیں کہ دروازہ کی چوکھٹ وغیرہ طلائی بنوادی جائے، اعلام (تاریخ مکہ) میں عہد بہ عہد کی طلا کاریوں کی تفصیل لکھی ہے، لیکن یہ واقعات عہد نبوت کے بعد کے ہیں، جو ہماری کتاب کا موضوع نہیں اور سچ یہ ہے کہ آفتاب پر سونا چڑھانا ضرور بھی نہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی

خدا کا گھر بن چکا تو ضرورت تھی کہ اس کی تولیت اور خدمت کے لئے کوئی نفس قدسی تمام مشاغل سے الگ ہو کر اپنی زندگی اس پر نذر چڑھا دے اس قسم کی نذر کو ابراہیمی شریعت میں قربانی سے تعبیر کرتے تھے، توراۃ میں یہ محاورہ بہ کثرت آتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، انبیاء علیہم السلام پر جو وحی آتی ہے اس کے مختلف انواع ہیں، جن میں سے ایک خواب بھی ہے، چنانچہ صحیح بخاری، باب بدء الوحی میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کی جو ابتدا ہوئی خواب سے ہوئی، یہ خواب کبھی تمثیلی

(۱) حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں قباطی کا پردہ چڑھایا تھا، جو مصر میں بُنا جاتا ہے ان کے بعد معمول ہو گیا کہ ہر خلیفہ اپنے عہدِ خلافت میں پردہ چڑھاتا تھا، بنو امیہ نے دیبا کا پردہ چڑھایا، مامون الرشید ہر سال تین پردہ چڑھاتا تھا حج کے زمانہ میں دیبائے احمر کا، رجب میں قباطی کا، عید الفطر میں دیبائے سفید کا، مصر میں جب سلطان صالح ابن سلطان قلاوون بادشاہ ہوا تو مصر کے دو گاؤں پردہ کے مصارف کے لئے وقف کر دیئے، جب ترکی خاندان قسطنطنیہ میں حکمراں ہوا تو سلطان سلیمان نے چند گاؤں اور اضافہ کر دیئے (اعلام باعلام بیت الحرام) خانہ کعبہ پر پردہ چڑھانے کی تاریخ بہ تفصیل فتوح البلدان بلاذری اور تاریخ مکہ ازرقی اور معجم البلدان وغیرہ میں ہے، ہم نے اخیر تصنیف یعنی اعلام کو لیا ہے کہ وہ ان سب کے بعد کی تصنیف اور جامع ہے۔

ہوتا ہے، جس طرح حضرت یوسفؑ نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا، بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب دکھلایا گیا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں، انہوں نے اس خواب کو عینی سمجھا اور بعینہٖ اس کی تعمیل پر آمادہ ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے استقلال اور جاں نثاری پر اعتماد تھا، لیکن یہ تحقیق طلب تھا کہ پانزدہ سالہ نوجوان بھی اپنی گردن پر چھری چلتے دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا:

یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَا ذَا تَرٰی (صافات۔ ۳۷: ۱۰۲)	بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتا، تیری کیا رائے ہے۔

بیٹے نے نہایت استقلال سے جواب دیا۔

یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ (صافات۔ ۳۷: ۱۰۲)	ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گذریے خدا نے چاہا تو میں ثابت قدم رہوں گا۔

ایک طرف نود سالہ (۹۰) پیرِ ضعیف ہے جس کو دعاہائے سحر کے بعد خاندانِ نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں، اور ہاتھ میں چھری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے، جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے، اور باپ ہی کا مہر پرور ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے۔ ملائکہ، قدسی، فضائے آسمانی، عالمِ کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعۃً عالمِ قدس سے آواز آتی ہے۔

یٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ (صافات۔ ۳۷: ۱۰۵)	ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیک بندوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔

طغیانِ ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل
درزیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا، اس کا صلہ یہی تھا کہ یہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اس کی یادگار رہ جائے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سلسلۂ نسب

سلسلہ نسب یہ ہے: محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیؒ بن کلاب بن مرّہ بن کعب بن لوئے بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

صحیح بخاری (باب مبعث النبیؐ) میں یہیں تک ہے، لیکن امام بخاری نے اپنی تاریخ میں عدنان سے حضرت ابراہیمؑ تک نام گنائے ہیں۔ یعنی عدنان بن ادد بن المقوم بن تارح بن یعرب بن یشجب بن نابت بن اسمٰعیلؑ بن ابراہیمؑ۔

سلسلۂ نسب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ ۱۲ بیٹے تھے، جن کا ذکر تورات میں بھی ہے، ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی، انہی کی اولاد میں عدنان ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے خاندان سے ہیں۔ عرب کے نسب دان تمام پشتوں کو محفوظ نہیں رکھتے تھے، چنانچہ اکثر نسب ناموں میں عدنان سے حضرت اسمٰعیلؑ تک صرف آٹھ پشتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں، عدنان سے لیکر حضرت اسمٰعیلؑ تک اگر صرف آٹھ نو پشتیں ہوں تو یہ زمانہ تین سو برس سے زیادہ نہ ہوگا، اور یہ امر بالکل تاریخی شہادتوں کے خلاف ہے، علامہ سہیلی روض الانف (ص ۸) میں لکھتے ہیں:۔

ویستحیل فی العادۃ ان یکون بینھما اربعۃ اٰباء او سبعۃ کما ذکر ابن اسحاق او عشرۃ او عشرون فان المدۃ اطول من ذلک کلہ۔

اور یہ عادتاً محال ہے کہ دونوں میں ۴ یا، پشتوں کا فاصلہ ہو، جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا یا ۱۰، ۲۰ پشتیں ہوں، کیونکہ زمانہ اس سے بہت زیادہ ہے۔

علامہ موصوف نے بہت سے تاریخی حوالوں اور شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ عدنان سے حضرت اسمٰعیلؑ تک ۴۰ پشتوں کا فاصلہ ہے، اس غلطی نے بعض عیسائی مورخین کو اس بات کا موقع دیا ہے کہ سرے سے اس بات کے منکر ہوگئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاندانِ ابراہیم سے ہیں (۱)۔

(۱) حاشیہ صفحہ ۱۰۸ پر ملاحظہ ہو

اس غلطی کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ اہل عرب زیادہ تر مشہور آدمیوں کے نام پر اکتفا کرتے تھے، اور بیچ کی پیڑھیوں کو چھوڑ دیتے تھے، اس کے علاوہ اہل عرب کے نزدیک چونکہ عدنان کا حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان سے ہونا قطعی اور یقینی تھا اس لئے وہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ عدنان تک سلسلۂ نسب صحیح طور سے نام بنام پہنچ جائے، اوپر کے اشخاص کا نام لینا غیر ضروری سمجھتے تھے، اس لئے چند مشہور آدمیوں کا نام لے کر چھوڑ دیتے تھے، تاہم عرب میں ایسے محققین بھی تھے، جو اس فروگذاشت سے واقف تھے، علامہ طبری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ "مجھ سے بعض نسب دانوں نے بیان کیا، کہ میں نے عرب میں ایسے علما دیکھے جو معد سے لیکر حضرت اسمٰعیلؑ تک ۴۰ پشتوں کے نام لیتے تھے، اور اس شہادت میں عرب کے اشعار پیش کرتے تھے، اس شخص کا یہ بھی بیان تھا کہ میں نے اس سلسلہ کو اہل کتاب کی تحقیقات سے ملایا تو پشتوں کی تعداد برابر تھی، البتہ ناموں میں فرق تھا" (۱) اسی مورخ نے ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ "شہر تدمر میں ایک یہودی تھا، جس کا نام ابو یعقوب تھا، وہ مسلمان ہو گیا تھا، اس کا بیان تھا کہ "ارمیا پیغمبر کے منشی نے عدنان کا جو نسب نامہ لکھا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے (۲)، اس شجرے میں بھی عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیلؑ تک چالیس (۴۰) نام ہیں"۔ بہر حال یہ واقعہ یقینی ہے کہ عدنان حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عدنان کے خاندان سے ہیں۔

بنائے خاندان قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اگرچہ ابًا عن جدٍ (۳) معزز

(حاشیہ صفحہ ۱۰۰) سر ولیم صاحب نے صریحًا یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان سے نہ تھے، ان کے الفاظ یہ ہیں:- "یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسمٰعیلؑ کی اولاد سے خیال کیا جائے، اور غالبًا یہ کوشش کہ وہ اسمٰعیلؑ کی نسل میں سے ثابت کئے جائیں، ان کی حین حیات میں پیدا ہوئی تھی، اور اس طرح پر محمدؐ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے، اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بیشمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے"۔ (لیکن ایک طرف سر ولیم میور صاحب کا تنہا شبہ ہے، دوسری طرف بیسیوں یورپین اور یہودی مورخین ہیں، جو نہ صرف خاندانِ قریش کو بلکہ تمام شمالی عرب و حجاز کو ابراہیمی النسل تسلیم کرتے ہیں، (دیکھو فارسٹر صاحب کا جغرافیہ تاریخی عرب)

(۱) تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ صفحہ ۱۱۱۸ (۲) تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ صفحہ ۱۱۱۵ (۳) تاریخ عرب کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے، لیکن مارگولس نے نہایت کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو مبتذل ثابت کیا جائے، ان کے الفاظ یہ ہیں:- "یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمدؐ ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تھے، اس کے بعد صاحب موصوف نے حسب ذیل استدلال پیش کئے ہیں:- (۱) قرآن مجید میں ہے کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا (۲) پیغمبر کے عروج کے زمانہ میں قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس درخت سے تشبیہ دی جو گھورے پر جمتا ہے (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا تو آپؐ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۹ پر)

اور ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا، وہ نضر بن کنانہ تھے، بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا، اور انہی کی اولاد قریشی ہے، حافظ عراقی سیرتِ منظوم میں لکھتے ہیں:

اما(۱) قریش فالاصح فہر جماعها والاكثرون النضر

نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی حلیل خزاعی تھے، قصی نے حلیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حبیؓ تھا، شادی کی تھی، اس تعلق سے حلیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے، اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا، قصی نے ایک دار المشورۃ قائم کیا، جس کا نام دار الندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، نکاح اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے۔

قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کئے، جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ (۲) اور رفادۃ جو خدامِ حرم کا سب سے بڑا منصب تھا، انہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سیکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، چنانچہ قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایامِ حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا کہ حجاج کے کام آئے، مشعر حرام بھی انہی کی ایجاد ہے، جس پر ایام حج میں چراغ جلاتے تھے، چنانچہ عقد الفرید میں تصریح کی ہے، قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۸) نے اس لقب سے انکار کیا (۴) فتح مکہ کے دن آپ نے فرمایا کہ "آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہو گیا"۔ قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں: وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ۔ یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں (مکہ و طائف) کے کسی رئیس پر کیوں نہ اترا، عظیم اور شریف دو الگ لفظ ہیں، قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہل عرب دولت اور اقتدار والے کو عظیم کہتے تھے، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت سے نہیں بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا، دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات کو صحیح ماننا چاہیے، کفار نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ، جادو زدہ، شاعر، سب کچھ کہا، ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟ بے شبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مولیٰ اور سید کے لفظ سے انکار کیا، لیکن متعدد حدیثوں میں صاف تصریح ہے کہ آپؐ نے فرمایا مجھ کو سید اور مولیٰ نہ کہو، مولیٰ اور سید خدا ہے، قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولیٰ کہا ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی شرافت کا ابطال کیونکر ہوتا ہے؟ اخیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کم نسبی کیونکر ثابت ہوتی ہے؟ کہ شرفائے مکہ سے یہاں مراد جبارین و متکبرین مکہ ہیں، مارگولس صاحب نے یہ دلائل نولدیکی سے نقل کئے ہیں، جو مشہور جرمنی مستشرق ہے۔ ع این خانہ ہمہ آفتاب است۔

(۱) زرقانی جلد اول صفحہ ۹۰۔ (۲) سقایہ یعنی حاجیوں کو آب زمزم پلانا اور رفادہ حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔

اول انہی کو ملا (۱)۔ چنانچہ علامہ ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لئے ان کو قریش کہتے ہیں، کیونکہ تقریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اسی بنا پر ان کو مجمّع بھی کہتے تھے، چنانچہ شاعر کہتا ہے:

قصی ابو کم من یسمی مجمعا ۔ بہ جمع اللہ القبائل من فہر

قصی کی چھ اولاد تھی، عبدالدار، عبدمناف، عبدالعزیٰ، عبد بن قصی، تخمر، برہ، قصی نے مرتے وقت حرمِ محترم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبدالدار کو دیئے (۲) اگرچہ وہ سب بھائیوں میں ناقابل تھے، لیکن قصیؔ کے بعد قریش کی ریاست عبدمناف نے حاصل کی، اور انہی کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص خاندان ہے، عبدمناف کے چھ بیٹے تھے، ان میں سے ہاشم نہایت صاحب صولت اور بااثر تھے، انہوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبدالدار کو دیئے گئے واپس لے لئے جائیں، وہ لوگ اس منصب عظیم کے قابل نہیں، عبدالدار کے خاندان نے انکار کیا، اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، بالآخر اس پر صلح ہو گئی کہ عبدالدار سے سقایہ اور رفادہ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا۔

ہاشم ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو نہایت سیر چشمی سے کھانا کھلاتے تھے، چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ "قریش جب اس کے ملک میں اسباب تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹکس نہ لیا جائے"۔ حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا، چنانچہ اہل عرب جاڑوں میں یمن، اور گرمیوں میں شام اور ایشیاے کوچک تک تجارت کے لئے جایا کرتے تھے، اس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ) جو

(۱) قصی بن کلاب کا مفصل تذکرہ طبقات ابن سعد جزء اول مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۲ھ ص ۳۶ سے لے کر ۴۲ تک ہے۔ قریش کی وجہِ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا، اس لئے قریش کہلائے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے۔ جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے۔ چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے، اس لئے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی، عام خیال یہ ہے کہ قریش قصی یا کسی اور شخص کا نام ہے۔ لیکن امام سہیلی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے۔ جس طرح قبائل عرب جانوروں کے نام پر رکھتے تھے۔ مثلاً اسد، نمر وغیرہ، مورخین کا خیال ہے کہ قبائل جانوروں کی پرستش کرتے تھے، اور انہی جانوروں کے نام سے مشہور ہو جاتے تھے۔ لیکن عربی تاریخوں میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

(۲) طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۳۹۔

ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے، قیصر کا پایہ تخت تھا، تجارِ قریش انگوریہ میں جاتے تو قیصر نہایت عزت اور حرمت سے خیر مقدم کرتا تھا۔

عرب میں راستے محفوظ نہ تھے، ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ "قریش کے کاروانِ تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے، جس کے صلہ میں کاروانِ قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائے گا، اور ان سے خرید و فروخت کرے گا"۔ یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلۂ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا (۱)۔

ایک (۲) دفعہ مکہ میں قحط پڑا، ہاشم نے اس قحط میں شوربہ میں روٹیاں چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں، اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہو گیا، عربی زبان میں چورا کرنے کو ہشم کہتے ہیں، جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔

ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے، راستہ میں مدینہ میں ٹھہرے، وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا، بازار میں گئے تو ایک عورت کو دیکھا، جس کے حرکات و سکنات سے شرافت اور فراست کا اظہار ہوتا تھا، اس کے ساتھ حسین اور جمیل بھی تھی اور دریافت سے معلوم ہوا کہ خاندانِ بنی نجار سے ہے، اور سلمٰی نام ہے، ہاشم نے اس سے شادی کی درخواست کی، اور اس نے قبول کر لی، غرض نکاح ہو گیا، شادی کے بعد یہ شام کو چلے گئے اور غزہ میں جا کر انتقال کیا، سلمٰی کو حمل رہ گیا تھا، لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شیبہ رکھا گیا، اس نے قریباً ۸ برس تک مدینہ میں پرورش پائی، ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا، ان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے، وہاں پہنچکر بھتیجے کی جستجو کی، سلمٰی نے ان کے آنے کا حال سنا، تو بلوا بھیجا، تین دن مہمان رہے، چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوئے، ان کی عمر ۸ برس کی تھی، یہاں آکر ان کا نام عبد المطلب پڑ گیا۔

عبد المطلب

عبد المطلب کے لفظی معنی "مطلب کا غلام" ہیں، اس لئے اربابِ سیر نے وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، جن میں صحیح تر یہ ہے کہ چونکہ مطلب نے ان کی پرورش کی تھی، اور یہ یتیم تھے، اس لئے عرب کے محاورہ کے مطابق غلامِ مطلب مشہور (۳) ہو گئے۔

(۱) امالی ابو علی قالی (۲) طبری ص ۱۰۸۸ و ۱۰۸۹ (ج ۳) "س" (۳) دیکھو زرقانی جلد اول ص ۸۵۔

عبدالمطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چاہ زمزم جو ایک مدت سے اَٹ کر گُم ہو گیا تھا، انہوں نے اس کا پتہ لگایا اور کھدوا کر نئے سرے سے درست کرا دیا۔

عبداللہ

انہوں نے منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے، خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے، اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو کس کے نام پر نکلتا ہے، اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا، یہ ان کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں، اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربانی کیجئے، ان کو چھوڑ دیجئے، عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا، عبدالمطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیئے، یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو (۱۰۰) تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا، عبدالمطلب نے سو (۱۰۰) اونٹ قربانی کئے اور عبداللہ بچ گئے، یہ واقدی کی روایت ہے، ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ کی تدبیر روسائے قریش نے تجویز کی تھی۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹوں میں سے پانچ شخصوں نے اسلام یا کفر کی خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی، یعنی ابو لہب، ابو طالب، عبداللہ، حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، عام طور پر مشہور ہے، کہ ابو لہب کا اصلی نام اور ہے، خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے دیا، لیکن یہ غلطی ہے، ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی کہ یہ لقب خود عبدالمطلب نے دیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ ابو لہب نہایت حسین اور جمیل تھا، اور عرب میں گورے چہرے کو شعلہ آتش کہتے ہیں، فارسی میں بھی آتشیں رخسار ہے۔

عبداللہ قربانی سے بچ گئے تو عبدالمطلب کو ان کی شادی کی فکر ہوئی، قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبدمناف کی صاحبزادی جن کا نام آمنہ تھا، قریش کے تمام خاندانوں میں ممتاز تھیں (۱) وہ اس وقت اپنے چچا وہیب کے پاس رہتی تھیں، عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے، اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا، انہوں نے منظور کیا، اور عقد ہو گیا، اسی موقع پر خود عبدالمطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا، شادی کی، حضرت حمزہؓ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں، ہالہ رشتہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوئیں، اور اس بنا پر حضرت حمزہؓ،

(۱) سیرۃ ابن ہشام (بر حاشیہ زاد المعاد مصر ج ۱ ص ۸۵) "س"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔

دستور تھا کہ نوشاہ شادی کے بعد ۳ دن تک سسرال میں رہتا تھا، عبداللہ تین دن سسرال میں رہے، اور پھر گھر چلے آئے، اس وقت ان کی عمر تقریباً سترہ ۱۷ برس (۱) سے کچھ زیادہ تھی۔

عبداللہ تجارت کے لئے شام کو گئے، واپس آتے ہوئے مدینہ میں ٹھہرے اور بیمار ہوکر یہیں رہ گئے، عبدالمطلب کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر لانے کے لئے بھیجا، وہ مدینہ میں پہنچے تو عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا، چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ محبوب تھے، تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔

عبداللہ نے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی، جس کا نام ام ایمن تھا، یہ سب چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترکہ میں ملیں (۲)، ام ایمنؓ کا اصلی نام برکہ تھا۔

---

(۱) زرقانی جلد اول صفحہ ۱۲۲ سطر، (۲) طبقات ابن سعد (جزء اول قسم اول ص ۶۲) "س"

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سرو سامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ولادت

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِ کہن سالِ دہر نے کروروں برس صرف کر دیئے، سیار گانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبحِ جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تر دستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجز طرازیِ موسیٰ، جان نوازیٔ مسیح، سب اسی لئے تھے، کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ "آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر، آزر کدہ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیمِ عبد اللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین،

شمسۂ نہ مسندِ ہفت اختران — ختمِ رسل خاتمِ پیغمبران
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست — ہر دو جہان بستۂ فتراکِ اوست
امی و گویا بہ زبانِ فصیح — از الفِ آدم و میمِ مسیح
رسمِ ترنج است کہ در روزگار — پیش دہد میوہ پس آرد بہار

عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اللھم صل علیہ و علی آلہ و اصحابہ وسلم

تاریخِ ولادت تاریخِ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہئیت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے دلائلِ ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپؐ کی ولادت ۹/ ربیع الاوّل روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی (۱)۔

آپؐ کا نام "محمدؐ" رکھا گیا، اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا تھا۔

رضاعت سب سے پہلے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آپؐ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد ثویبہ نے دودھ پلایا۔ (جو ابولہب کی لونڈی تھی) (۲)۔

حلیمہ سعدیہ ثویبہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپؐ کو دودھ پلایا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے رؤساء اور شرفاء شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے، یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے (۳) اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔

شرفائے عرب نے مدت تک اس رسم کو محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بنو امیہؔ نے دمشق میں پائے تخت قائم کیا اور شاہانہ شان و شوکت میں کسریٰ و قیصر کی ہمسری کی۔ تاہم ان کے بچے صحراؤں میں بدوؤں کے گھر میں پلتے تھے، ولید بن عبدالملک خاص اسباب سے نہ جا سکا

---

(۱) محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحوں میں آیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(☆) صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیمؑ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا، اور ۱۰ھ تھا، (اور اس وقت آپؐ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا)

(☆) ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱۰ھ کا) گرہن ۷/ جنوری ۶۳۲ء کو ۸/ بج کے ۳۰ منٹ پر لگا تھا۔

(☆) اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۶۳ برس پیچھے ہٹیں تو آپؐ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے جس میں از روئے قواعد ہئیت، ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ ۱۲ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

(☆) تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاوّل کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا، اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے۔

(☆) ربیع الاوّل مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰/ اپریل ۵۷۱ء تھی۔

[(۲) بخاری باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب۔] "س" (۳) امام سہیلی نے بہ تفصیل یہ واقعات لکھے ہیں اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، کہ میں اس لئے فصیح ہوں کہ قبیلہ بنی سعد میں پلا ہوں [الروض الانف ج اوّل ص ۱۰۹ "س"] سر ولیم میور صاحب لائف آف محمدؐ میں لکھتے ہیں کہ "محمدؐ کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی، ان کے اخلاق آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے، جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا، اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی"۔

اور حرمِ شاہی میں پلا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانِ بنوامیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا (۱)۔

غرض، دستور مذکور کی بنا پر سال میں دو (۲) مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں اور شرفائے شہر اپنے شیر خوار بچوں کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ اس دستور کے موافق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت کے چند روز بعد قبیلۂ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں۔ ان میں حضرت حلیمہ سعدیہؓ بھی تھیں (۲)۔ اتفاق سے ان کو کوئی بچہ ہاتھ نہیں آیا۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی والدہ نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ان کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی، لیکن خالی ہاتھ بھی نہ جا سکتی تھیں، اس لئے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر گئیں، ان کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام شیما تھا، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت اُنس تھا، وہی آپؐ کو کھلایا کرتی تھیں، دو ۲ برس کے بعد حلیمہ آپؐ کو مکہ میں لائیں، اور آپؐ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا، لیکن چونکہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی، آپؐ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ، چنانچہ دوبارہ گھر میں لائیں، اس میں اختلاف ہے کہ آپؐ حضرت حلیمہؓ کے یہاں کَے برس تک رہے، ابن اسحاق نے وثوق کے ساتھ ۶ برس لکھا ہے۔

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے، ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے"۔ (۳) بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلہ کو کہتے ہیں۔

حضرت حلیمہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی، عہدِ نبوت میں جب وہ آپؐ کے پاس آئیں تو آپؐ میری ماں، میری ماں، کہہ کر لپٹ گئے، یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے۔

[(۱) ابن اثیر ج ۵ طبع لیڈن۔] "س" (۲) سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا، اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام نہیں خیال کیا جاتا تھا، اسی بنا پر عرب میں مثل ہے الحرۃ لاتاکل بثدییھا، اس بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا، اس لئے مجبوراً حضرت حلیمہؓ اور ان کے قبیلہ نے یہ خدمت گوارا کی تھی، لیکن تمام تاریخوں میں ہے کہ مکہ میں ہر سال باہر سے عورتیں اس کام کے لئے آیا کرتی تھیں، ہمارا خیال ہے کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا، یہ خیال اہل شہر اور امراء کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ (۳) طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۷۔

ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت حلیمہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے وفات کر گئیں ۔لیکن یہ صحیح نہیں ہے ۔ابن ابی خثیمہ نے "تاریخ" میں ۔ابن جوزی نے "حدا" میں ۔منذری نے "مختصر سنن ابی داؤد" میں ۔ابن حجر نے "اصابہ" میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے ۔حافظ مغلطائی نے ان کے اسلام پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے ۔جس کا نام "التحفۃ الجسیمہ فی اثبات اسلام حلیمہ" ہے ۔ (۱)

حارث

حضرت حلیمہؓ کے شوہر یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رضاعی باپ کا نام حارث بن عبدالعزیٰ ہے ۔وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور اسلام لائے (۲) ۔

حارث آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور کہا کہ یہ تم کیا کہتے ہو؟ آپؐ نے فرمایا ہاں وہ دن آئے گا کہ میں آپؐ کو دکھادوں گا کہ میں سچ کہتا تھا ۔حارث مسلمان ہوگئے ۔

رضاعی بھائی بہن

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چار ۴ رضاعی بھائی بہن تھے ۔جن کے نام یہ ہیں ۔عبداللہ ۔انیسہ ۔حذیفہ ۔اور حذافہ جو شیماء کے لقب سے مشہور تھیں ۔ان میں سے عبداللہ اور شیماء کا اسلام لانا ثابت ہے ۔باقیوں کا حال معلوم نہیں ۔

مدینہ کا سفر

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر جب چھ ۶ برس کی ہوئی تو آپؐ کی والدہ آپؐ کو لے کر مدینہ گئیں ۔چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دادا کی ننہال خاندانِ نجار میں تھی ۔وہیں ٹھہریں ۔اس سفر میں اُمِّ ایمنؓ بھی ساتھ تھیں جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دایہ تھیں ۔مورخین نے لکھا ہے کہ آپؐ کی والدہ اس ننہالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں ۔لیکن یہ رشتہ دور کا رشتہ تھا ۔قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے ۔میرے نزدیک بعض مورخین کا یہ بیان صحیح ہے ۔کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لئے گئی تھیں ۔جو مدینہ میں مدفون تھے ۔بہرحال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں ۔واپس آتے ہوئے جب مقام ابواء (۳) میں پہنچیں تو ان کا انتقال

---

(۱) زرقانی جلد ۳ ص ۱۶۶ ۔ (۲) اصابہ فی احوال الصحابہ مطبوعہ مصر مطبع سعادت جلد ۱ ص ۲۸۳ ۔ (۳) ایک گاؤں کا نام ہے ۔جو جحفہ سے ۲۳ میل پر واقع ہے ۔

ہو گیا اور یہیں مدفون ہوئیں، اُمِّ ایمنؓ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر مکہ میں آئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامِ مدینہ کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں، جب آپؐ قیامِ مدینہ کے زمانہ میں ایک دفعہ بنو عدی کے منازل پر گذرے تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں، یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا، اسی میدان میں میں انیسہ ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا (۱)۔

عبد المطلب کی کفالت

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبد المطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دامنِ تربیت میں لیا، ہمیشہ آپؐ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے (۲)۔

عبد المطلب نے بیاسی ۸۲ برس کی عمر میں وفات پائی اور حجون میں مدفون ہوئے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ برس کی تھی، عبد المطلب کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ تھے اور فرطِ محبت سے روتے جاتے تھے، عبد المطلب نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے ابو طالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سپرد کی، ابو طالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبد المطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رتبۂ امتیاز کو دفعۃً گھٹا دیا، اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنو امیہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آگیا، عبد المطلب کی مسندِ ریاست پہ اب حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصبِ ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا، جو عبد المطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

ابو طالب کی کفالت

عبد المطلب کے دس ۱۰ بیٹے مختلف ازواج سے تھے، ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبد اللہ اور ابو طالب

---

(۱) طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۲۰۔ (۲) عبد المطلب کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھنا ایک مسلّم واقعہ ہے، لیکن مارگولس صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں، فرماتے ہیں کہ یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی، اور اخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہ نے نشہ کی حالت میں محمدؐ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا، (لائف آف محمدؐ از مارگولس صفحہ ۴۵ تا ۴۹) حضرت حمزہ کے جس قول سے استدلال کیا ہے، مارگولس خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت تھی، اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری (غزوہ بدر و خمس) میں ہے کہ بدر کے مال غنیمت سے حضرت علیؓ کو دو اونٹ ملے تھے، اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، حضرت حمزہؓ شراب میں مخمور ادھر سے گذرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خبر ہوئی تو آپؐ حضرت حمزہؓ کے پاس گئے اور ان کو ملامت کی، حضرت حمزہؓ سخت مخمور تھے، اس حالت میں وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے، کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے؟

ماں جائے بھائی تھے، اس لئے عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو طالب ہی کے آغوش تربیت میں دیا، ابو طالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت رکھتے تھے، کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے تھے، سوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر سوتے، اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

غالباً جب آپؐ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپؐ نے بکریاں چرائیں، فرانس کے ایک نامور مورخ نے لکھا ہے کہ "ابو طالب چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ذلیل رکھتے تھے، اس لئے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے" لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا، بڑے بڑے شرفا اور امرا کے بچے بکریاں چراتے تھے، خود قرآن مجید میں ہے:
وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ. (نحل۔ ۱۶: ۶) اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا، زمانہ رسالت میں آپؐ اس سادہ اور پرلطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے، صحابہؓ جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے، آپؐ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں، یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے، جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا (۱)۔

شام کا سفر

ابو طالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے، قریش کا دستور تھا، سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابو طالب نے حسبِ دستور شام کا ارادہ کیا، سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو طالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابو طالب چلنے لگے تو آپؐ ان سے لپٹ گئے، ابو طالب نے آپؐ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا، عام مورخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے،

(۱) طبقات ابن سعد صفحہ ۸۰ جلد اول۔ بخاری نے کتاب الاجارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے کہ "میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا" قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے، اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے، اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے، اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارہ میں نقل کیا ہے، لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے، جو اجیاد کے قریب ہے، ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی ہے، علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے، اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے، (عینی جلد ۶ صفحہ ۶۳۱) نور النبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

کہ جب ابو طالب بصریٰ میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے جس کا نام بحیرا تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا کہ "یہ سید المرسلین ہیں"۔ لوگوں نے پوچھا تم نے کیوں کر جانا؟ اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لئے جھک گئے۔

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے، اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سر ولیم میور، ڈریپر، مارگولیوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اس نے بتا دیئے تھے انہی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اور اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں (۱)۔

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں۔ قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیئے جائیں، اور اگر کوئی خرق عادت تھا، تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے، اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں، یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریکِ واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق یہ باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔

---

(۱) ڈریپر صاحب معرکہ علم و مذہب میں لکھتے ہیں: "بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمدؐ کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی......... آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا....... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا۔ سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا، وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے، (لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینہ میں پیدا ہو سکتا، جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے۔)

(۱) ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ "حسن اور غریب ہے، اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے"۔ حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے، اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

(۲) اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمن بن غزوان ہے، اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے، لیکن اکثر اہلِ فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں، کہ "عبدالرحمن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے، جن میں سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے"۔

(۳) حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے" علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں" (۱)

(۴) اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور ابو بکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے حالانکہ اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا، اور حضرت ابو بکرؓ بچے تھے۔

(۵) اس حدیث کے اخیر راوی ابو موسیٰ اشعریؓ ہیں، وہ شریک واقعہ نہ تھے، اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے، ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد (۲) میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے، (وہ مرسل یا معضل ہے یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے، اور جو روایت معضل ہے، اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی، جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے)

(۶) حافظ ابن حجر رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابو بکرؓ اور بلالؓ کی شرکت بداہتہً غلط ہے، اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادّعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں، عبدالرحمن بن غزوان کی نسبت خود انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے"۔ ممالیک کی ایک روایت ہے، جس کو محدثین جھوٹ

---

(۱) نبراس فی شرح عیون السیر لابن سید الناس اور زرقانی اور میزان الاعتدال اور اصابہ (تذکرہ عبدالرحمن بن غزوان مستدرک حاکم مع تلخیص ج ۲ ص ۶۱۵) "س" [(۲) جز اول قسم اول ص ۷۵] ۔ "س"

اور موضوع خیال کرتے ہیں (۱)۔

حرب فجار کی شرکت

عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے، ان میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک تھی۔

یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبیلہ میں ہوئی تھی۔ قریش کے تمام خاندانوں نے اس معرکہ میں اپنی اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں، آلِ ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے، اور اسی صف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے، بڑے زور کا معرکہ ہوا، اول قیس پھر قریش غالب آئے، اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہوگیا، اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالارِ اعظم حرب بن امیہ تھا، جو ابوسفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

چونکہ قریش اس جنگ میں بر سرِ حق تھے، اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی۔ لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے، آپؑ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، امام سہیلی نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جنگ نہیں کی، ان کے الفاظ یہ ہیں:

وانمالم یقاتل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مع اعمامہ فی الفجار وقدبلغ سن القتال لانہا کانت حرب فجار وکانوا ایضا کلہم کفارا ولم یاذن اللّٰہ لمومن ان یقاتل الّا لیکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا۔

اور آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی، حالانکہ آپؑ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی، نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے، اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اس لئے خدا نے دیا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

اس لڑائی کو فجار اس لے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی ان مہینوں میں پیش آئی تھی، جن میں لڑنا ناجائز تھا۔

حلف الفضول

لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سیکڑوں گھرانے برباد کردیئے تھے، اور قتل وسفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے، یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس پھرے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ

---

(۱) (جامع نے بحیرا راہب کے قصہ کی مکمل تنقید سیرۃ النبیؐ جلد سوم باب "مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت" میں کی ہے، اس کو ملاحظہ فرمایا جائے) "س"

صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرگروہ تھے ۔ یہ تجویز پیش کی ، چنانچہ خاندان ہاشم ، زہرہ اور تیم ، عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا ، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا (۱) ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں شریک تھے ، اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے ، کہ "معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا (۲) ، اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لئے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں" ۔

اس معاہدہ کو "حلف الفضول" اس لئے کہتے ہیں کہ اوّل اوّل اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا ان کے نام میں لفظ "فضیلت" کا مادّہ داخل تھا (۳) یعنی فضیل بن حرث ، فضیل بن وداعۃ اور مفضل ، یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلہ کے تھے ، اگرچہ یہ معاہدہ بے کار گیا ، اور کسی کو یاد بھی نہ رہا ، چنانچہ قریش نے نئے سرے سے بنیاد ڈالی ، تاہم بانی اوّل کو نیک نیتی کا یہ ثمرہ ملا کہ ان کے نام کی یادگار اب تک باقی ہے ۔

تعمیر کعبہ

کعبہ کی عمارت صرف قد آدم اونچی تھی ، اور دیواروں پر چھت نہ تھی ، جس طرح ہمارے ملک میں عیدگاہیں ہوتی ہیں ، چونکہ عمارت نشیب میں تھی ، بارش کے زمانہ میں شہر کا پانی حرم میں آتا تھا اس کی روک کے لئے بالائی حصہ پر بند بنوادیا گیا تھا ، لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا ، اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا ، بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ موجودہ عمارت ڈھا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم بنائی جائے ، حسن اتفاق یہ کہ جدّہ کے بندرگاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا ، قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لے لئے ، جہاز میں ایک رومی معمار تھا ، جس کا نام باقوم تھا ، ولید اس کو ساتھ لایا ، اور تمام قریش نے مل کر تعمیر شروع کی ، مختلف قبائل نے عمارت کے مختلف حصے آپس میں تقسیم کرلئے تھے کہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے ، لیکن جب حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہوا ، ہر شخص چاہتا تھا ، کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھ سے انجام پائے ، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں ۔

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبو لیتا تھا ، اس موقع پر بھی بعض دعوے داروں نے یہ رسم ادا کی ، چار دن تک

(۱) طبقات ج ۱ صفحہ ۸۲ (۲) (مستدرک ج ۲ ص ۲۲۰) " س " (۳) لیکن امام سہیلی نے مسند حارث بن اسامہ سے ایک حدیث نقل کی ہے ، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس معاہدہ میں یہ الفاظ تھے ، تر د الفضول علی اھلھا ۔

یہ جھگڑا برپا رہا، پانچویں دن ابوامیہؔ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا رائے دی کہ کل صبح کو سب سے پہلے جو شخص آئے وہی ثالث قرار دے دیا جائے، سب نے یہ رائے تسلیم کی، دوسرے دن تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچے، کرشمۂ ربانی دیکھو کہ صبح کو سب سے پہلے لوگوں کی نظریں جس پر پڑیں وہ جمالِ جہاں تاب چہرۂ محمدیؐ تھا۔ لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ کیا کہ اس شرف سے تنہا بہرہ ور ہو، آپؐ نے فرمایا جو قبائل دعویدار ہیں سب کا ایک ایک سردار انتخاب کر لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر بچھا کر حجرِ اسود کو اس میں رکھ دیا، اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں اور اوپر کو اٹھائیں، جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپؐ نے حجرِ اسود کو اٹھا کر نصب فرما دیا (۱) [یہ گویا اشارہ تھا کہ دینِ الٰہی کی عمارت کا آخری تکمیلی پتھر بھی ان ہی ہاتھوں سے نصب ہوگا (۲)۔]

اس طرح ایک سخت لڑائی آپؐ کے حسنِ تدبیر سے رک گئی، کعبہ کی عمارت اب مسقّف کر دی گئی، لیکن چونکہ سامانِ تعمیر کافی نہ تھا، ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور اس حصہ کے گرد چار دیواری کھینچ دی گئی کہ پھر موقع ہوگا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے، یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں، اور جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نبوت ارادہ فرمایا تھا، کہ دیوار ڈھا کر نئے سرے سے عمارت بنائی جائے لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں، دیوار کعبہ ڈھانے سے بدگمان ہو جائیں گے (۳)۔

شغلِ تجارت (۴)

[عرب اور قریش یعنی بنی اسمٰعیل، ظہور اسلام کے ہزاروں برس پہلے سے تجارت پیشہ (۵) تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّ اعلیٰ "ہاشم" نے قبائلِ عرب سے تجارتی معاہدے کر کے اس خاندانی طریقۂ اکتساب کو اور زیادہ مستحکم اور باقاعدہ کر دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب بھی تاجر تھے، اس بنا پر سنِ رشد کو پہنچنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب فکرِ معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

---

(۱) (مسند طیالسی جلد اول ص ۱۸ و مستدرک حاکم جلد اول ص ۴۵۸) "س" [(۲) یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ "میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں" یعنی مکمل مذہب اور خاتم الرسل ہوں] "س"

(۳) یہ واقعات ابن ہشام، طبقات، طبری میں منفرداً اور زرقانی جلد اول صفحہ ۲۳۶ تا ۲۴۰ میں مجتمعاً مذکور ہیں، اخیر کا واقعہ صحیح بخاری میں بھی ہے، بخاری میں یہ بھی ہے کہ قریش جب کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے اور دوشِ مبارک پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے تھے یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے۔

(۴) اضافہ و زیادۃ (۵) توراۃ تکوین قصۂ یوسفؑ۔

ابو طالب کے ساتھ آپؐ بچپن میں بھی بعض تجارتی سفر کر چکے تھے، جس سے ہر قسم کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا، اور آپؐ کے حسنِ معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی، لوگ عموماً اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ دے کر اس کے منافع میں شرکت کر لیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوشی کے ساتھ اس شرکت کو گوارا فرماتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرکائے تجارت کی شہادتوں سے جو احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کس دیانت اور راست بازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے۔

تاجر کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نادر مثال ایفائے عہد اور اتمامِ وعدہ کی ہو سکتی ہے، لیکن منصبِ نبوّت سے پہلے مکہ کا تاجر امینؐ اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا، حضرت عبداللہ بن ابی الحمساءؓ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ معاملہ ہو چکا تھا، کچھ باقی تھا، میں نے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گا، اتفاق سے تین دن تک مجھ کو اپنا وعدہ یاد نہ آیا، تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ منتظر پایا، لیکن اس خلافِ وعدہ سے آپؐ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا، صرف اس قدر فرمایا کہ "تم نے مجھے زحمت دی، میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں" (۱)۔

کاروبارِ تجارت میں ہمیشہ آپؐ اپنا معاملہ صاف رکھتے تھے، نبوّت سے پہلے بھی جن لوگوں سے تجارت میں آپؐ کا سابقہ تھا، وہ بھی اس کی شہادت دیتے تھے، سائبؓ نام ایک صحابی جب مسلمان ہو کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، تو لوگوں نے ان کی تعریف کی، آپؐ نے فرمایا "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں"۔ سائب نے کہا، آپؐ پر میرے ماں باپ قربان، آپؐ میرے شریکِ تجارت تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صرف رکھا، فکنت لا تداري ولا تماري (۲)۔ قیس بن سائبؓ مخزومی ایک اور صحابی بھی آپؐ کے شریکِ تجارت تھے، وہ بھی انہی الفاظ کے ساتھ آپؐ کے حسنِ معاملہ کی کی شہادت دیتے ہیں (۳)۔

تجارت کی غرض سے شام و بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر آپؐ نے کئے تھے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۳۲۶۔ (مطبع محمدی کتاب الادب باب فی الوعد) (۲) ابوداؤد جلد ۲ ص ۳۱۰ (۳) اصابہ (جلد ۵ ص ۲۵۳) ترجمہ حضرت قیسؓ بن سائب۔

تزویجِ خدیجہ

حضرت خدیجہؓ ایک معزز خاتون تھیں۔ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ملتا ہے۔اور اس رشتہ کے لحاظ سے وہ آپؐ کی چچیری بہن تھیں۔ان کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں۔اب وہ بیوہ تھیں۔چونکہ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق تھیں۔جاہلیت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے۔نہایت دولتمند تھیں۔طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہلِ مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا ان کا سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اب پچیس برس کی ہو چکی تھی۔متعدد قومی کاموں میں آپؐ شریک ہو چکے تھے۔تجارت کے کاروبار کے ذریعہ سے لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آتے تھے۔اس بنا پر آپ کے حسنِ معاملہ،راستبازی صدق و دیانت۔اور پاکیزہ اخلاق کی عام شہرت ہو چکی تھی۔یہاں تک کہ زبانِ خلق نے آپؐ کو امین کا لقب دے دیا تھا۔حضرت خدیجہؓ نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ "آپؐ میرا مالِ تجارت لے کر شام کو جائیں،جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں آپؐ کو اس کا مضاعف دوں گی"۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔اور مالِ تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔

واپس آنے کے تقریباً تین مہینہ کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا۔ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے۔عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں۔اور اس میں بالغہ نا بالغہ کی قید نہ تھی،حضرت خدیجہؓ نے چچا کے ہوتے ہوئے خود براہ راست تمام مراتب طے کئے۔تاریخِ معیّن پر ابو طالب اور تمام رؤسائے خاندان جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے،حضرت خدیجہ کے مکان پر آئے۔ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانچ سو طلائی درہم مہر قرار پایا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد زندہ تھے۔اور ان کی موجودگی میں نکاح ہوا،لیکن شراب میں مخمور تھے،جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سن کر برہم ہوئے کہ یہ برابر کا جوڑ نہیں۔

لیکن یہ روایت صحیح نہیں۔امام سہیلی نے بہ تصریح اور بہ دلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد جنگِ فِجار کے قبل انتقال کر چکے تھے۔

حضرت خدیجہؓ جس مکان میں رہتی تھیں وہ آج بھی (حسب بیان مورخ طبری) انہی کے نام سے مشہور ہے، امیر معاویہؓ نے اس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا۔

شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کی تھی، اور پہلے دو شوہروں سے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں، ان کے نام اور مفصل حالات آگے آئیں گے (۱)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر اولاد ہوئی، بجز حضرت ابراہیم کے حضرت خدیجہؓ ہی کے بطن سے ہوئی، ان کے حالات آگے تفصیل سے آئیں گے۔

جستہ جستہ واقعات

یہ واقعات تھے جن میں تاریخی ترتیب معلوم ہے، اس لئے مسلسل لکھے گئے، ان امور کے سوا جستہ جستہ واقعات کا بھی پتہ لگتا ہے، چونکہ ان کے سنین اور تاریخیں غیر معلوم ہیں، اس لئے ان کو عام سلسلہ سے الگ یک جا لکھنا زیادہ موزوں ہوگا۔

حدود سفر

اہلِ مکہ عموماً تجارت کرنے کی غرض سے سفر کرنے کے عادی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کئے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گذر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقاماتِ تجارت میں بھی آپؐ کا تشریف لے جانا ثابت ہے، عرب میں مختلف مقامات میں جو بازار قائم تھے ان میں سے جباشتہ کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے، حضرت خدیجہؓ نے جہاں جہاں آپؐ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی ہے، جو یمن میں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے، اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے، کہ جرش میں آپؐ دو دفعہ تشریف لے گئے، اور ہر دفعہ حضرت خدیجہ نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا (۲)۔

نبوت کے بعد جس سال آپؐ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے، ان میں جب بحرین سے عبد القیس کا وفد آیا، تو آپؐ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپؐ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں: آپؐ نے فرمایا "میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے" (۳) مورخین

---

(۱) حضرت خدیجہؓ کے نکاح کے واقعات ابن ہشام، ابن سعد و طبری میں باختلافِ اجمال و تفصیل و اثبات و نفی مذکور ہیں، میں نے قرائن سے جو بات زیادہ قابل اعتبار پائی نقل کی ہے، یک جا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول ص ۲۳۲ سے ۲۳۶ تک دیکھنا چاہیے، حضرت خدیجہؓ کے مکان کا ذکر صرف طبری نے کیا ہے، ابن حنبل (مسند ابن عباس) میں بھی واقعات مذکور ہیں۔ (۲) نور النبراس فی شرح ابن سید الناس (۳) مسند امام احمد بن حنبل (جلد ۳) صفحہ ۲۰۶ "س"

یورپ نے جو علومِ غیبی کے منکر ہیں، اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ (نعوذ باللہ) آپؐ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے، ایک مورخ نے لکھا ہے، کہ "آپؐ نے بحری سفر بھی کیا تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے۔"(۱) مورخِ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپؐ مصر بھی تشریف لے گئے تھے، اور ڈیڈسی (بحرِ میت) کا بھی معائنہ کیا تھا، لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہے(۲)

مراسمِ شرک سے اجتناب

یہ قطعاً ثابت ہے کہ آپؐ بچپن اور شباب میں بھی جب کہ منصبِ پیغمبری سے ممتاز نہیں ہوئے تھے، مراسمِ شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

ایک دفعہ قریش نے آپؐ کے سامنے کھانا لاکر رکھا، یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا، جانور جو ذبح کیا گیا تھا کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا، آپؐ نے کھانے سے انکار کیا(۳)

نصاریٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ آپؐ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا ہے وہ عہدِ نبوّت سے ہوا ہے، ورنہ اس سے پہلے آپؐ کا طرزِ عمل وہی تھا جو آپؐ کے خاندان اور اہلِ شہر کا تھا، چنانچہ آپؐ نے اپنے پہلے صاحبزادہ کا نام عبدالعزیٰ (۴) رکھا تھا، اور یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخِ صغیر میں موجود ہے۔ لیکن اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کیوں کر استدلال ہو سکتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بت پرست تھیں، انہوں نے یہ نام رکھا ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک منصبِ ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے، اس لئے آپؐ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا، اور اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہ بھی ثابت نہیں، اس

---

(۱) مارگولوس صفحہ ۷۰ (۲) (یورپین مورخین جن کی بنیاد صرف قیاس و رائے پر ہوتی ہے، اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مصر جانا در حقیقت یورپ کے عہدِ مظلم کی مضحکہ انگیز روایت ہے۔ بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا۔ لیکن اگر بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا۔ بحرِ میت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے۔ کیوں کہ اس کا موقع عرب و شام کے درمیان میں ہے، جہاں سے آپؐ کئی بار تجارت کے ساتھ گذر رہے ہوں گے) "س" (۳) صحیح بخاری باب المناقب ذکر زید بن عمرو بن نفیل، یہ حدیث امام بخاری نے اور ابواب میں بھی نقل کی ہے، اس کے الفاظ میں اجمال رہ گیا ہے، جو اس روایت میں صاف ہو گیا ہے، مسند ابن امام حنبل (جلد ۱ صفحہ ۱۸۹) میں ایک روایت ہے۔ جس میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو اس کھانے پر بلایا اور زید نے انکار کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخ سے کبھی بتوں پر ذبح کیا ہوا کھانا نہیں کھایا۔ لیکن اس روایت کے راویوں کا حال نہیں ملتا، اور یوں بھی بخاری کے سامنے اس روایت کی کیا وقعت ہے۔ (۴) عزیٰ ایک بت کا نام تھا۔

روایت کا سب سے زیادہ صحیح تر سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے۔ اس کا پہلا راوی اسمٰعیل ہے جس کا پورا نام اسمٰعیل بن ابی اویس ہے۔ اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے۔ لیکن گروہ کثیر کی راے حسبِ ذیل ہے۔

معاویہ بن صالح۔	اسمٰعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔
یحییٰ بن مخلط۔	وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اور محض ہیچ ہے۔
امام نسائی۔	ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔
نضر بن سلمہ مروزی۔	وہ کذاب ہے۔
دار قطنی۔	میں اس کو صحیح روایت کے لئے پسند نہیں کرتا۔
سیف بن محمد۔	وہ جھوٹ حدیثیں بناتا ہے۔
سلمہ بن شعیب۔	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنا لیتا تھا۔

یہ امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کردی تھی۔ اور جن لوگوں پر آپؐ کو اعتماد تھا۔ ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے (۱)۔ (مستدرک حاکم جلد سوم ذکر زید بن حارثہؓ "س")

موحدین کی ملاقات اس میں شبہہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے فیضِ الٰہی کی خفیف شعاعیں عرب میں پھیلنی شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ قس بن ساعدہ۔ ورقہ بن نوفل۔ عبید اللہ بن جحش۔ عثمان بن الحویرث۔ زید بن عمرو

---

(۱) مسٹر مارگولیس نے اس کے بر خلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے اور اس کے ثبوت میں دعویٰ سے زیادہ تر حیرت انگیز فریب کاری کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کر لیا کرتے تھے۔ جس کا نام عزیٰ تھا"۔ مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام حنبل کی روایت (جلد ۴ صفحہ ۲۲۲) پیش کی ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

حدثني جار لخديجة بنت خويلد انه سمع النبي صلى الله عليه وسلم وهو يقول لخديجة اي خديجة و الله لا اعبد اللات و العزّى و الله لا اعبد ابدا قال فتقول خديجة خل اللات خل العزّى قال كانت صنمهم التي كانوا يعبدون ۔

"مجھ سے خدیجہ (بنت خویلد) کے ایک ہمسایہ نے بیان کیا کہ میں نے پیغمبر صاحب کو حضرت خدیجہؓ سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ بخدا میں کبھی لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کروں گا خدیجہؓ کہتی تھی کہ لات کو جانے دیجئے عزیٰ کو جانے دیجئے (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے) اس نے کہا کہ لات و عزیٰ وہ بت تھے، جس کی پرستش

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۰ پر ملاحظہ ہو)

ابن نفیل نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا (۱)۔ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید سے ملاقات کی تھی۔ جس کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ورقہ عیسائی ہو گئے تھے۔ اور چونکہ حضرت خدیجہؓ کے برادر عم زاد بھائی تھے اور مکہ ہی میں رہتے تھے۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ آپؐ ان سے بھی ملے ہوں گے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ان سے آپؐ کی دوستی تھی۔

ادب و محاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدۃ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس خطبہ میں شریک تھے۔ اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہلِ ادب نے نقل کیا ہے اور چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآن مجید کی سورتوں کی طرح چھوٹے اور مقفّٰی ہیں۔ اس لئے عیسائی مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طرز انہی سے لیا ہے۔ چنانچہ بعض فقرے یہ ہیں:۔

ایها الناس اسمعوا و عوا، واذا وعیتم فانتفعوا، انه من عاش مات، ومن مات فات وکل ما هوات آت مطر و نبات، وارزاق واقوات ، وآباء وامّهات، واحیاء واموات، وجمیع واشتات، انّ فی السماء لخبرا وانّ فی الارض لعبرا، لیل داج، وسماء ذات ابراج، وبحار ذات امواج، مالی اری الناس یذهبون فلا یرجعون ارضوا بالمقام فاقاموا ، ام ترکوا هناک فناموا، این من بنی وشیّد، وزخرف ونجد، وعدّ المال والولد، این من بغی وطغی۔

قس بن ساعدۃ کی روایت اور اس کا خطبہ مختصر و مطول بہ عباراتِ مختلف، بغوی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹) ثم یضطجعون اہل عرب سونے سے پیشتر کر لیا کرتے تھے۔

ایک معمولی عربی داں بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکور میں کانوا کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اہل عرب لات و عزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا تو تشنیہ کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا۔ اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات، عزیٰ کی پرستش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت انکار کرنا مذکور ہے۔

مارگولوس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی۔ لیکن صاحب موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے۔ (دیکھو مارگولوس کی کتاب صفحہ ۶۸ تا ۷۰) معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے۔ لیکن (اولاً تو اس موضوعِ خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے، ثانیاً یہ روایت کلبی سے ہے، جو مشہور دروغ گو ہے۔

(۱) ابن ہشام صفحہ ۶، میں قس بن ساعدۃ کے سوا باقی سب لوگوں کے نام اور حالات مذکور ہیں، زید کا ذکر بخاری میں بھی ہے۔ قس کا ذکر نہایت کثرت سے تمام تاریخوں اور ادب کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

ازدی، بیہقی، جاحظ وغیرہ نے نقل کیا ہے، لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے، اس کے رواۃ عموماً ناقابل سند بلکہ کذاب ہیں، چنانچہ سیوطی نے موضوعات میں اس روایت کے تمام طریقوں کو نقل کر کے ان کے رواۃ سے بحث کی ہے، اور علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کے اقوال تفصیل سے نقل کئے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ یہ روایت مختلف طریقوں سے مروی ہے، لیکن ہر طریقہ میں کوئی نہ کوئی راوی ایسا ہے، جو موضوع حدیثیں بنایا کرتا تھا، اس کا ایک مشترک راوی محمد بن حجاج ہے، اس کی نسبت ابن معین کا قول ہے کہ "کذاب اور خبیث ہے"۔ ابن عدی نے لکھا ہے کہ "ہریسہ کی حدیث اسی نے وضع کی ہے"۔ ایک طریقہ کا راوی سعید بن ہبیرة ہے، اس کی نسبت ابن حبان نے لکھا ہے کہ "ثقہ لوگوں کی زبانی جھوٹی حدیثیں روایت کرتا تھا، یا تو وہ خود یہ حدیثیں تصنیف کرتا تھا، یا اور لوگ اس کے لئے بنا دیا کرتے تھے"۔ ایک طریقہ کے راوی قاسم بن عبداللہ اور احمد بن سعید ہیں، اور یہ دونوں حدیث بنانے میں بدنام ہیں، بیہقی نے اس روایت کے متعلق ایک بڑا قصہ نقل کیا ہے، جس میں حضرت ابو بکرؓ نے قس بن ساعدہ کا پورا خطبہ اپنی یاد سے بیان کیا ہے، یہ روایت پوری کی پوری موضوع ہے (۱)، حافظ ابن حجر نے اس روایت کے اور طریقے بھی نقل کئے ہیں اور ان کی تضعیف کی ہے (۲)۔

---

(۱) یہ پوری تفصیل اللآلی المصنوعة، مطبوعۂ مصر صفحہ ۹۵ تا صفحہ ۱۰۰ میں ہے۔ (۲) ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے، بنوامیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے زمانہ کے شعرا اور فصحا سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے، اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعرا اور خطباء کے نام سے مشہور کرتے تھے، محمد بن اسحاق اس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاری نے جزء القرءة میں ان سے روایت کی ہے، تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال (مطبوعہ مصر ص ۹۲) میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے، کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دے دیتے تھے، کہ ان کے بارے میں اشعار کہہ دو، ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے، ابن ہشام میں حضرت خدیجہؓ، ابو بکرؓ، امیہ بن ابی الصلت، ابو طالب کے سیکڑوں اشعار نقل کئے ہیں، جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں، کہ فن شعر کے ماہران اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں، مثلاً سریہ عبیدة بن الحرث میں (ابن ہشام جلد دوم صفحہ ۳ مطبوعہ مصر) حضرت ابو بکرؓ کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

واکثر اھل العلم والشعر ینکر ھذہ القصیدة لابی بکر	اور اکثر اہل علم اور فن شعر والے اس بات کے منکر ہیں کہ یہ قصیدہ حضرت ابو بکرؓ کا ہے۔

یہ وضاعی مختلف اغراض سے کی جاتی ہے، زیادہ اس وجہ سے کہ ان جلسوں یا شعروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے، مثلاً یہی قس بن ساعدة کا خطبہ، اس میں یہ فقرے بھی ہیں:

نبیا قد حان حینہ واظلکم اوانہ فطوبی لمن اٰمن بہ فھداہ وویل لمن خالفہ وعصاہ (اللآلی المصنوعہ ص ۴۸)	ایک پیغمبر کا زمانہ قریب آ گیا ہے، سو اس کو مبارکی ہے، جو جو اس پر ایمان لائے گا اور وہ اس کو ہدایت کرے گا اور تباہی ہے اس کے لئے جو اس کی مخالفت اور نافرمانی کرے گا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲ پر)

احبابِ خاص

نبوت سے پہلے جو لوگ آپؐ کے احبابِ خاص تھے، سب نہایت پاکیزہ اخلاق، بلند رتبہ اور عالی منزلت تھے۔ ان میں سب سے مقدم حضرت ابو بکرؓ تھے، جو برسوں آپؐ کے شریکِ صحبت رہے (۱)۔ حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی حکیم بن حزام جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے، وہ بھی احبابِ خاص میں تھے۔ حرم کا منصبِ رفادہ انہی کے ہاتھ میں تھا، دار الندوہ کے بھی یہی مالک تھے، چنانچہ اسلام کے بعد امیر معاویہؓ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم پر بیچ ڈالا، لیکن یہ کل رقم خیرات کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں پانچ برس بڑے تھے (۲)۔

اگرچہ یہ مدت تک یعنی ہجرت کے آٹھویں سال تک ایمان نہیں لائے، لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کعبہ میں ذو یزن کا اسباب نیلام ہوا تھا، اس میں ایک عمدہ حلّہ تھا، انہوں نے پچاس اشرفیوں میں اس کو

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۱) ابو طالب کے نام سے جو لامیہ قصیدہ ابن ہشام وغیرہ نے نقل کیا ہے (ابن ہشام صفحہ ۹۳ و ۹۴) سرتاپا موضوع ہے، اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں:

فاصبح فینا احمد فی ارومه — تقصر عنه سورة المتطاول

فایده رب العباد بنصره — واظهر دینا حقه غیر باطل

(اس قصیدہ کو سرتاپا موضوع کہنے کے بجائے جیسا کہ مصنفؒ نے کہا ہے، اکثر کہنا صحیح ہے۔ کیوں کہ اس کے دو شعر صحاح میں بھی مذکور ہیں، مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الاستسقاء۔ خود ابن اسحاق نے اس قصیدہ کو نقل کر کے لکھا ہے: وبعض اهل العلم بالشعر ینکر اکثرها۔ یعنی بعض ماہرین شعر اس کے اکثر اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں۔ "س") اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں، ان کے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی، امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان کو دیکھ کر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں، مثلاً:

فقلت له اذهب بهرون فادعوا — الی الله فرعون الذی کان طاغیا

وقولا له اانت رفعت هذه — بلا عمد ارفق اذا بک بانیا

وقولا له اانت سویت وسطها — منیرا اذا ما جنه اللیل هادیا

ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولس نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ "قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے"۔ (صفحہ ۲۰ تا صفحہ ۹۳) ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا، آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطباء اور شعراء سے معتقدات اور خیالات بلکہ طرز ادا تک اخذ کرتے تھے۔ لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لئے ابھی ایک زمانہ درکار ہے، اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی۔ (۱) اصابہ ذکر حضرت ابو بکرؓ (حضرت ابو بکرؓ کا نام عبد اللہ تھا، اصابہ میں اسی نام کے ذیل میں حضرت ابو بکرؓ کا حال لکھا ہے، جلد ۲ صفحہ ۳۴۱) "س" (۲) اصابہ ذکر حکیم بن حزام (جلد ۱ صفحہ ۳۴۹) "س"

خریدا، اور مدینہ لے کر آئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کریں، آپؐ نے فرمایا کہ میں مشرکوں کا ہدیہ نہیں قبول کرتا، البتہ قیمت لو تو لے سکتا ہوں، مجبور ہو کر انہوں نے قیمت لینی گوارا کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لے لیا (۱)۔

حضرت ضماد بن ثعلبہؓ، جو ازد کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں طبابت اور جرّاحی کا پیشہ کرتے تھے، یہ بھی احباب خاص میں سے تھے، نبوت کے زمانہ میں یہ مکہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھا کہ راستہ میں جا رہے ہیں اور پیچھے لونڈوں کا غول ہے، مکہ کے کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنوں کہتے تھے، لونڈوں کا غول دیکھ کر ضماد نے یہی قیاس کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا محمدؐ! میں جنون کا علاج کر سکتا ہوں، آپؐ نے حمد و ثنا کے بعد چند مؤثر جملے ادا کئے، ضماد مسلمان ہو گئے، اس واقعہ کو مختصراً مسلم و نسائی نے بھی لکھا ہے، لیکن زیادہ تفصیل مسند امام احمد بن حنبل (جلد ۱ صفحہ ۳۰۲) میں ہے۔

جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تجارت کے کاروبار میں شریک تھے، ان میں ایک صاحب قیس بن سائبؓ مخزومی تھے، مجاہد بن جبر جو مشہور مفسّر گذرے ہیں، انہی کے غلام تھے، ان کا بیان ہے کہ شرکا، کے ساتھ آپؐ کا معاملہ نہایت صاف رہتا تھا، اور کبھی کوئی جھگڑا یا مناقشہ پیش نہیں آتا تھا (۲)۔

(۱) مسند امام ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۰۳۔ (۲) استیعاب (جلد ۲ صفحہ ۵۲۶) (۳) و اصابہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آفتابِ رسالت کا طلوع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں پیدا ہوئے مکہ بت پرستی کا مرکز اعظم تھا، خود کعبہ میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاندان کا تمغائے امتیاز صرف اس قدر تھا کہ اس صنم کدہ کے متولی اور کلید بردار تھے۔ بااینہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا، دیگر رسومِ جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی، قریش نے اس بنا پر کہ ان کو عام لوگوں سے ہر بات میں ممتاز رہنا چاہئے، یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ ایامِ حج میں قریش کے لئے عرفات جانا ضرور نہیں، اور یہ کہ جو لوگ باہر سے آئیں، وہ قریش کا لباس اختیار کریں، ورنہ ان کو عریاں ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا (۱)، چنانچہ اسی بنا پر طوافِ عریاں کا رواج ہو گیا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا (۲)۔

عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا، راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا، داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق و شوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا، لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے، وہیں نیند آ گئی، اٹھے تو صبح ہو چکی تھی (۳)۔

ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو ۲ دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا، لیکن دونوں دفعہ توفیقِ الٰہی نے بچا لیا کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے" (۴)۔

یہ فطرتِ سلیم اور نیک سرشتی کا اقتضا تھا، لیکن ایک شریعتِ کبریٰ کی تاسیس، ایک

---

(۱) ابن ہشام مطبوعہ مصر ۱۲۹۵ھ جلد اول ص ۶۷ (۲) ابن ہشام ص ۶۹ [(۳) بزار و مستدرک بحوالہ نسیم الریاض ج اول ص ۴۰۹ و خصائص کبریٰ سیوطی ج اول ص ۸۸] "س" (۴) سر ولیم میور صاحب "لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)" میں لکھتے ہیں "ہماری تمام تصنیفات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں ان کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کمیاب تھی، متفق ہیں"۔

مذہبِ کامل کی تشئید اور رہنمائی کونین کے منصبِ عظیم کے لئے کچھ اور درکار تھا۔ اسی زمانہ کے قرب میں اور حق پرستوں (ورقہ، زید، عثمان بن حویرث) کے دل میں خیال آیا کہ جمادِ لایعقل کے آگے سر جھکانا حماقت ہے۔ چنانچہ سب مذہبِ حق کی تلاش کے لئے نکلے۔ لیکن ناکامی کی دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر رہ گئے۔ ورقہ اور عثمان عیسائی ہوگئے۔ اور زید یہ کہتے کہتے مر گئے "اے خدا اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ تجھ کو کس طریقہ سے پوجنا چاہئے تو میں اسی طریقہ سے تجھ کو پوجتا"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے دنیاوی تعلقات تھے۔ تجارت کا کاروبار تھا، متعدد اولادیں تھیں، تجارت کی ضرورت سے اکثر سفر کرنا پڑتا تھا۔ لیکن دستِ قدرت کو جو کام لینا تھا، وہ ان تمام مشاغل سے بالاتر تھا۔ دنیا اور دنیا کے تمام کام آپؐ کو ہیچ نظر آتے تھے۔ تاہم مطلوبِ حقیقی کا اب تک پتہ نہ تھا۔

مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا، جس کو حِرا کہتے ہیں، آپؐ مہینوں وہاں جاکر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے، کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے وہ ختم ہوچکتا تو پھر گھر پر تشریف لاتے، اور پھر واپس جاکر مراقبہ میں مصروف ہوتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ غارِ حِرا میں آپؐ تحنث یعنی عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ عبادت کیا تھی؟ عینی شرح بخاری میں ہے:

قیل ما کان صفۃ تعبدہ اجیب	یہ سوال کیا گیا ہے کہ آپؐ کی عبادت کیا تھی؟
بان ذلک کان بالتفکر والاعتبار۔	جواب یہ ہے کہ غور و فکر اور عبرت پذیری۔

یہ وہی عبادت تھی جو آپؐ کے دادا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی۔ ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا، آفتاب پر اس سے زیادہ، لیکن جب سب نظروں سے غائب ہوگئے تو بے ساختہ پکار اٹھے:

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ .... (انعام۔۶:۷۶)	میں فانی چیزوں کو نہیں چاہتا ....
اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (انعام۔۶:۷۹)	میں اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین و آسمان پیدا کیا۔

ایک مغربی مورخ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی ہے۔

"سفر و حضر ہر جگہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے، میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟

میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ کیا کوہِ حرا کی چٹانیں ۔ کوہ طور کی سربفلک چوٹیاں، کھنڈر اور میدان۔ کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا، نہیں ہرگز نہیں، بلکہ گنبدِ گردان، گردشِ لیل و نہار، چمکتے ہوئے ستارے، برستے ہوئے بادل، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا" (۱)۔

نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپؐ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے، جو کچھ آپؐ خواب میں دیکھتے تھے، بعینہ وہی پیش (۲) آتا تھا، ایک دن جب کہ آپؐ حسبِ معمول غارِ حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپؐ سے کہہ رہا ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ط خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ط (علق ۔۹۶: ۱ تا ۵)

پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ تیرا خدا اکریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ سے سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

آپؐ گھر واپس تشریف لائے تو جلالِ الٰہی سے لبریز تھے (۳)۔

آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کیا، وہ آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لوا گئیں، جو عبری زبان جانتے تھے، اور توریت وانجیل کے ماہر تھے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈر پیدا ہوا! حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ "آپؐ متردد نہ ہوں، خدا آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑے گا"۔ پھر وہ آپؐ کو ورقہ کے پاس لوا گئیں انہوں نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بے شبہ یہ الفاظ نکلے۔ "مجھ کو ڈر ہے"۔ لیکن یہ تردد، یہ ہیبت، یہ اضطراب، جلالِ الٰہی کا تاثر (اور نبوت کے بارِ گراں کی عظمت کا تخیل) تھا آپؐ نے کیا دیکھا؟ ناموسِ اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو

---

(۱) کارلائل ہیروز تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (۲) وحی کے انواع میں سے ایک خواب بھی ہے۔ صحیح بخاری کے شروع میں ہے "اول مابدء بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرویا الصالحۃ فی النوم" بخاری کتاب التعبیر میں زیادہ صاف طریقہ پر یہ مسئلہ ادا کیا گیا ہے۔ (۳) صحیح بخاری باب بدء الوحی و کتاب التعبیر، یہ روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ لیکن حضرت عائشہؓ اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں، محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں، لیکن صحابہؓ کا مرسل محدثین کے نزدیک قابل حجت ہے، کیونکہ متروک راوی بھی صحابیؓ ہی ہوں گے۔

الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔

صحیح بخاری باب التعبیر میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں، دفعۃً حضرت جبرئیلؑ نظر آتے تھے، اور کہتے تھے، "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو"۔ اس سے آپؐ کو اس وقت تسکین ہو جاتی تھی، لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لئے رک جاتی تھی تو پھر آپؐ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے، اور پھر حضرت جبرئیل نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپؐ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے حصۂ اوّل کی شرح میں معترضین کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ "ایک پیغمبر کو نبوّت میں کیونکر شک ہو سکتا ہے، اور ہو تو کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہو سکتی ہے"۔ پھر ایک مشہور محدّث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ "نبوّت ایک امر عظیم ہے، اس کا تحمل دفعۃً نہیں ہو سکتا، اس لئے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب کے ذریعہ سے مانوس کیا گیا، پھر جب دفعۃً فرشتہ نظر آیا تو آپؐ اقتضائے بشریت سے خوف زدہ ہو گئے، حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو آپؐ کو پورا یقین ہو گیا، محدّث مذکور کے الفاظ یہ ہیں:

فلمّا سمع کلامه ایقن بالحق واعترف به،	جب آپؐ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپؐ کو حق کا یقین آ گیا اور آپؐ نے اس کا اعتراف کیا،

محدّث مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "وحی بار بار اس لئے رک جاتی تھی کہ آپؐ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں" (۱)۔

لیکن جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ "نبوّت سے پہلے سفر شام میں (بمقام بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپؐ بیٹھے تھے، اس کی تمام شاخیں آپؐ پر جھک آئیں جس سے بحیرا نے آپؐ کے نبی ہونے کا یقین کیا"۔ جب کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میں اس پتھر کو خوب پہچانتا ہوں جو نبوّت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا"۔ جب کہ صحاح میں موجود ہے، کہ "نبوّت سے پہلے فرشتوں نے آپؐ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائش نکال کر پھینک دی"۔ تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپؐ اس قدر خوف زدہ ہو جاتے تھے کہ ایک

---

(۱) فتح الباری شرح صحیح بخاری کتاب التعبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۱۰، مطبوعہ مصر۔

دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا، اور آپؐ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے، اور بار بار حضرت جبرئیلؑ کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا، حضرت موسیٰؑ نے درخت سے آواز سنی کہ "میں خدا ہوں"۔ تو کیا ان کو کوئی شبہ پیدا ہوا؟

حافظ ابن حجر وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں، ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے یا نہیں، یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے، یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے، یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لئے سند مقطوع کافی نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں، اگر آپؐ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں، تو مشکل نہ تھی، لیکن خاتم انبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پر خطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس غرض کے لئے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جاسکتے تھے، جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے، جن کو آپؐ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپؐ کے صدق دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپؐ کی حرم محترم تھیں، حضرت علیؓ تھے جو آپؐ کی آغوش تربیت میں پلے تھے، زیدؓ تھے، جو آپؐ کے آزاد کردہ غلام اور بندہ، خاص تھے، حضرت ابو بکرؓ تھے جو (۱) برسوں سے فیضیاب خدمت تھے، سب سے پہلے آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سنایا، وہ سننے سے پہلے مومن تھیں، پھر اور بزرگوں کی باری آئی، اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابو بکرؓ دولتمند، ماہر انساب، صاحب الرائے اور فیاض تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا عام اثر تھا، اور معززین شہر ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے، ارباب روایت کا بیان ہے کہ کبار صحابہؓ میں سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت

(۱) اصابہ فی احوال الصحابہ میں بزرگان موصوف کا تذکرہ ملاحظہ کرنا چاہئے۔

سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران، حضرت طلحہؓ سب انہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے (۱) ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان سابقین اولین میں عمارؓ، خباب بن الارتؓ، حضرت عثمانؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہؓ، ارقمؓ، سعید بن زیدؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عثمان بن مظعونؓ، عبیدہؓ، صہیبؓ رومی زیادہ ممتاز ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا، نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمان خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے، نماز کا جب وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے۔ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپؐ حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی، (۲) ایک دفعہ آپؐ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے آپؐ کے چچا ابو طالب آنکلے۔ ان کو اس جدید طریقہ، عبادت پر تعجب ہوا، کھڑے ہوگئے اور بغور دیکھتے رہے۔ نماز کے بعد پوچھا کہ یہ کون دین ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا، ابو طالب نے کہا میں اس کو اختیار تو نہیں کرسکتا، لیکن تم کو اجازت ہے اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہوسکے گا۔

یہ تاریخ اسلام کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا؟ مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی، لیکن ایک خاص پہلو پر یہیں نگاہ ڈال لینی چاہیے، یعنی یہ کہ اوائل اسلام میں جب کہ اسلام لانا جان و مال سے ہاتھ دھونا تھا، کون لوگ اور کس قسم کے لوگ ایمان لائے؟

اس زمانہ میں جو لوگ اسلام لائے، ان میں چند خصائص مشترک تھے، اسی قسم کے (لیکن بالعکس) مشترک خصائص ان لوگوں میں بھی پائے جاتے تھے، جنہوں نے شدت سے مخالفت کی، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے۔

(۱) اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاشِ حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک طبع اور پاکیزہ اخلاق تھے، مثلاً حضرت ابو بکرؓ جاہلیت میں بھی عفیف، پارسا اور صدق و دیانت میں مشہور تھے، عثمان بن مظعونؓ صوفی مزاج تھے، اور اسلام سے پہلے شراب چھوڑ چکے تھے، اسلام کے بعد

---

(۱) دیکھو ریاض النضرۃ محب الطبری صفحہ ۱۵۔ (۲) (کامل ابن اثیر ج ۲ صفحہ ۲۱ ذکر الاختلاف فی اول من اسلم) س۔

چاہتے تھے کہ راہب بن جائیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا، صہیبؓ عبداللہ بن جدعان کے تربیت یافتہ تھے، جو اسلام سے پہلے تارکِ شراب ہو کر وفات پا چکے تھے، حضرت ابوذرؓ جن کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر تھا، ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے بت پرستی چھوڑ چکے تھے اور غیر متعین طریقہ سے جس طرح ان کے ذہن میں آتا تھا خدا کا نام لیتے تھے، اور نماز پڑھتے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال سنا تو اپنے بھائی کو بھیجا کہ صحیح خبر لائیں، وہ مکہ میں آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن مجید کی سورتیں سنیں، واپس جا کر ابوذرؓ سے کہا کہ "میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کو لوگ مرتد کہتے ہیں، وہ مکارمِ اخلاق سکھاتا ہے، اور جو کلام سناتا ہے وہ شعر نہیں کوئی اور چیز ہے، تمہارا طریقہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے"۔ ابوذرؓ کو تسکین نہیں ہوئی، خود مکہ میں آئے، زبانِ مبارک سے آپؐ کا ارشاد سنا اور اسلام قبول کر لیا، وہ تمام عمر دنیاوی تعلقات سے الگ رہے، ان کا عقیدہ تھا کہ (مسلمان کے لئے زر و مال کا جمع کرنا جائز نہیں) چنانچہ اس بنا پر حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں ان کو مدینہ سے دور بھیج دیا تھا (۱)۔

(۲) بعض صحابہؓ ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے یعنی وہ لوگ جو زمانہ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کا پیرو کہتے تھے، لیکن اس اجمالی اعتقاد کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے اور اس لئے تلاشِ حق میں سرگرداں تھے، انہی میں زید بھی تھے، جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، انہوں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ برس پہلے وفات پائی، لیکن ان کے صاحبزادے سعید موجود تھے، وہ باپ کے ارشادات سن چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو ان کو وہ رہنما ہاتھ آ گیا جس کی جستجو میں ان کے باپ دنیا سے چلے گئے، اور وہ اب تک سرگشتہ تھے۔

(۳) یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب اعظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ اکثر ایسے تھے، مثلاً عمارؓ، خبابؓ، ابو فکیہہؓ، صہیب وغیرہ جن کو دولت و جاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو لے کر حرم جاتے تو رؤسائے قریش ہنس کر کہتے:

(۱) حضرت ابوذرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے لیکن باہم اختلاف ہے، میں نے دونوں سے کچھ کچھ لیا ہے، لیکن اختصار کے لحاظ سے بہت سی باتیں چھوڑ دیں۔

اَھٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنْ بَیْنِنَا (انعام۔ ۶: ۵۳)
یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔

کفار کے نزدیک ان کا افلاس ان کی تحقیر کا سبب تھا، لیکن یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ایمان کی دولت سب سے پہلے ان ہی کے ہاتھ آسکتی تھی۔ دولت و مال ان کے دلوں کو سیاہ نہیں کر چکا تھا، فخر و غرور ان کو انقیادِ حق سے روک نہیں سکتا تھا، ان کو یہ ڈر نہ تھا، کہ اگر بت پرستی چھوڑ دیں گے تو کعبہ کا کوئی منصبِ عظیم ہاتھ سے جاتا رہے گا، غرض ان کے دل ہر قسم کے زنگ سے پاک تھے، اور حق کی شعاعیں ان پر دفعۃً پرتو افگن ہو سکتی تھیں، یہی سبب ہے کہ انبیاءؑ کے ابتدائی پیرو ہمیشہ نادار اور مفلس لوگ ہوتے ہیں، عیسائیت کے ارکانِ اوّلین ماہی گیر تھے۔ حضرت نوحؑ کے مقربین خاص کی نسبت کفار کو علانیہ کہنا پڑا:

وَمَا نَرٰکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَمَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ (ھود۔ ۱۱: ۲۷)
اور ہم تو بظاہر یہ دیکھتے ہیں کہ تیری پیروی انہی لوگوں نے کی جو رذیل ہیں اور ہم تو تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو۔

یہ سابقین اسلام جس قسم کا راسخ ایمان لائے تھے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، جس سے ظاہر ہوگا کہ قریش کی سخت خونخواریاں، جور و ظلم کے شدائد اور دولت و مال کی انتہائی ترغیبیں، کوئی چیز ان کو متزلزل نہ کر سکی، اور آخر انہی کمزور ہاتھوں نے قیصر و کسریٰ کا تخت الٹ دیا۔

تین برس تک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہایت رازداری کے ساتھ فرضِ تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتابِ رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر۔ ۱۵: ۹۴)
اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے۔

اور نیز حکم آیا:

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (شعراء۔ ۲۶: ۲۱۴)
اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر پکارا یا معشر قریش! لوگ جمع ہوئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر

آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا "ہاں، کیونکہ تم کو ہمیشہ سے ہم نے سچ بولتے دیکھا ہے"۔ آپ نے فرمایا "تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہو گا"۔ یہ سن کر سب لوگ جن میں ابولہب آپؐ کا چچا بھی تھا، سخت برہم ہو کر چلے گئے۔ (صحیح بخاری ج ۲، ص ۷۰۲)۔

چند روز کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو، یہ درحقیقت تبلیغِ اسلام کا پہلا موقع تھا، تمام خاندان عبدالمطلب مدعو کیا گیا، حمزہ، ابو طالب، عباس سب شریک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کو کفیل ہے، اس بار گراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا"۔ تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعتہً حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں، اور گو میں سب سے نوعمر ہوں، تاہم میں آپؐ کا ساتھ دوں گا" (۱)۔

قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں، حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آ گئی، لیکن آگے چل کر زمانہ نے بتا دیا کہ یہ سراپا سچ تھا۔

اب مسلمانوں کی ایک متعدبہ جماعت تیار ہو گئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی، آپؐ نے حرمِ کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا، کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی، اس لئے دفعتہً ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اور ہر طرف سے لوگ آپؐ پر ٹوٹ پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت حارث بن ابی ہالہؓ گھر میں تھے، ان کو خبر ہوئی، دوڑے ہوئے آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہو گئے، اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی (۲)۔

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب

مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی، قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا، اور جس کی وجہ سے وہ ہمسایۂ خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندانِ الٰہی کہلاتے تھے، اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلید بردار تھے، اس تعلق سے قریش کا کاروبار زیادہ پھیلتا گیا، یہاں تک کہ متعدد محکمے اور بڑے بڑے مناصب قائم کئے گئے، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) [طبری نے تاریخ ج ۳ صفحہ ۱۱۷۱، اور تفسیر ج ۱۹ ص ۶۸ میں عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے، پہلا شیعی اور متروک ہے اور دوسرا بدمذہب، اس روایت میں اور بھی وجوہ ضعف بلکہ وجوہ وضع ہیں] س۔

(۲) اصابہ فی احوال الصحابۃ ذکر حارثؓ ابن ابی ہالہؓ۔

منصب (۱)	منصب کی تفصیل	کس خاندان کو کون منصب حاصل تھا	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کون لوگ ان مناصب پر ممتاز تھے
حجابۃ	کعبہ کی کلید برداری اور تولیت		عثمان بن طلحہ
رفادہ	غریب حجاج کی خبر گیری	خاندانِ نوفل	حُرث بن عامر
سقایۃ	حجاج کے پانی پلانے کا انتظام	خاندانِ ہاشم	حضرت عباسؓ
مشورہ		خاندانِ اسد	یزید بن ربیعۃ الاسو
دیات و مغارم	خون بہا کا فیصلہ کرنا	خاندانِ تیم	حضرت ابو بکرؓ
عقاب	علم برداری	خاندان امیہ	ابو سفیان
قبۃ	خیمہ و خرگاہ کا انتظام اور سواروں کی افسری	خاندان مخزوم	ولید بن مغیرہ
سفارت و منافرت	سفیر ہو کر جانا اور بن قبیلوں میں یہ نزاع پیش آئے کہ شریف تر کون ہے، اس کا فیصلہ کرنا	خاندانِ عدی	حضرت عمرؓ
ازلام و الیسار	محکمۂ فال کا انتظام	خاندانِ جمح	صفوان بن امیہ
اموال	مہتمم خزانہ	خاندانِ سہم	حُرث بن قیس

آغاز اسلام میں جو لوگ قریش کے رؤسائے اعظم تھے، اور جن کی عظمت و اقتدار کا اثر تمام مکہ پر تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابو سفیان بن حرب (حضرت معاویہؓ کے باپ) حرب فجار میں انہی کا باپ قریش کا سپہ سالار تھا۔

[(۱) یہ تمام تفصیل عقد الفرید جلد ۲ صفحہ ۱۳۱ میں ہے۔] "س"

ابو لہب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا)

ابو جہل — ولید بن مغیرہ کا بھتیجا اور اپنے قبیلہ کا سردار۔

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) — قریش کا رئیسِ اعظم تھا۔

عاص بن وائل سہمی (حضرت عمرو بن العاصؓ کا باپ) — نہایت دولت مند، کثیر الاولاد اور صاحبِ اثر تھا۔

عتبہ بن ربیعہ (امیر معاویہؓ کا نانا) — نہایت شریف الطبع اور صاحبِ ریاست تھا۔

ان کے سوا، اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث بن کلدۃ اخنس بن شریق ثقفی، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط صاحبِ اثر تسلیم کئے جاتے تھے۔

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خاندانِ ہاشم اور بنو امیہ برابر کے حریف تھے، اور دونوں میں مدت سے رشک و رقابت چلی آرہی تھی۔

پہلا سبب — ناتربیت یافتہ اور تندخو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو ان کے آبائی رسم و عقائد کے خلاف ہو، ان کو سخت برہم کر دیتی ہے، اس کے ساتھ ان کی مخالفت محض زبانی مخالفت نہیں ہوتی، اور ان کی تشنگی انتقام کو خون کے سوا کوئی چیز بجھا نہیں سکتی، آج ہندوستان اس قدر مہذب ہو گیا ہے، لیکن اب بھی کسی عام مسئلہ مذہبی کی مخالفت کی جائے تو ایک حشر برپا ہو جاتا ہے، اور حکومت موجودہ اگر منتظم اور صاحبِ جبروت نہ ہوتی تو اس زمین پر بارہا خون کا بادل برس چکا تھا۔

عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، خلیل بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی، جن میں ہبل خدائے اعظم تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر و شر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے، اولادیں دیتے تھے، معرکہ ہائے جنگ میں فتحیں دلاتے تھے، خدا یا تو سرے سے نہ تھا، یا تھا تو وجود معطل تھا۔

دوسرا سبب — اسلام کا اصل فرض اس طلسم کو دفعۃً برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت و اقتدار اور عالم گیر اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لئے قریش نے شدت سے مخالفت کی، اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔

قریش کا رئیسِ اعظم حرب بن امیہ تھا، چنانچہ حربِ فجار میں وہی سپہ سالار اعظم تھا۔

لیکن حرب کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ابو سفیان اس منصبِ عظیم کے حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے ولید بن المغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابو جہل اس کا بھتیجا تھا، اور وہ بھی قریش میں امتیاز رکھتا تھا

ابو سفیان گو اپنے باپ کا منصب نہ حاصل کر سکا، لیکن بنو امیہ کے خاندان کا سردار وہی تھا، خاندانِ ہاشم میں سب سے زیادہ کبیر السن ابو لہب تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا۔

قبیلہ سہم میں سب سے زیادہ بااثر عاص بن وائل تھا، جو نہایت دولت مند اور کثیر الاولاد تھا۔

قریش کی عنانِ حکومت انہی رؤسا کے ہاتھ میں تھی، اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی، قریش کے اور اکابر مثلاً اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط انہی لوگوں کے زیر اثر تھے، اور اس وجہ سے اعدائے اسلام میں ان کے نام ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

قریش کا یہ خیال تھا کہ نبوت کا منصب اعظم اگر کسی کو ملتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو ملتا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ	اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو اترنا تھا تو ان دو شہروں (مکہ و طائف) میں سے کسی رئیس اعظم پر اترنا تھا (یعنی ولید بن ربیعہ یا ابو مسعود ثقفی)
(زخرف۔ ۴۳: ۳۱)	

عرب میں ریاست کے لئے دولت اور اولاد سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط تھی، اولاد کی نسبت اکثر وحشی قوموں میں (ہندوستان میں بھی) یہ خیال رہا ہے کہ جو شخص صاحب اولاد نہ ہو وہ عالم آخرت کی برکات سے محروم رہتا ہے۔

ہندوؤں میں بھی یہ خیال ہے کہ اولاد کے بغیر انسان کو پوری نجات نہیں مل سکتی۔

قریش میں اوصافِ مذکورہ کے لحاظ سے جو لوگ ریاست کا استحقاق رکھتے تھے، وہ ولید بن المغیرہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی، اور ابو مسعود ثقفی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف سے بالکل خالی تھے، دولت کے غبار سے آپؐ کا دامن پاک تھا، اور اولاد ذکور سال

دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔

تیسرا سبب قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی، جس کی وجہ یہ تھی ابرہۃ الاشرم (بادشاہ حبش) جو کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا، عیسائی تھا، یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلہ میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ ہوئے، چنانچہ یہ آیت اتری:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِہِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰہِ

(روم۔ ۳۰: ۲تا۴)

قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے لیکن یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر غالب آجائیں گے، خدا ہی کو اختیار ہے پہلے بھی اور پیچھے بھی، اور تب مسلمان اللہ کی مدد سے خوشی منائیں گے۔

اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا، اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا، ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔ قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یک دگر تھے، بنو ہاشم و بنو امیہ، عبدالمطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا، لیکن ان کے بعد اس خاندان میں کوئی صاحب اثر نہیں پیدا ہوا، ابو طالب دولتمند نہ تھے، عباس دولتمند تھے، لیکن فیاض نہ تھے، ابولہب بد چلن تھا، اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندان بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا، اس لئے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابو سفیان ہی نے برپا کیں، اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔

عقبۃ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا، اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپؐ کے دوش مبارک پر اونٹ کی اوجھ لاکر ڈالی تھی، اموی تھا،

بنو امیہ کے بعد جس قبیلہ کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا، وہ بنو مخزوم تھے، ولید بن المغیرہ اسی خاندان کا رئیس تھا، اس لئے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی، ابو جہل کی ایک تقریر سے اس بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے، ایک دفعہ اخنس بن شریق ابو جہل کے پاس گیا اور کہا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے" ابو جہل نے کہا ہم اور بنو عبد مناف (یعنی آلِ ہاشم) ہمیشہ حریف مقابل رہے، انہوں نے مہمان داریاں کیں تو ہم نے بھی کیں، انہوں نے خون بہا دیئے تو ہم نے بھی دیئے، انہوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں، یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا، تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعوے دار ہیں، خدا کی قسم ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہیں لا سکتے (۱)

پانچواں سبب

ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بد اخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے اربابِ اقتدار نہایت ذلیل بد اخلاقیوں کے مرتکب تھے۔

ابو لہب جو خاندانِ ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرمِ محترم کے خزانہ سے غزالِ زرّیں چرا کر بیچ ڈالا تھا (۲)، اخنس بن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف تھا اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمّام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر اربابِ جاہ مختلف قسم کے اعمالِ شنیعہ میں گرفتار تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بد اخلاقیوں پر سخت دارو گیر کرتے تھے، جس سے ان کی عظمت و اقتدار کی شاہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی، قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں، اور گو طریقہ بیان عام ہوتا تھا لیکن لوگ جانتے تھے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ

(قلم۔ ۶۸: ۱۰ تا ۱۴)

اور اس شخص کے کہنے میں نہ آنا جو بات بات میں قسم کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، طاعن ہے، چغلیاں لگاتا ہے، لوگوں کو اچھے کاموں سے روکتا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، بد ہے، تند خو ہے اور ان سب باتوں کے ساتھ جھوٹا نسب بتاتا ہے، اس لئے کہ وہ مالدار اور لڑکوں والا ہے۔

---

(۱) ابن ہشام ص ۱۰۸ مطبوعہ مصر۔ (۲) حرم میں ایک سونے کا ہرن مدت سے خزانہ میں محفوظ تھا، ابو لہب نے چرا کر فروخت کر دیا، یہ واقعہ عموماً تاریخوں میں مذکور ہے، ابن قتیبہ نے بھی معارف (ص ۵۵ مطبوعہ مصر) میں اس کا ذکر کیا ہے

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (علق۔ ۹۶: ۱۵،۱۶)

وہ سن رکھے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے جو کہ جھوٹی ہے اور خطا کار ہے

ممکن تھا کہ وعظ و پند کا نرم طریقہ اختیار کیا جاتا، لیکن مدت کی عربی نخوت، دولت و اقتدار کا فخر ریاست کا زعم ان چیزوں کے ہوتے ہوئے جب تک ضرب نہایت سخت نہ ہوتی وہ باخبر نہ ہوتے، اس لئے بڑے بڑے جبار اس طرح مخاطب کئے جاتے تھے:

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا وَّجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا وَبَنِينَ شُهُودًا وَّمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا، ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا۔ (مدثر۔ ۷۴: ۱۱ تا ۱۶)

ہم کو اور اس کو تنہا چھوڑ دو، میں نے اس کو پیدا کیا، پھر بہت سامال دیا بیٹے دیے، سامان دیا، پھر چاہتا ہے کہ ہم اس کو اور دیں، ہر گز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا دشمن ہے۔

یہ خطاب ولید بن مغیرہ کے ساتھ ہے، جو قریش کا سرتاج تھا، اور یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے ادا ہوتے تھے جس کو ظاہری جاہ و اقتدار حاصل نہ تھا۔

لیکن مخالفت کی جو سب سے بڑی وجہ تھی اور جس کا اثر تمام قریش بلکہ تمام عرب پر یکساں تھا یہ تھا کہ جو معبود سیکڑوں برس سے عرب کے حاجت روائے عام تھے اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام ان کا نام و نشان مٹاتا تھا، اور ان کی شان میں کہتا تھا:

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (انبیاء۔ ۲۱: ۹۸)

بلاشبہ تم اور جن چیزوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو سب دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔

قریش کے تحمل کے اسباب

ان اسباب کے ساتھ جن میں سے ہر ایک قریش کو سخت مشتعل کر دینے کے لئے کافی تھا، توقع یہ تھی کہ اعلان دعوت کے ساتھ سخت خوں ریزیاں شروع ہو جاتیں، لیکن قریش نے تحمل سے کام لیا، اور اس کے ناگزیر اسباب تھے، قریش خانہ جنگیوں میں تباہ ہو چکے تھے، اور حرب فجار کے بعد اس قدر عاجز آگئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے، قبیلہ پرستی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے، مقتول کا قبیلہ بغیر کسی تحقیق کے انتقام کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا، اور جب تک بدلا نہ لیا جائے، یہ آگ بجھ نہیں سکتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر آمادہ ہونا قریش کے لئے نہایت آسان تھا لیکن وہ

جانتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے، اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا، بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے، اور قریبا کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں، اس لئے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا، بلکہ سیکڑوں تھے، اور سب کا استیصال کرنا ممکن نہ تھا۔

روسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے، وہ بد نفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے، اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی (۱) سے طے ہو جائے۔

غرض جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان دعوت کیا اور بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززوں نے ابو طالب سے آکر شکایت کی، ابو طالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا، لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادائے فرض سے باز نہ آسکتے تھے، اس لئے سفارت دوبارہ ابو طالب کے پاس آئی، اس میں تمام رؤسائے قریش، یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابو سفیان، عاص بن ہشام، ابو جہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے۔ ان لوگوں نے ابو طالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آباو اجداد کو گمراہ کہتا ہے ہم کو احمق ٹھہراتا ہے، اس لئے یا تو تم بیچ سے ہٹ جاؤ، یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے، ابو طالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے، قریش اب تحمل نہیں کر سکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختصر لفظوں میں کہا کہ "جان عم! میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابو طالب تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے، آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، خدایا اس کام کو پورا کرے گا، یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا" آپ کی پُراثر آواز نے ابو طالب کو سخت متاثر کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "جا! کوئی شخص تیرا بال

(۱) (یہ آیت غالباً انہی لوگوں کی شان میں ہے، وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ ۚ (انعام۔۶:۲۶) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی سے تو لوگوں کو منع کرتے تھے، لیکن آپ کے دعوائے نبوت سے دور رہتے تھے۔ اصابہ ذکر ابی طالب بحوالہ عبدالرزاق) "س"

بیکا (۱) نہیں کر سکتا"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدستور دعوت اسلام میں مصروف ہوئے۔ قریش اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ نہ کر سکے۔ لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپؐ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپؐ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ قریش متحیر تھے کہ آپؐ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں، انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا خیال کر سکتا ہے۔ قریش نے بھی یہی خیال کیا، اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا "محمد کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں، اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارا زیر فرمان ہو جائے، لیکن ان باتوں سے باز آؤ"۔ عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا، لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپؐ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (فصلت۔ ۶:۴۱)	اے محمد کہدے کہ میں تمہیں جیسا آدمی ہوں مجھ پر وحی آئی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدا ہے، بس سیدھے اس کی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو۔
قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِىْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِىْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (فصلت۔ ۹:۴۱)	کہدے کہ کیا تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں یہ زمین پیدا کی، اور تم خدا کے شریک قرار دیتے ہو، یہی سارے جہان کا پروردگار ہے۔

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اس نے قریش سے جا کر کہہ دیا کہ "محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ جائیں گے تو یہ تمہاری ہی عزت ہے، ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا"۔ لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی۔

(۱) ابن ہشام صفحہ ۹۸۔ امام بخاری نے بھی تاریخ میں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حضرت حمزہؓ اور عمرؓ کا اسلام
سنہ ۶ نبویؐ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمام میں سے حضرت حمزہؓ کو آپؐ سے خاص محبت تھی، وہ آپؐ سے صرف دو۲ تین۳ برس بڑے تھے، اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا، اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے، وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، لیکن آپؐ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مذاقِ طبیعت سپہ گری اور شکار افگنی تھا کہ منھ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے دن دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے، قریش کے رؤسا، صحنِ حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے، حضرت حمزہؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس جاکر بیٹھ جاتے، اس طریقہ سے سب سے یارانہ تھا، اور سب لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخالفین جس بے رحمی سے پیش آتے تھے، بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا، ایک دن ابو جہل نے رو در رو آپؐ کے ساتھ نہایت گستاخیاں کیں، ایک کنیز دیکھ رہی تھی، حضرت حمزہؓ شکار سے آئے تو اس نے تمام ماجرا کہا، حضرت حمزہؓ غصہ سے بیتاب ہوگئے، تیر و کمان ہاتھ میں لئے حرم میں آئے اور ابو جہل سے کہا "میں مسلمان ہوگیا ہوں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوش حمایت میں انہوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعۃً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے، بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے (۱)، دو ہی چار روز کے بعد حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے۔

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں (۲) سال تھا کہ آفتاب رسالت طلوع ہوا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی، چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے، حضرت سعیدؓ کا

---

(۱) حضرت حمزہؓ کے اسلام کا واقعہ عموماً سب نے لکھا ہے، لیکن یہ اخیر واقعہ میں نے صرف روض الانف میں دیکھا

(۲) حضرت عمرؓ کا قبول اسلام میں الفاروق میں مفصل لکھ چکا تھا، اسی کو بعینہ یہاں نقل کر دیا ہے کہیں کہیں بعض بعض الفاظ یا جملے بدل دیئے ہیں، (جامع نے حضرت عمرؓ کے اسلام کے واقعہ کی دوسری روایتیں سیرۃ النبیؐ جلد سوم باب استجابت دعا میں مفصل درج کر دی ہیں، وہاں دیکھی جائیں)" س"

نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہو گئیں، اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے، ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے۔ لبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ "دم لے لوں تو پھر ماروں گا"۔ لبینہؓ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زد و کوب سے دریغ نہیں کرتے تھے، لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا، ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بد دل نہ کر سکے، آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود ذات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کا ارادہ کیا، تلوار کمر سے لگا سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے، کارکنانِ قضا نے کہا ع آمد آن یارے کہ ما می خواستیم۔

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہؓ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں، انہوں نے کہا "پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں"۔ فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن پڑھ رہی تھیں، ان کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں، اور قرآن کے اجزا چھپا لئے، لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی، بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی؟ بولیں کچھ نہیں، انہوں نے کہا میں سن چکا ہوں، تم دونوں مرتد ہو گئے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں ہوئے، اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ ان کا جسم لہو لہان ہو گیا، لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی، بولیں کہ "عمر جو بن آئے کرو لیکن اسلام اب دل سے نکل نہیں سکتا"۔ ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا، ان کے جسم سے خون جاری تھا، دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی، فرمایا تم لوگ جو پڑھ رہے تھے، مجھ کو بھی سناؤ، فاطمہؓ نے قرآن کے اجزاء لا کر سامنے رکھ دیئے، اٹھا کر دیکھا تو یہ سورہ تھی:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (حدید - ۵۷: ۱)

زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے خدا کی تسبیح پڑھتا ہے اور خدا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (حدید - ۵۷: ۷)

خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

تو بے اختیار پکار اٹھے کہ:

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا رّسول الله	میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، اور یہ کہ محمد خدا کے پیغمبر ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزیں تھے، حضرت عمرؓ نے آستانۂ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف گئے تھے صحابہؓ کو تردد ہوا لیکن حضرت امیر حمزہؓ نے کہا "آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے، ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا"۔ حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے، اور ان کا دامن پکڑ کے فرمایا" کیوں عمر کس ارادہ سے آیا ہے"؟ نبوت کی پر جلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ "ایمان لانے کے لئے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ اللّٰہ اکبر پکار اٹھے، اور ساتھ ہی تمام صحابہ نے مل کر اس زور سے اللّٰہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں (۱)۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے نے اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا کر دیا، اُس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے، عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہ سید الشہداءؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم مسلمان اپنے فرائضِ مذہبی علانیہ نہیں ادا کر سکتے تھے، اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا، حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے ساتھ دفعۃً یہ حالت بدل گئی، انہوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا، کافروں نے اوّل اوّل بڑی شدت کی، لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی،

ابن ہشام نے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی ان الفاظ میں روایت کیا ہے:

فلما اسلم عمر قاتل قريشا حتى صلى عند الكعبة و صلينا معه	جب عمر اسلام لائے تو قریش سے لڑے، یہاں تک کہ کعبہ میں نماز پڑھی اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی پڑھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اتفاق سے عاص بن وائل آنکلا، اس نے پوچھا کیا ہنگامہ ہے، لوگوں نے کہا عمر مرتد ہو گئے، عاص ابن وائل نے کہا اچھا تو کیا ہوا میں نے عمر کو پناہ دی۔

(۱) انساب الاشراف بلاذری و طبقات ابن سعد و اسد الغابہ و ابن عساکر و کامل ابن الاثیر۔

تعذیبِ مسلمین

رسوخِ عزم، قوت ارادہ، شدتِ عمل انسان کے اصلی جوہر ہیں اور داد کے قابل ہیں، لیکن انہی اوصاف کا رخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے رحمی، درندہ طبعی اور سفاکی کا مہیب قالب اختیار کر لیتے ہیں

اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ کو ان کے قبیلوں نے اپنے حصارِ حفاظت میں لے لیا، تو قریش کا طیش و غضب ہر طرف سے سمٹ کر ان غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، ان میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں، کچھ غریب الوطن تھے، جو دو ایک پشت سے مکہ میں آرہے تھے، اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے، جو کسی قسم کی عظمت و اقتدار نہیں رکھتے تھے، قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور و ستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔

یہ آسان تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سرزمینِ عرب دفعۃً پاک کر دی جاتی لیکن قریش کا نشۂ انتقام اس سے اتر نہیں سکتا تھا، مسلمان اگر اپنے مذہب پر ثابت قدم رہ کر پیوندِ خاک کر دیئے جاتے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی، اس سے زیادہ ان بیکسوں کا صبر و استقلال داد طلب ہوتا، قریش کی شان اس وقت قائم رہ سکتی تھی، جب یہ لوگ جادۂ اسلام سے پھر کر، پھر قریش کے مذہب میں آجاتے، یا شاید ان کو مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا، اور اس کی داد دینا منظور تھا۔

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل واقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مدتوں کا بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے، ان کے آبا و اجداد کی تحقیر کی جاتی ہے، قابلِ احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے، یہ لوگ صرف حسرت و افسوس کر کے رہ جاتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ چند خام طبعوں کے دماغ میں خلل آگیا ہے، عتبہ، عاص بن وائل وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے، لیکن ابو جہل، امیہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا۔

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے

بہر حال قریش نے جور و ظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کئے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتیلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے (۱)۔

(۱) یہ واقعات ابن سعد نے حضرت بلالؓ و صہیبؓ کے حال میں بہ تفصیل لکھے ہیں دیکھو کتاب مذکور جلد ثالث تذکرہ صحابہ بدرؓ۔

یہ مصیبتیں اگرچہ تمام بیکس مسلمانوں پر عام تھیں، لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے، ان کے نام یہ ہیں:۔

حضرت خبابؓ بن الارت تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیئے گئے تھے، ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانہ میں اسلام لائے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے گھر میں مقیم تھے، اور صرف چھ سات شخص اسلام لا چکے تھے، قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، اس پر چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے، خبابؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی (۱) [حضرت خبابؓ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ ان کی بقایا تھی، مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمدؐ کا انکار نہ کرو گے، ایک کوڑی نہ ملے گی، یہ کہتے کہ "نہیں جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں" (۲)۔]

حضرت بلالؓ یہ وہی حضرت بلالؓ ہیں جو موذن کے لقب سے مشہور ہیں، حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا، اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ! ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا، لیکن اس وقت بھی ان کی زبان سے "احد" کا لفظ نکلتا، جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا، وہ ان کو شہر کے اِس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹتے پھرتے، لیکن اب بھی وہی رٹ تھی احد احد۔

حضرت عمارؓ یمن کے رہنے والے تھے، ان کے والد "یاسر" مکہ میں آئے، ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سمیہؓ تھا، شادی کر دی، عمار اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے، تو ان سے پہلے صرف تین شخص اسلام لا چکے تھے، قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے، اور اس قدر مارتے کہ بیہوش ہو جاتے، ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

حضرت سمیہؓ حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں، ان کو ابو جہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور ہلاک ہو گئیں۔

حضرت یاسرؓ، حضرت عمارؓ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے۔

---

(۱) طبقات ابن سعد جلد سوم تذکرہ خبابؓ۔ (۲) صحیح بخاری صفحہ ۶۹۲ (ج ۲) "س"

حضرت صہیبؓ۔ یہ رومی مشہور ہیں، لیکن در حقیقت رومی نہ تھے۔ ان کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے ابلہ کے حاکم تھے، اور ان کا خاندان موصل میں آباد ہوا تھا۔ ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پر حملہ کیا اور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے ان میں حضرت صہیبؓ بھی تھے۔ یہ روم میں پلے، اس لئے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے۔ ایک عرب نے ان کو خرید اور مکہ میں لایا، یہاں عبداللہ بن جدعان نے ان کو خرید کر کے آزاد کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت اسلام شروع کی تو یہ اور عمار بن یاسرؓ ایک ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپؐ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہو گئے (۱)۔ قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے، کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے۔ جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا اپنا سارا مال و متاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو، انہوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔

حضرت ابو فکیہہؓ صفوان بن امیہ کے غلام تھے، اور حضرت بلالؓ کے ساتھ اسلام لائے، امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پانوں میں رسی باندھی، اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں، اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں، ایک "گبریلا" راہ میں جا رہا تھا، امیہ نے ان سے کہا "تیرا خدا یہی تو نہیں ہے"۔ انہوں نے کہا "میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے"۔ اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا، ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھ دیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔

حضرت لبینہؓ۔ یہ بیچاری ایک کنیز تھیں، حضرت عمرؓ (۲) اس بیکس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے، کہ "میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں"۔ وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں، کہ "اگر تم اسلام نہ لاؤ گے، تو خدا اس کا انتقام لے گا"۔

حضرت زنیرہؓ، حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں، اور اس وجہ سے حضرت عمرؓ (اسلام سے پہلے) ان کو جی کھول کر ستاتے، ابو جہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت نہدیہؓ اور ام عبیسؓ۔ یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں

---

(۱) ابن الاثیر ذکر تعذیب المستضعفین، ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ عمار اس وقت ایمان لائے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارقمؓ کے مکان میں چلے آئے تھے، اور جب کہ تیس شخص سے زیادہ اسلام لا چکے تھے۔ (۲) حضرت عمرؓ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔

سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں۔

حضرت ابو بکرؓ کے دفتر فضائل کا یہ پہلا باب ہے کہ انہوں نے ان مظلوموں میں سے اکثروں کی جان بچائی، حضرت بلالؓ، عامرؓ بن فہیرہؓ، لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ سب کو بھاری بھاری داموں پر خریدا، اور آزاد کر دیا۔

یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت سخت جسمانی اذیتیں پہنچائیں، ان سے کم درجہ پر وہ لوگ تھے، جن کو طرح طرح سے ستاتے تھے۔

حضرت عثمانؓ جو کبیر السن اور صاحب جاہ و اعزاز تھے، جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا (۱)، حضرت ابو ذرؓ جو ساتویں مسلمان ہیں، جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا (۲)، حضرت زبیر بن العوام جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا، جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے (۳)، حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی سعیدؓ بن زید جب اسلام لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا (۴)، لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں، ایک مسلمان کو بھی راہ حق سے متزلزل نہ کر سکیں، ایک نصرانی مورخ نے نہایت سچ لکھا:۔

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مسائل نے وہ درجہ نشۂ دینی کا آپؐ کے پیرؤوں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرؤوں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ .... جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشۂ دینی جاتا رہا، اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے .... برعکس اس کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپؐ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر دشمنوں پر آپؐ کو غالب کیا (۵)

ہجرتِ حبش سنہ ۵ نبوی

قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاں نثاران اسلامؓ کو ہدایت کی

[(۱) طبقات ترجمہ عثمان عفان۔ (۲) بخاری ج ۱ ص ۵۴۴ تا ۵۴۵، باب اسلام ابی ذرؓ (۳) ریاض النضرہ للمحب الطبری (۴) بخاری ص ۱۰۲۷، اس وقت تک حضرت عمرؓ اسلام نہیں لائے تھے] - س - (۵) پالو جی گاڈ فری ہگنس، ترجمہ اردو صفحہ ۶۶ و ۶۷ مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء۔

کہ حبش کو ہجرت کر جائیں، حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا، وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے، اہلِ عرب حبش کے فرماں روا کو نجاشی کہتے تھے (۱)۔ اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی۔

جاں نثارانِ اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا، لیکن مکہ میں رہ کر فرائضِ اسلام کا آزادی سے بجالانا ممکن نہ تھا، اس وقت تک حرمِ کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جب اسلام لائے تو انہوں نے کہا میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا، لوگوں نے منع کیا، لیکن وہ باز نہ آئے، حرم میں گئے اور مقامِ ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۂ رحمٰن پڑھنا شروع کیا، کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور ان کے منھ پر طمانچے مارنے شروع کئے، اگرچہ انہوں نے جہاں تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا، لیکن واپس گئے تو چہرہ (۲) پر زخم کے نشان لے کر گئے (حضرت ابو بکرؓ جاہ و اقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے، لیکن آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے، اور اسی بنا پر ایک بار ہجرت کے لئے آمادہ ہو گئے)۔ (۳)

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما سے اوّل اوّل گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت عثمانؓ (بن عفان)	مع اپنی زوجہ محترمہ (حضرت) رقیہؓ کے، جو رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی تھیں۔
۲۔ (حضرت) ابو حذیفہؓ بن عتبہ، مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) سہلہؓ (بنت سہیل) تھا۔	ان کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا، لیکن چونکہ سخت کافر تھا، اس لئے ان کو گھر چھوڑنا پڑا۔
۳۔ (حضرت) زبیر بن العوامؓ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی اور مشہور صحابی تھے۔

(۱) نجاشی حبشی لفظ نجوش کی تعریب ہے، جس کے معنی حبشی میں بادشاہ کے ہیں، نجاشی کا نام اصحمہ تھا۔ بخاری باب موت النجاشی) "س" (۲) طبری (صفحہ ۱۱۸۸ جلد ۳) "س"] (۳) بخاری باب ہجرت مدینہ ["س"

۴۔ (حضرت) مصعب بن عمیرؓ	ہاشم کے پوتے تھے۔
۵۔ (حضرت) عبدالرحمن بن عوفؓ	مشہور صحابی اور عشرہ مبشرہ میں شمار کئے جاتے ہیں، قبیلہ زہرہ سے تھے اور اس بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ننہالی رشتہ دار تھے۔
۶ (حضرت) ابو سلمہؓ (ابن عبدالاسد) مخزومی مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہؓ (بنت ابی امیہؓ کے)	یہ ام سلمہؓ وہی ہیں جو ابو سلمہ کے مرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں۔
۷۔ (حضرت) عثمانؓ بن مظعون جمحی	مشہور صحابی ہیں۔
۸۔ (حضرت) عامر بن ربیعہؓ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام (حضرت) لیلیٰؓ (بنت ابی حشمہ تھا)	سابقینِ اولین میں ہیں، بدر میں بھی شریک تھے، حضرت عثمانؓ نے سفر حج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ (اصابہ)
۹۔ (حضرت) ابو سبرۃ بن ابی رہمؓ	ان کی ماں برۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں، یہ سابقین فی الاسلام میں ہیں، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت ثانیہ میں گئے تھے۔
(یا) (۱)	

(۱) (حبشہ کے مہاجرینِ اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے۔

ابن اسحاق نے مردوں میں انہی دس آدمیوں کا نام لیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ہجرت اولیٰ میں نہیں بلکہ ہجرت ثانیہ میں تھے'' (فتح الباری ج، ص ۱۴۳) واقدی نے مردوں میں گیارہ صاحبوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے ''اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابو سبرۃؓ اور حضرت ابو حاتمؓ دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحاق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں'' اس سلسلہ میں واقدی سے ایک بڑی فروگذاشت یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبش بتلایا، لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی تو اس میں بارہ آدمیوں کا نام لیا، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی اضافہ کیا'' (زرقانی علی المواہب ج اول ص ۳۱۴) حافظ ابن حجر نے واقدی کی اس فروگذاشت پر گرفت کی ہے'' (فتح الباری ج، ص ۱۴۳) ابن سعد نے انہی تمام مہاجرین کا نام لیا ہے جن کا ذکر واقدی نے کیا ہے'' (ابن سعد اول ص ۱۳۶) ابن سید الناس نے بھی بہ روایت زہری بارہ آدمیوں کا ذکر کیا ہے، مگر انہوں نے حضرت زبیرؓ کے بجائے حضرت سلیط بن عمرو کا نام لیا ہے (عیون الاثر اول صفحہ ۱۱۵) بعض دوسرے سیرت نگار جو بارہ مرد مہاجرین کو تسلیم کرتے ہیں، وہ حضرت حاطب بن عمرو اور حضرت سہیلؓ بن بیضاء کے بجائے حضرت حاطبؓ بن حارثؓ اور حضرت ہاشم بن عمروؓ کا نام لیتے ہیں'' (زرقانی اول ص ۳۱۴) اسی طرح ہجرت کرنے والی خواتین میں بعض لوگ حضرت ابو سبرۃؓ کی بیوی حضرت ام کلثوم بنت سہیلؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ حضرت ام ایمنؓ کا اضافہ کرتے ہیں) ''س''

(حضرت ابو) حاطب بن عمروؓ	بدر میں شریک تھے، امام زہری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے انہی نے ہجرت کی، (اصابہ)
۱۰۔ (حضرت) سہیل بن بیضاءؓ	
۱۱۔ (حضرت) عبداللہ بن مسعودؓ	مشہور صحابی اور مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں۔

ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا، حسن اتفاق یہ کہ جب یہ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جا رہے تھے، جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھا لیا، ہر شخص کو صرف ۵ درہم دینے پڑے، قریش کو خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے، لیکن موقع نکل چکا تھا (۱)۔

عام مورخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا، لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، حضرت عثمانؓ بنو امیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحبِ اقتدار خاندان تھا، متعدد بزرگ مثلاً زبیرؓ اور مصعبؓ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہیں، عبدالرحمن بن عوفؓ اور ابو سبرہؓ معمولی لوگ نہ تھے، اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بیکسوں پر محدود نہ تھا، بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے، اور جن کو انگاروں کے بستر پر سونا پڑا تھا، یعنی حضرت بلالؓ، عمارؓ، یاسرؓ وغیرہ، ان لوگوں کا نام مہاجرین حبش کی فہرست میں نظر نہیں آتا، اس لئے یا تو ان کی بے سروسامانی اس حد تک پہنچی تھی کہ سفر کرنا بھی ناممکن تھا، یا یہ کہ درد کے لذت آشنا تھے، اور اس لطف کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔

دلم ز جور تو آسودہ است دمی نالم　　که غیر پے نہ برد لذت خدنگ ترا

نجاشی کے بدولت مسلمان حبش میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے، لیکن قریش یہ خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے، آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو، عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اس کام کے لئے منتخب ہوئے (۲)، نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے

(۱) یہ تمام تفصیل طبری میں ہے۔ (۲) (مسند احمد ج ۱ ص ۲۰۲) "س"

لئے گراں بہا تحفے مہیا کئے گئے (١)، اور نہایت سر و سامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی، یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے، کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق جو درخواست پیش کریں آپ بھی ہماری تائید فرمائیں، دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالہ کر دیئے جائیں، درباریوں نے بھی تائید کی، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا "تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے، جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے"۔

مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لئے حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کو انتخاب کیا، انہوں نے اس طرح تقریر شروع کی:

ایہا الملک! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوں ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے، اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی، اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں واپس آجائیں"۔

نجاشی نے کہا "جو کلامِ الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو"۔ حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، پھر کہا "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں"۔ یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا، "تم واپس جاؤ میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا"۔

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں، ان لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰؑ

(١) ابن ہشام نے لکھا ہے کہ مکہ کا بڑا تحفہ چمڑا تھا، اور کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل مکہ شام وغیرہ کو جو مالِ تجارت لے جاتے تھے وہ بھی چمڑا ہوتا تھا، (مسند امام ابن حنبل میں تصریح ہے کہ یہ تحفہ چمڑا ہی تھا مسند اہل البیت)

کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے ناراض ہو جائے گا، حضرت جعفرؓ نے کہا کچھ ہو، ہم کو سچ بولنا چاہئیے۔

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے۔ نجاشی نے کہا تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے کہا "ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ "عیسیٰ خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے"۔ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھالیا اور کہا "واللہ جو تم نے کہا عیسیٰ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں" (۱)۔ بطریق جو دربار میں موجود تھے، نہایت برہم ہوئے، نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی، نجاشی نے ان کے غصہ کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے (۲)۔

اسی اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا، نجاشی اس کے مقابلہ کے لئے خود گیا، صحابہ نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لئے آئیں، حضرت زبیرؓ اگرچہ سب سے زیادہ کم سن تھے، لیکن انہوں نے اس خدمت کے لئے اپنے کو پیش کیا، مشک کے سہارے دریائے نیل تیر کر رزمگاہ میں پہنچے، اُدھر صحابہؓ نجاشی کی فتح کے لئے خدا سے دعا مانگتے تھے، چند روز کے بعد حضرت زبیرؓ واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی (۳)۔

حبش میں کم و بیش ۸۳ مسلمان ہجرت کر کے گئے، چند روز آرام سے گذرنے پائے تھے، کہ

---

(۱) (مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰ کتاب التفسیر) "س" (۲) مارگولس صاحب نے ہجرت حبش کی بھی بڑی نازک اور دور از نظر وجہ تلاش کر کے پیدا کی ہے، فرماتے ہیں کہ "جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کے گرانے کے لئے ابرہۃ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا، اس لئے انہوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹ جائے اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا، لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا، مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا، اس بنا پر ارادے سے باز رہے"۔ یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔

صاحب موصوف کو حضرت جعفرؓ کی تقریر و مکالمت میں اس بنا پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا، حالانکہ اس زمانہ میں (اولاً تو) عربی زبان عام طور سے حبش میں بے تکلف لوگ سمجھ سکتے تھے، (کہ یہ دونوں زبانیں باہم نہایت قریب ہیں، ثانیاً درباروں میں ترجمان ہوتے تھے، جیسا کہ ابوسفیان، اور قیصر روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے۔ بخاری باب بدء الوحی) "س" (۳) یہ تمام واقعات مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۲ میں مذکور ہیں، ابن ہشام نے بھی تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن طبری اور ابن سعد نے حضرت جعفرؓ اور نجاشی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا ہے، امام ابن حنبل اور ابن ہشام کا سلسلہ روایت یہ ہے محمد بن اسحاق، زہری، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحرث بن ہشام مخزومی، ام سلمہؓ، یہ سب رواۃ ثقہ ہیں اور سب سے اخیر راوی حضرت ام سلمہؓ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور خود اس واقعہ میں شریک تھیں، وہ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں نہیں آئی تھیں، بلکہ اپنے پہلے شوہر ابوسلمہ بن عبدالاسد کے ساتھ حبش میں ہجرت کر کے گئی تھیں، مورخ یعقوبی نے بھی بہ تفصیل یہ واقعہ لکھا ہے۔

یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے، یہ سن کر اکثر صحابہؓ نے مکہ معظمہ کا رخ کیا، لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا، کہ یہ خبر غلط ہے، اس لئے بعض لوگ واپس چلے گئے، اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں گئے۔

یہ روایت طبری اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے، اور ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن ان کتابوں میں اس خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے، کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی، کفار بھی موجود تھے، جب آپؐ نے یہ آیت پڑھی وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی (نجم۔ ۵۳: ۲۰) تو شیطان نے آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے:

تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی	یعنی (یہ بت) معظم و محترم ہیں، اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپؐ کی متابعت کی۔ (اس روایت کا یہ آخری حصہ کہ چند کافروں کے سوا تمام جن وانس نے حضورؐ کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا، صحیح ہے، جیسا کہ صحیح بخاری باب (۱) (قَوْلُهٗ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا) میں مذکور ہے، مگر باقی) قصہ بیہودہ اور ناقابل ذکر ہے، اور اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی (۲) نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے، ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر (۳) شہرت عام رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمال فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے، اس روایت کی صحت پر اصرار ہے، چنانچہ لکھتے ہیں: (۴)

وقد ذکرنا ان ثلاثة اسانید منھا علی شرط الصحیح وھی مراسیل یحتج بمثلھا من یحتج بالمراسیل	ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ روایتیں مرسل ہیں اور ان سے وہ لوگ استدلال کر سکتے ہیں، جو مرسل روایتوں کے قائل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار مکہ کی عادت تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید

---

(۱) (کتاب التفسیر سورہ نجم "س-") (۲) دیکھو زرقانی بر مواہب لدنیہ و شفائے قاضی عیاض و عینی شرح بخاری تفسیر سورہ نجم و نور النبراس، علامہ نووی کے یہ الفاظ ہیں، لا یصح فیہ شی لا من جھة النقل ولا من جھة العقل اور علامہ عینی لکھتے ہیں فلا صحة لہ نقلا ولا عقلا (۳) دیکھو مواہب لدنیہ اور زرقانی واقعہ ہجرت حبشہ (۴) زرقانی بر مواہب جلد اول صفحہ ۳۳۰۔

کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے اور اپنی طرف سے فقرے ملا دیتے۔ قرآن مجید کی آیتِ ذیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے:

لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (فصلت۔ ۴۱: ۲۶)	اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گڑبڑ کردو شاید تم غالب آؤ۔

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرے کہتے جاتے (۱):

واللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری فانھن الغرانیق العلے وان شفاعتھن لترتجی	لات اور عزیٰ اور تیسرے بت مناۃ کی قسم یہ بلند و بزرگ ہیں، اور ان کی شفاعت کی امید ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورہ والنجم کی وہ آیتیں پڑھیں تو کسی شیطان (کافر) نے یہی فقرے آپؐ کی آواز میں ملا کر پڑھ دیئے ہوں گے۔ دور کے لوگوں کو (کفار میں سے) شبہہ ہوا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے وہ الفاظ ادا کئے۔ اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانوں میں ہوا ہوگا، تو لوگوں نے کہا ہوگا کہ کسی شیطان نے آپؐ کی طرف سے وہ فقرے کہہ دیئے ہوں گے۔ اس واقعہ نے روایتوں میں صورت بدل بدل کر یہ صورت اختیار کرلی کہ شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے، اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے، اس لئے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کرلیا۔

یہ صرف قیاس نہیں بلکہ اگلے محققین نے بھی تصریح کی ہے۔ مواہب میں ہے:

قیل انه لما وصل الی قوله ومنٰوۃ الثالثۃ الاخری خشی المشرکون ان یاتی بعدھا بشئی یذم آلھتھم فبادروا الی ذلک الکلام فخلطوہ فی تلاوۃ النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم علی عادتھم فی قولھم لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیه او المراد بالشیطان شیطان الانس۔	بعض لوگوں نے کہا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پر پہنچے وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الاخریٰ تو مشرکوں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اب ان کے معبودوں کی کچھ برائی کا بیان ہوگا، اس بنا پر انہوں نے جھٹ سے آنحضرتؐ کی تلاوت میں یہ فقرے خلط کرکے پڑھ دیئے، جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے کہ قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑبڑ مچا دو۔ یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے۔

(۱) معجم البلدان لفظ عزّیٰ،

جو لوگ حبش سے واپس آگئے تھے، اہلِ مکہ نے اب ان کو اور زیادہ ستانا شروع کیا، اور اس قدر اذیت دی کہ دوبارہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، لیکن اب کی ہجرت کچھ آسان نہ تھی، کفار نے سخت مزاحمت کی تاہم جس طرح ہو سکا بہت سے صحابہ جن کی تعداد قریباً سو تک پہنچتی ہے، مکہ سے نکل گئے، اور حبش میں اقامت اختیار کی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تو کچھ لوگ فوراً واپس چلے آئے اور جو لوگ رہ گئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۷ھ میں ان کو بلا لیا (۱)۔

کفار کی ایذا و تعدی اب کمزوروں اور بیکسوں پر محدود نہ تھی، حضرت ابو بکرؓ کا قبیلہ معزز اور طاقتور قبیلہ تھا، ان کے یاور اور انصار بھی کم نہ تھے، تاہم وہ بھی کفار کے ظلم سے تنگ آگئے، اور بالآخر حبش کی ہجرت کا ارادہ کیا، برک الغماد جو مکہ معظمہ سے یمن کی سمت پانچ دن کی راہ ہے (۲)، وہاں تک پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہو گئی جو قبیلہ قارہ کا رئیس تھا، اس نے پوچھا کہاں؟ حضرت ابو بکرؓ نے کہا "میری قوم مجھ کو رہنے نہیں دیتی، چاہتا ہوں کہ کہیں الگ جا کر خدا کی عبادت کروں"۔ ابن الدغنہ نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا کہ تم جیسا شخص مکہ سے نکل جائے، میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں" تو حضرت ابو بکرؓ اس کے ساتھ واپس آئے، ابن الدغنہ مکہ پہنچ کر تمام سرداران قریش سے ملا، اور کہا کہ ایسے شخص کو نکالتے ہو جو مہمان نواز ہے، مفلسوں کا مددگار ہے، رشتہ داروں کو پالتا ہے، مصیبتوں میں کام آتا ہے، قریش نے کہا لیکن شرط یہ ہے کہ ابو بکرؓ نمازوں میں چپکے جو چاہیں پڑھیں، آواز سے قرآن پڑھتے ہیں تو ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر پڑتا ہے، حضرت ابو بکرؓ نے چند روز یہ پابندی اختیار کی، لیکن آخر انہوں نے گھر کے پاس ایک مسجد بنا لی، اور اس میں خضوع و خشوع کے ساتھ بہ آواز بلند قرآن پڑھتے تھے، وہ نہایت رقیق القلب تھے، قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے، عورتیں اور بچے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے، قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی، اس نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ اب میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا، حضرت ابو بکرؓ نے کہا "مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے، میں تمہارے جوار سے استعفا دیتا ہوں" (۳)۔

(۱) یہ تمام تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے، بعض مورخوں نے اس ہجرت ثانیہ کا ذکر نہیں کیا، اور بعض نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (۲) زرقانی بر مواہب جلد اول صفحہ ۳۲۴ ذکر ہجرت ثانیہ حبش۔ (۳) یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب ہجرت مدینہ میں ہے۔

محرم سنہ نبوی
شعب ابو طالب میں محصور ہونا

قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، عمرؓ اور حمزہؓ جیسے لوگ ایمان لا چکے، نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی، سفرا بے نیلِ مرام واپس آئے۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لئے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ "کوئی شخص نہ خاندانِ بنی ہاشم سے قرابت کرے گا، نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لئے حوالہ نہ کر دیں"۔ (۱) یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا، اور در کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

ابو طالب مجبور ہو کر تمام خاندانِ ہاشم کے ساتھ شعب ابو طالب (۲) میں پناہ گزیں ہوئے، تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی، یہ زمانہ ایسا سخت گذرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں جو صحابہؓ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے، یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، چنانچہ سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے۔ حضرت سعد بن وقاصؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا (۳)۔

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے، لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا، ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے، راہ میں ابو جہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا، اتفاق سے ابو البختری کہیں سے آ گیا، وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ "ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لئے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے"۔

متصل تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آلِ ہاشم نے مصیبتیں جھیلیں۔ بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود انہی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک

---

(۱) اس معاہدہ کا ذکر طبری نے اور ابن سعد وغیرہ نے تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن یہ الفاظ کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں۔ (۲) یہ پہاڑ کا ایک درہ تھا، جو خاندان بنو ہاشم کا موروثی تھا۔
(۳) روض الانف۔

ہوئی، ہشام عامری خاندان بنی ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا، ایک دفعہ وہ زہیر کے پاس جو عبد المطلب کے نواسے تھے، گیا اور کہا "کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو، ہر قسم کا لطف اٹھاؤ، اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو"؟ زہیر نے کہا "کیا کروں تنہا ہوں ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں" ہشام نے کہا میں موجود ہوں، دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے، ابو البختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا، دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے، زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "اے اہلِ مکہ! یہ کیا انصاف ہے کہ ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو، خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا"۔ ابو جہل برابر سے بولا "ہرگز اس معاہدہ میں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا" زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے، جب یہ لکھا گیا تھا، اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے، غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی، مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابو البختری، زہیر سب ہتھیار باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے، اور ان کو درہ سے نکال لائے (۱)، بقول ابن سعد یہ سنہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے، اسی زمانہ میں معراج واقع ہوئی، جس کی تفصیل تیسرے حصہ میں آئے گی، اسی زمانہ میں نماز پنجگانہ فرض ہوئی۔

سنہ ۱۰ نبوی، حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب شعب ابو طالب سے نکلے تھے، اور چند روز قریش کے جور و ظلم سے امان ملی تھی کہ ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔

ابو طالب کی وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے، ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے، آپؐ نے فرمایا "مرتے مرتے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیجیے کہ میں خدا کے یہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں"۔ ابو جہل اور ابن ابی امیہ نے کہا "ابو طالب! کیا تم عبد المطلب کے دین سے پھر جاؤ گے" بالآخر ابو طالب نے کہا "میں عبد المطلب کے دین پر مرتا ہوں"۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے کہا "میں وہ کلمہ کہہ دیتا، لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا"۔ آپؐ نے فرمایا "میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کروں گا، جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کر دے" (۲)۔

---

(۱) یہ تفصیل ابن ہشام، طبری وغیرہ میں مذکور ہے، "اخیر واقعہ صرف ابن سعد نے بیان کیا ہے۔ (۲) (حاشیہ صفحہ ۱۶۸ پر دیکھئے)

یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مرتے وقت ابو طالب کے ہونٹ ہل رہے تھے، حضرت عباسؓ نے (جو اس وقت تک کافر تھے) کان لگا کر سنا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "تم نے جس کلمہ کے لئے کہا تھا، ابو طالب وہی کہہ رہے ہیں" (۱)۔

اس بنا پر ابو طالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے، لیکن چونکہ بخاری کی روایت عموماً صحیح تر مانی جاتی ہے، اس لئے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں۔

لیکن محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابلِ حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیبؓ ہیں، جو فتح مکہ میں اسلام لائے، اور ابو طالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے، اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے، کہ "روایت مرسل ہے" (۲)۔ ابن اسحاق کے سلسلہ روایت میں عباس بن عبداللہ بن معبد، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں، یہ دونوں ثقہ ہیں، لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے، اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجۂ استناد میں چنداں فرق نہیں (۳)۔

ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو جاں نثاریاں کیں، اس سے کون انکار کر سکتا ہے، وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپؐ پر نثار کرتے تھے، آپؐ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا، آپؐ کی خاطر محصور ہوئے، فاقے اٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا، کیا یہ محبت، یہ جوش، یہ جاں نثاریاں سب ضائع جائیں گی۔

ابو طالب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷) صحیح بخاری باب الجنائز اور مسلم، ابو طالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں۔

(۱) ابن ہشام مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۶۔ (۲) عینی کتاب الجنائز (ج ۴ صفحہ ۲۰۰) "س" (۳) (مصنف کے اس نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے، اس لئے کہ بخاری کی روایت کے آخر راوی حضرت مسیبؓ ہیں، جو صحابی ہیں، ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہوگی، اسی لئے مراسیل صحابہ حجت ہیں اور ابن اسحاق کی روایت منقطع ہے اور چھوٹا ہوا راوی صحابی نہیں ہے، خود ابن اسحاق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے، اس لئے دونوں روایتوں کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا۔

علاوہ بریں حضرت مسیبؓ کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباسؓ کی وہ روایت ہے، جو اسی مسیب والی روایت سے اوپر صحیح بخاری میں موجود ہے، جس میں ذکر ہے کہ حضرت عباسؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ آپ کے چچا (ابو طالب) کو آپ سے کیا فائدہ پہنچا کہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے، اور آپ کے لئے آپ کے دشمنوں سے برسرِ پرخاش رہتے تھے، فرمایا وہ دوزخ کی آگ میں صرف ٹخنے تک ہیں، مگر اس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے، اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباسؓ کے علم میں تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہیں ہوا، اسی مضمون کی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی ہے، جو صحیح بخاری باب قصہ ابی طالب میں اسی موقع پر موجود ہے۔ "س")

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے نہایت محبت تھی۔ ایک دفعہ وہ بیمار پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لئے گئے تو انہوں نے کہا "بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا نہیں مانگتا کہ مجھ کو اچھا کر دے"۔ آپؐ نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا خدا تیرا کہنا مانتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانیں تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے (۱)۔

ابو طالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی وفات کی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے ابو طالب سے پہلے انتقال کیا۔ اب آپؐ کے مددگار اور غم گسار دونوں اٹھ گئے۔ صحابہ خود اپنی حالت میں مبتلا تھے، یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے۔ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (سالِ غم) فرمایا کرتے تھے (۲)۔

حضرت خدیجہؓ نے رمضان سنہ ۱۰ نبوی میں وفات کی۔ ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی۔ مقام حجون میں دفن کی گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی قبر میں اترے۔ اس وقت تک نمازِ جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی (۳)۔

ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کے اٹھ جانے کے بعد قریش کو کس کا پاس تھا۔ اب وہ نہایت بے رحمی و بے باکی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستاتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ راہ میں جا رہے تھے، ایک شقی نے آ کر فرق مبارک پر خاک ڈال دی۔ اسی حالت میں آپؐ گھر میں تشریف لائے، آپؐ کی صاحبزادی نے دیکھا تو پانی لے کر آئیں، آپؐ کا سر دھوتی تھیں اور جوشِ محبت سے روتی جاتی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "جانِ پدر! رو نہیں۔ خدا تیرے باپ کو بچا لے گا" (۴)۔

اہلِ مکہ سے تو قطعی ناامیدی تھی، اس لئے آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں دعوتِ اسلام فرمائیں، طائف میں بڑے بڑے امرا اور اربابِ اثر رہتے تھے۔ ان میں عمیر کا خاندان رئیس القبائل تھا، یہ تین بھائی تھے، عبد یالیل، مسعود حبیب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ ان تینوں نے جو جواب دیئے وہ نہایت عبرت انگیز تھے، ایک نے کہا "اگر تجھ کو خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو کعبہ کا پردہ چاک کر رہا ہے"۔

---

(۱) اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ابی طالب۔ (۲) مواہب لدنیہ۔ (۳) یہ تفصیل ابن سعد میں ہے۔ (۴) طبری اور ابن ہشام ذکر وفات حضرت خدیجہؓ۔

دوسرے نے کہا "کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور نہیں ملتا تھا"۔ تیسرے نے کہا "میں بہرحال تجھ سے بات نہیں کر سکتا تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلافِ ادب ہے، اور جھوٹا ہے تو گفتگو کے قابل نہیں"۔

ان بدبختوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، طائف کے بازاریوں کو ابھار دیا کہ آپؐ کی ہنسی اڑائیں، شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، یہ مجمع دو رویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا، جب آپؐ اُدھر سے گذرے تو آپؐ کے پاؤں پر پتھر مارنے شروع کئے، یہاں تک کہ آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں، جب آپؐ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے، جب آپؐ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے، اور تالیاں بجاتے جاتے (۱)، آخر آپؐ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی، یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا، جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا، اس نے آپؐ کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا، انگور کا خوشہ ایک کشتی میں رکھ کر بھیجا۔

اس سفر میں حضرت زید بن حارثہؓ بھی ساتھ تھے (۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ میں قیام کیا، پھر حراء میں تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے سکتے ہو، عرب کا شعار تھا کہ جب کوئی ان سے طالب حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا انکار نہیں کر سکتے تھے، مطعم نے یہ درخواست منظور کی، بیٹوں کو بلا کر کہا کہ "ہتھیار لگا کر حرم میں جاؤ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف لائے، مطعم اونٹ پر سوار ساتھ تھا، حرم کے پاس آیا، تو پکارا کہ "میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پناہ دی ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں آئے، نماز ادا کی اور دولت خانہ کو واپس گئے، مطعم اور اس کے بیٹے آپؐ کو تلواروں کے سائے میں لائے (۳)۔

---

(۱) یہ پوری تفصیل مواہب لدنیہ بحوالہ، موسیٰ بن عقبہ اور طبری و ابن ہشام میں ہے۔ (۲) کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف نگاہوں کو کس طرح مختلف نظر آتا ہے، مرگیولس نے (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو سوءِ تدبیر میں داخل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "طائف مکہ سے بالکل قریب اور ان کے زیرِ اثر تھا اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے، جس کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی، اس لئے جب مکہ کے تمام رؤسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھے، تو طائف کے لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی"۔ لیکن سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زور اعتقاد اور اعتماد علی النفس تھا کہ باوجود تمام ناکامیوں کے وہ تنہا ایک مخالف شہر میں گئے اور تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا۔

ع والفضل ما شهدت به الاعداء، (۳) ابن سعد صفحہ ۱۴۲ کسی قدر تفصیل مواہب لدنیہ سے اضافہ کی گئی ہے، جو ابن اسحاق کی روایت ہے، تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ حالات قلم انداز کئے ہیں۔

مطعم نے کفر کی حالت میں غزوۂ بدر سے پہلے وفات کی، حضرت حسانؓ جو دربارِ رسالت کے شاعر تھے، انہوں نے مرثیہ لکھا، زرقانی نے یہ مرثیہ بدر میں نقل کیا ہے (۱)، اور لکھا ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں، مطعم کا یہ کام بے شبہ مدح کا مستحق تھا، لیکن آج کل کے مسلمان حضرت حسانؓ اور زرقانی سے زیادہ شیفتہء اسلام ہیں، اس لئے معلوم نہیں حضرت حسانؓ کا یہ فعل آج بھی پسند کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

قبائل کا دورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا، جب حج کا زمانہ آتا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آ آکر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپؐ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے، جن میں دور دور کے قبائل آتے تھے، آپؐ ان میلوں میں جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے۔

ان میلوں میں سے عکاظ جو اہل عرب کا قومی اور علمی دنگل تھا، اور مجنۃ اور ذوالمجاز کا نام مورخین نے خاص طور پر لیا ہے، قبائلِ عرب میں سے بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرۃ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نضر، کندۃ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ، مشہور قبائل ہیں (۲)۔ ان سب قبائل کے پاس آپؐ تشریف لے گئے، لیکن ابو لہب ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتا، اور جب آپؐ کسی مجمع میں تقریر کرتے تو برابر سے کہتا کہ "دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے" (۳)

بنی حنیفہ یمامہ میں آباد تھے، ان لوگوں نے نہایت تلخی کے ساتھ جواب دیا، (۴) مسیلمہ کذاب جس نے آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کیا، اسی قبیلہ کا رئیس تھا۔

قبیلۂ بنو ذہل بن شیبان کے پاس جب آپؐ گئے تو حضرت ابو بکرؓ بھی ساتھ تھے، حضرت ابو بکرؓ نے مفروق سے کہا "تم نے کسی پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے؟ وہ یہی ہیں" مفروق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کر کے کہا کہ "برادر قریش! تم کیا تلقین کرتے ہو"؟ آپؐ نے فرمایا "خدا ایک ہے، اور میں اس کا پیغمبر ہوں" اور یہ آیتیں پڑھیں:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ	کہہ دو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ خدا نے کیا
اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ	چیزیں حرام کی ہیں، یہ کہ خدا کے ساتھ کسی
اِحْسَانًا، وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ	کو شریک نہ کرو، اور والدین کا حق خدمت
اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا	بجالاؤ، اور اپنے بچوں کو افلاس کے خیال

(۱) زرقانی جلد اول صفحہ ۳۱۶۔ (۲) ابن سعد نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے۔ (۳) (مستدرک حاکم جلد اول ص ۱۵ حیدر آباد) ۱۳۱۵ھ (۴) ابن ہشام

تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (انعام-۶:۱۵۱)

سے قتل نہ کرو، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیں گے، فحش باتوں کے پاس نہ جاؤ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور آدمی کی جان جس کو خدا نے حرام کیا ہے ناحق ہلاک نہ کرو، یہ تم کو خدا نے وصیت کی تاکہ تم سمجھ سکو۔

اس قبیلہ کے رؤسا، مفروق، مثنیٰ اور ہانی بن قبیصہ تھے، اور وہ سب اس موقع پر موجود تھے، ان لوگوں نے کلام کی تحسین کی، لیکن کہا کہ "مدتوں کا خاندانی دین دفعۃً چھوڑ دینا زود اعتقادی ہے، اس کے علاوہ ہم کسریٰ کے زیر اثر ہیں اور معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم اور کسی کے اثر میں نہ آئیں گے"۔ آپ نے ان کی راست گوئی کی تحسین کی، اور فرمایا کہ "خدا اپنے دین کی آپ مدد کرے گا" (۱)

قبیلہ، بنو عامر کے پاس گئے تو ایک شخص نے جس کا نام (بحیرہ بن) فراس تھا، آپ کی تقریر سن کر کہا "یہ شخص مجھ کو ہاتھ آجائے تو میں تمام عرب کو مسخر کر لوں" پھر آپ سے پوچھا کہ "اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آجاؤ تو تمہارے بعد ریاست ہم کو ملے گی"۔ آپ نے فرمایا "یہ خدا کے ہاتھ ہے" اس نے کہا "ہم اپنا سینہ عرب کا آماج گاہ بنائیں اور حکومت غیروں کے ہاتھ آئے، ہم کو یہ غرض نہیں" (۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی

اسباب مذکورہ بالا کی بنا پر قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی، اور چاہا کہ آپ کو اس قدر ستائیں کہ آپ مجبور ہو کر تبلیغ اسلام سے دست بردار ہو جائیں، سوء اتفاق یہ کہ جو کفار آپ کے ہمسایہ تھے، یعنی ابو جہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص سب قریش کے سر برآوردہ رؤسا تھے، اور یہی سب سے بڑھ کر آپ کے دشمن تھے (۳) یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن پر اوجھڑی لاکر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں، (آپ کی روحانی قوت اثر کو دیکھ کر لوگ جادو گر

(۱) روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت۔ | (۲) طبری ج ۳ ص ۱۲۰۵] "س"۔ (۳) ابن سعد جلد اول صفحہ ۱۳۲۔

کہتے ۔ دعوائے نبوت کو سن کر مجنوں کہتے ۔ باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے (۱) ۔ نماز جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے تو قرآن ۔ قرآن کے لانے والے (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کے اتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے) (۲) ۔

ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے ۔ روسائے قریش بھی موجود تھے ۔ ابو جہل نے کہا " کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا " عقبہ نے کہا " یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں " چنانچہ اوجھ لاکر آپؐ کی گردن پر ڈال دی ۔ قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے ، کسی نے جاکر حضرت فاطمہؓ کو خبر کی ۔ وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں ۔ لیکن جوشِ محبت سے دوڑی آئیں ۔ اور اوجھ ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا ۔ اور بد دعائیں دیں " (۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کہیں کسی مجمع عام میں دعوت اسلام کا وعظ فرماتے تو ابو لہب آپؐ کے ساتھ برابر سے کہتا جاتا کہ " یہ جھوٹ کہتا ہے " ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اسلام نہیں لاچکا تھا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار ذوالمجاز میں گئے اور مجمع میں گھس کر لوگوں سے کہا کہ " لا الہ الا اللہ کہو " ابو جہل آپؐ پر خاک پھینکتا جاتا تھا ۔ اور کہتا کہ " اس کے فریب میں نہ آنا ۔ یہ چاہتا ہے کہ تم لات و عزیٰ کی پرستش چھوڑدو " (۴) ۔ طائف میں کفار نے آپؐ کو جو تکلیفیں پہنچائیں ان کا بیان پیچھے گذر چکا ۔

ایک دفعہ آپؐ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے ، عقبہ نے آپؐ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی ۔ اتفاقاً حضرت ابو بکرؓ آگئے ۔ اور آپؐ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا ۔ اور کہا کہ " اس شخص کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے " (۵) ۔

جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں نہایت سرگرم تھے ، اور رات دن اسی شغل میں رہتے تھے ، ان کے نام جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں ،

" ابو جہل ، ابو لہب ، اسود بن عبد یغوث ، حارث بن قیس بن عدی ، ولید بن المغیرہ "

امیہ ۔ ابی بن خلف ، ابو قیس بن فاکہہ بن المغیرہ ، عاص بن وائل ، نضر بن حارث

[(۱) مسند امام بن حنبل جلد ا صفحہ ۳۰۲ (۲) صحیح بخاری ۶۸۶] (۳) صحیح بخاری باب الطہارۃ والجزیہ والجہاد ، و صحیح مسلم و زرقانی جلد اول صفحہ ۲۹۲ ۔ (۴) مسند امام ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۶۳ (۵) صحیح بخاری باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ بمکۃ الخ

منبہ بن الحجاج، زہیر بن ابی امیہ، سائب بن صیفی، اسود بن عبدالاسد، عاص بن سعید بن العاص، عاص بن ہاشم، عقبہ بن ابی معیط، ابن الاصدی، ہذلی، حکم بن ابی العاص، عدی بن حمرا۔

یہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سایہ اور ان میں سے اکثر صاحبِ جاہ و اقتدار تھے۔

یہ جو کچھ ہوا، گو نہایت درد انگیز اور حسرت خیز تھا، لیکن تعجب انگیز نہ تھا، دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں بہ رغبت سن لی گئی ہوں، حضرت نوح علیہ السلام کو سیکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا، یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے، تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار و رسن کا منظر پیش آیا، اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلۂ واقعات کی غیر معمولی کڑی نہ تھی، لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیا کیا؟

سقراط (زہر کا) پیالہ پی کر فنا ہو گیا، حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آکر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے، لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ان سب سے بالاتر تھا، حضرت خباب بن الارت نے جب قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے؟ تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ "تم سے پہلے وہ لوگ گذرے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خدا اس کام کو پورا کرے گا یہاں تک کہ شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا، اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا" (۱)۔

کیا یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری نہیں ہوئی؟

(۱) صحیح بخاری باب مالقی النبی واصحابہ من المشرکین، ذکر ایام جاہلیۃ۔

☆☆☆

مدینہ منوّرہ اور انصارؓ

آفتاب کی روشنی دور پہنچ کر تیز ہوتی ہے، شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے۔ آفتاب اسلام طلوع مکہ میں ہوا، لیکن کرنیں مدینہ کے افق پر چمکیں۔

مدینہ کا اصلی نام یثرب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہاں آکر قیام کیا تو اس کا نام مدینۃ النبی یعنی "پیغمبر کا شہر" پڑ گیا، اور پھر مختصر ہو کر مدینہ مشہور ہو گیا۔

یہ شہر مدتوں سے آباد ہے، بہت قدیم زمانہ میں یہودی یہاں آکر آباد ہوئے، ان کی نسلیں کثرت سے پھیلیں اور مدینہ کے اطراف ان کے قبضہ میں آگئے، انہوں نے مدینہ اور اس کے حوالی میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنالئے تھے، اور ان میں سکونت رکھتے تھے۔ (یہود کے متعلق زائد تحقیق آگے آئے گی۔)

انصار اصل میں یمن کے رہنے والے اور قحطان کے خاندان سے تھے، یمن میں جب مشہور سیلاب آیا جس کو "سیلِ عرم" کہتے ہیں، یہ لوگ یمن سے نکل کر مدینہ میں آباد ہوئے، یہ دو بھائی تھے اوس اور خزرج، تمام انصار ان ہی دو کے خاندان سے ہیں (۱)، یہ خاندان جب یثرب میں آیا تو یہود نہایت اقتدار اور اثر رکھتے تھے، آس پاس کے مقامات ان کے قبضہ میں تھے، اور دولت و مال سے مالامال تھے، چونکہ آل و اولاد کی کثرت سے بیس اکیس قبیلے بن گئے تھے، اس لئے دور دور تک بستیاں بسالی تھیں، انصار کچھ زمانہ تک ان سے الگ رہے، لیکن ان کا زور اور اثر دیکھ کر ان کے حلیف بن گئے (۲)، ایک مدت تک یہ حالت رہی، لیکن اب انصار کا خاندان پھیلتا جاتا تھا، اور اقتدار حاصل کرتا جاتا تھا، یہود نے پیش بینی کے لحاظ سے ان سے معاہدہ توڑ دیا۔

یہودیوں میں ایک رئیس فطیون پیدا ہوا جو نہایت عیاش اور بدکار تھا، اس نے یہ حکم دیا کہ جو دوشیزہ لڑکی بیاہی جائے، پہلے اس کے شبستانِ عیش میں آئے، یہود نے اس کو گوارا کر لیا تھا، لیکن جب انصار کی نوبت آئی تو انہوں نے سرتابی کی، اس زمانہ میں انصار کا سردار مالک بن عجلان تھا، اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گذری، مالک کو غیرت آئی، اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت

---

(۱) انصار کے نسب، اور مدینہ میں آباد ہونے کی پوری تفصیل وفا الوفا، جلد اوّل صفحہ ۱۱۶ تا ۱۵۲ میں مذکور ہے۔ (۲) جو قبیلے آپس میں ایک دوسرے کی اعانت وشرکت کا (بحلف) معاہدہ کرتے تھے، وہ باہم حلیف کہلاتے تھے۔

ملامت کی۔ اس نے کہا "ہاں! لیکن کل جو کچھ ہوگا اس سے بھی بڑھ کر ہے"۔ دوسرے دن حسبِ دستور جب مالک کی بہن دولہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانے کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ گیا، اور فطیون کو قتل کر کے شام کو بھاگ گیا۔ یہاں غسانیوں کی حکومت تھی، اور ابو جبلہ حکمراں تھا، اس نے یہ حالات سنے تو ایک فوجِ گراں لے کر آیا اور اوس اور خزرج کے رؤسا کو بلا کر ان کو خلعت اور صلے دیئے۔ پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو دھوکے سے قتل کرا دیا، یہود کا زور اب ٹوٹ گیا، اور انصار نے نئے سرے سے قوت حاصل کی (۱)۔

انصار نے مدینہ اور حوالی مدینہ میں کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے۔ اوس اور خزرج ایک مدّت تک باہم متحد رہے، لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور سخت خوں ریز لڑائیاں ہوئیں، سب سے اخیر لڑائی میں جس کو بعاث کہتے ہیں، اس زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نامور لڑ لڑ کر مر گئے، انصار اب اس قدر ضعیف ہو گئے کہ انہوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنا لیجئے، لیکن ابو جہل نے معاملہ درہم برہم کر دیا۔

انصار گو بت پرست تھے، تاہم یہود سے میل جول تھا، اس لئے نبوّت اور کتبِ آسمانی سے گوش آشنا تھے، یہود سے گو انصار اک گونہ رقابت رکھتے تھے، لیکن ان کے علمی فضل و کمال کے معترف تھے، یہود نے مدینہ میں جو علمی مدارس قائم کئے تھے، اور جن کو بیت المدراس کہتے تھے (بخاری وغیرہ میں نام مذکور ہے۔) (۲) ان میں توراۃ کی تعلیم ہوتی تھی، انصار جاہل تھے، جس کے اولاد زندہ نہیں رہتی تھی وہ منت مانتا تھا کہ بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنا دیا جائے گا (۳)۔ یہودی عموماً یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک پیغمبر ابھی اور آنے والا ہے، اس بنا پر انصار بھی ایک پیغمبر موعود کے نام سے آشنا تھے۔

انصار میں ایک شخص، سوید بن صامت جو شاعری اور جنگ آوری میں ممتاز تھا، اس کو امثالِ لقمان کا نسخہ ہاتھ آ گیا تھا، جس کو وہ کتابِ آسمانی سمجھتا تھا، وہ ایک دفعہ حج کو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات سنے تو خود اس کے پاس تشریف لے گئے، اس نے امثالِ لقمان پڑھ کر سنایا، آپؐ نے فرمایا "میرے پاس اس سے بھی بہتر چیز ہے"۔ یہ کہہ کر

---

(۱) وفاء الوفا، یہ واقعہ مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے اور وفاء الوفا، میں یہ تمام روایتیں مذکور ہیں۔ (۲) (بخاری ج ۲ ص ۱۰۲۰ کتاب الاکراہ باب فی بیع المکرہ ونحوہ فی الحق وغیرہ) "س"۔ (۳) (کتب تفسیر میں لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کی تفسیر دیکھو۔)

قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، سوید نے تحسین کی (۱)، اگرچہ وہ مدینہ واپس آکر جنگِ بعاث میں مارا گیا، لیکن اسلام کا معتقد ہو چکا تھا۔

سوید شجاعت اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا تھا، ایسے شخص کو اہلِ عرب "کامل" کہتے تھے، اور اسی بنا پر سوید اسی لقب سے پکارا جاتا تھا (۲)، سوید کے میلانِ اسلام کا اثر انصار پر پڑ چکا تھا۔

اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو جب شکست ہوتی تو اوس کے عمائد قریش کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلہ میں ان کو حلیف بنائیں، اس سفارت میں ایاس بن معاذ بھی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کا آنا معلوم ہوا تو آپؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں، ایاس نے ساتھیوں سے کہا کہ "خدا کی قسم تم جس غرض کے لئے آئے ہو یہ کام اس سے بھی بہتر ہے"۔ لیکن قافلہ سالار یعنی ابوالحیس نے کنکریاں اٹھا کر منھ پر ماریں اور کہا کہ "ہم اس کام کے لئے نہیں آئے"۔ اس کے بعد بعاث کا معرکہ پیش آگیا، اور ایاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ مرتے وقت ایاس کی زبان پر تکبیر جاری تھی (۳)۔

انصار کے اسلام کی ابتدا
سنہ ۱۰ نبوی

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغِ اسلام فرمایا کرتے تھے، اس سال (رجب سنہ ۱۰ نبوی) میں بھی آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے، عقبہ کے پاس، جہاں اب مسجد العقبہ ہے، خزرج کے چند اشخاص آپؐ کو نظر آئے، آپؐ نے ان سے نام و نسب پوچھا، انہوں نے کہا "خزرج" آپؐ نے دعوتِ اسلام دی، اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور کہا "دیکھو یہود ہم سے اوّلیت میں بازی نہ لے جائیں" یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا، یہ چھ شخص تھے (۴) جن کے نام حسب ذیل ہیں (۵)۔

---

(۱) (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۴۷) "س" (۲) سوید کا ذکر ابن ہشام میں ہے، لیکن روض الانف میں زیادہ تفصیل ہے، اصابہ میں بھی اس کا حال ہے، لیکن نسب میں اختلاف ہے، اور امثالِ لقمان کا ذکر نہیں ہے، طبری میں بھی سوید کا پورا واقعہ مع اس کے اشعار کے مذکور ہے، دیکھو صفحہ ۱۲۰۷۔ (۳) طبری اور اصابہ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اصابہ میں لکھا ہے کہ ایاس کا حال امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۴۸) "س" (۴) مدینہ منورہ کے یہ حضرات، جو پہلے پہل اسلام لائے بعض مصنفین سیرت نے ان کے اس قبولِ اسلام کے واقعہ کا تذکرہ، بیعت عقبہ اولیٰ کے عنوان سے کیا ہے، یہ عنوان کتبِ سیرت کے ناظرین کے لئے اس وقت پریشانی کا موجب بن جاتا ہے، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۸، پر ملاحظہ ہو)

۱۔ ابوالہیثمؓ بن تیہان،	
۲۔ ابوامامہ اسعدؓ بن زرارہ	(صحابہ میں سب سے پہلے ان ہی نے) سنہ ۱ھ میں وفات پائی۔
۳۔ عوفؓ بن حارث،	(بدر میں شہادت پائی۔)
۴۔ رافعؓ بن مالک بن عجلان	اس وقت تک جس قدر قرآن اتر چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عنایت فرمایا، جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔
۵۔ قطبہؓ بن عامر بن حدیدہ،	(تینوں عقبات میں شریک رہے)
۶۔ جابرؓ بن عبداللہ (بن ریاب)	یہ مشہور صحابی حضرت جابرؓ بن عبداللہ بن عمرو کے علاوہ تھے، بدر وغیرہ میں شریک تھے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۷) جب وہ دوسری کتابوں (مثلاً مستدرک حاکم ج ۲ ص ۶۲۴، ابن کثیر علی حاشیۃ فتح البیان ج ۹ ص ۴۴۳) میں دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبۂ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے۔

اسی اختلاف روایت کے سبب سے بعض مصنفین سیرت بیعت عقبۂ ثانیہ میں ۱۲ آدمی اور بعض ۷۳ آدمی بتلاتے ہیں، حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے، ان کے واقعۂ قبول اسلام کا عنوان بیعت عقبۂ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلام انصار ہونا چاہیئے، اور دوسرے سال جب کہ گیارہ بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے ہیں، یہ بیعت عقبۂ اولیٰ ہے (سیرت حلبیہ ج ۲ صفحہ ۸) حضرت عبادہؓ بن الصامت نے بصراحت فرمایا ہے: کنا احد عشر فی العقبۃ الاولی من العام المقبل، (مستدرک ج ۲ صفحہ ۶۲۴ حیدرآباد دکن) اس روایت میں حضرت عبادہؓ العام المقبل میں بیعت عقبۂ اولیٰ کا ہونا فرماتے ہیں، اور اس میں گیارہ آدمیوں کے ہونے کی صراحت فرماتے ہیں، اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے پہلے جو لوگ آکر اسلام قبول کر چکے تھے اس کا تعلق بیعت عقبہ اولیٰ سے نہیں ہے۔

جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام عقبۂ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا عنوان دیتے ہیں، یعنی ایک یہ بیعت عقبۂ اولیٰ، دوسری وہ بیعت عقبہ جس میں گیارہ بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں ۷۳ افراد مشرف بہ اسلام ہوتے، اور یہ تینوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آتے، اور جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلام انصار کے عنوان سے ذکر کیا ہے، انہوں نے گیارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبۂ اولیٰ اور ۷۳ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبۂ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ خمیس اول ص ۳۰۶، ص ۳۱۶ و ص ۳۱۷ و زرقانی علی المواہب ج اول ص ۳۶۴ و ص ۳۶۷) "س"

(۵) یہ واقعات تمام تاریخوں میں مذکور ہیں، ہم نے زرقانی کو پیش نظر رکھا ہے، کیونکہ اس نے تمام مختلف روایتیں جمع کر دی ہیں ان لوگوں کی تعداد بعضوں نے آٹھ بیان کی ہے، اسعد بن زرارہ اور ابو الہیثم کا پہلے سے موجود ہونا، ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے، دیکھو کتاب مذکور جزء ثالث، انصار بدریین ص ۲۲، واقدی کا بیان ہے کہ اسعد بن زرارہ اس واقعہ سے پہلے مکہ میں جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے۔ (بعضوں نے ابو الہیثم بن تیہان کی جگہ عقبہ بن عامر بن نابی کا نام لیا ہے، اور بعض نے جابر بن ریاب کے بجائے عبادہ بن صامتؓ کو جگہ دی ہے) "س"

بیعت عقبۂ اولیٰ
۱۱؁ نبوی

دوسرے سال بارہ شخص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی، اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکامِ اسلام سکھانے کے لئے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اس خدمت پر مامور فرمایا، مصعبؓ ہاشم بن عبد مناف کے پوتے اور سابقینِ اسلام میں سے تھے۔ غزوہ بدر میں لشکرِ اسلام کی علم برداری کا منصب انہی کو ملا تھا، وہ مدینہ میں آکر اسعدؓ بن زرارہ کے مکان پر ٹھہرے۔ جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے، روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے۔ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے۔ اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے۔ رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا، صرف خطمۃ، وائل، واقف کے چند گھرانے باقی رہ گئے، ابن سعد نے طبقات میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ تھے، قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ مصعبؓ نے جب ان کے پاس جاکر اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے پہلے نفرت ظاہر کی، لیکن جب مصعبؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو پتھر موم تھا، ان کا اسلام لانا تمام قبیلہ اوس کا اسلام قبول کر لینا تھا۔

بیعت عقبۂ ثانیہ
۱۲؁ نبوی

اگلے سال بہتر ۷۲ شخص حج کے زمانہ میں آئے، اور اپنے ساتھیوں سے (جو بت پرست تھے) چھپ کر بہ مقامِ منیٰ (عقبہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، اس موقع پر حضرت عباسؓ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، انھوں نے انصار سے خطاب کر کے کہا "گروہ خزرج! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں، دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے، اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں، اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی سے جواب دے دو"۔

حضرت براءؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے کہا "ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں"۔ وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابو الہیثم نے بات کاٹ کر کہا "یا رسول اللہ! ہم سے اور یہود سے تعلقات ہیں، بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے، ایسا تو نہ ہو کہ جب آپؐ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو آپؐ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں"۔ آپؐ نے مسکرا کر فرمایا "نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے اور میں تمہارا ہوں"۔

آپؐ نے اس گروہ میں سے بارہ شخص نقیب انتخاب کئے، جن کے نام خود انصار نے پیش کئے تھے، اُن میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے، ان کے نام حسبِ روایت ابن سعد حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ اُسیدؓ بن حضیر	جنگ بعاث میں انہی کے باپ اوس کے سردار تھے۔
۲۔ ابوالہیثمؓ بن تیہان،	
۳۔ سعدؓ بن خیثمہ،	جنگ بدر میں شہید ہوئے۔
۴۔ اسعدؓ بن زرارہ،	ان کا ذکر اوپر گذر چکا، یہ امامِ نماز تھے۔
۵۔ سعدؓ بن الربیع،	جنگِ احد میں شہید ہوئے۔
۶۔ عبداللہؓ بن رواحہ،	مشہور شاعر ہیں، جنگ موتہ میں شہید ہوئے۔
۷۔ سعدؓ بن عبادہ،	معزز اور مشہور صحابی ہیں، سقیفہ بنی ساعدہ میں ان ہی نے پہلے خلافت کا دعوی کیا تھا۔
۸۔ منذرؓ بن عمرو	بیر معونہ میں شہید ہوئے۔
۹۔ براءؓ بن معرور،	بیعت عقبہ میں انہی نے انصار کی طرف سے تقریر کی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔
۱۰۔ عبداللہؓ بن عمرو،	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔
۱۱۔ عبادہؓ بن الصامت،	مشہور صحابی ہیں، ان سے اکثر حدیثیں مروی ہیں۔
۱۲۔ رافعؓ بن مالک،	جنگِ اُحد میں شہید ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی یہ تھیں "شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد، اور افتراء کے مرتکب نہ ہوں گے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے جو اچھی بات کہیں گے، اس سے سرتابی نہ کریں گے" (۱)۔

(۱) یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ یہ عقبۂ اولی کی شرائط ہیں، اخیر بیعت اس بات پر لی گئی تھی۔ انصار آپؐ کی جان کی حفاظت کریں گے۔

جب انصار بیعت کر رہے تھے تو اسعدؓ بن زرارہ نے کھڑے ہو کر کہا "بھائیو! یہ بھی خبر ہے؟ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم اور جن وانس سے اعلانِ جنگ ہے "۔ سب نے کہا ہاں ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔

بارہ شخص جو نقیب انتخاب کیے گئے رئیس القبائل تھے۔ ان کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا، صبح کو اس بیعت کی اڑتی سی خبر پھیلی۔ قریش انصار کے پاس آتے، اور شکایت کی، انصار کے ساتھ جو بت پرست تھے، ان کو اس بیعت کی خبر نہ تھی، انہوں نے تکذیب کی کہ "ایسا ہوتا تو ہم سے کیونکر چھپ سکتا تھا"۔

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے روک ٹوک شروع کی، لیکن چوری چھپے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی، رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکرؓ، اور حضرت علیؓ رہ گئے۔ جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے، وہ مدت تک نہ جا سکے۔ یہ آیت انہی کی شان میں ہے:

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ (نساء، ۴ : ۷۵)	کمزور مرد، عورتیں اور بچے، جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سنہ ۱ ھ

ہجرت

(اس وقت جب کہ دعوت حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، محافظِ عالم نے مسلمانوں کو دار الامان مدینہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا، لیکن خود وجود اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) جوان ستمگروں کا حقیقی ہدف تھا، اپنے لئے حکم خدا کا منتظر تھا۔ مکہ کے باہر اطراف میں جو صاحب اثر مسلمان ہو چکے تھے، وہ جاں نثارانہ آپ کی حفاظت کے لئے تیار تھے، قبیلۂ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا، اس کے رئیس طفیل بن عمروؓ نے اپنا قلعہ پیش کیا کہ آپؐ یہاں ہجرت کر آئیں، لیکن آپؐ نے انکار فرمایا (۱)۔ اسی طرح بنی ہمدان کے ایک شخص نے بھی یہی خواہش کی تھی، بعد کو اس نے کہا کہ وہ اپنے قبیلہ کو مطلع کر کے آئندہ سال آئے گا (۲) لیکن کارساز قضا و قدر نے یہ شرف صرف انصار کے لئے مخصوص کیا تھا، چنانچہ قبل ہجرت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خواب دیکھا کہ دار الہجرۃ ایک پر باغ و بہار مقام ہے، خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہو گا، لیکن وہ شہر مدینہ نکلا) (۳)۔

نبوت کا تیرہواں سال شروع ہوا، اور اکثر صحابہ مدینہ پہنچ چکے تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا، یہ داستان نہایت پر اثر ہے، اور اسی وجہ سے امام بخاری نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے، اور حضرت عائشہؓ کی زبانی لکھا ہے، حضرت عائشہؓ گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں، لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابو بکرؓ کا بیان ہے کہ انہی سے سن کر کہا ہو گا، اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ میں جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں، اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے، اس بنا پر انہوں نے دار الندوہ میں، جو دار الشوریٰ تھا، اجلاس عام کیا، ہر قبیلہ کے رؤساء یعنی ابو سفیان، زبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلدہ، ابوالبختری، ابن ہشام، زمعۃ ابن اسعد بن مطلب، حکیم بن حزام، ابو جہل، نبیہ و منبہ، امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ یہ سب

(۱) صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۵۸ باب الدلیل علی ان قاتل نفسہ لایکفر (۲) مستدرک جلد ۲ صفحہ ۶۱۳ و زرقانی علی المواہب جلد اول صفحہ ۳۵۹ (۳) صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ”س“

شریک تھے، لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں، ایک نے کہا "محمدؐ کے ہاتھ پانوں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے"۔ دوسرے نے کہا "جلاوطن کر دینا کافی ہے"۔ ابو جہل نے کہا "ہر قبیلہ سے ایک شخص انتخاب ہو، اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے، اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا، اور آلِ ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے"۔ اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا، اور جھٹ پٹے سے آکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آستانہ مبارک کا محاصرہ کر لیا، اہل عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لئے باہر ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی، تاہم آپؐ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا، آپؐ ہی کے پاس لاکر رکھتا تھا، اس وقت بھی آپؐ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں، آپؐ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی، اس بنا پر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ "مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا، تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جاکر واپس دے آنا"۔ یہ سخت خطرہ کا موقع تھا، حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں، اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے، لیکن فاتح خیبر کے لئے قتل گاہ فرشِ گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دوپہر کے وقت حضرت ابو بکرؓ کے گھر پر گئے، دستور کے موافق دروازہ پر دستک دی، اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے، حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا "کچھ مشورہ کرنا ہے، سب کو ہٹا دو"۔ بولے کہ "یہاں آپؐ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے"۔ (اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہو چکی تھی) آپؐ نے فرمایا "مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے"۔ حضرت ابو بکرؓ نے نہایت بیتابی سے کہا "میرا باپ آپؐ پر فدا ہو کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوگا"؟ ارشاد ہوا "ہاں" حضرت ابو بکرؓ نے ہجرت کے لئے چار مہینہ سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپؐ پسند فرمائیں، محسنِ عالمؐ کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہو سکتا تھا، ارشاد ہوا "اچھا مگر بہ قیمت" حضرت ابو بکرؓ نے مجبوراً قبول کیا، حضرت عائشہؓ اس وقت کمسن تھیں، ان کی بڑی

بہن حضرت اسماءؓ نے جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا۔ دو تین دن کا کھانا، ناشتہ دان میں رکھا، نطاق، جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منھ باندھا، یہ وہ شرف تھا، جس کی بنا پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے (۱)۔

کفار نے جب آپؐ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گذر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے۔ کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکہ، تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے"۔ حضرت ابو بکرؓ سے پہلے سے قرار داد ہو چکی تھی، دونوں صاحب پہلے جبلِ ثور کے غار میں جاکر پوشیدہ ہوئے، یہ غار آج بھی موجود ہے، اور بوسہ گاہ خلائق ہے (۲)، حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منھ اندھیرے شہر چلے جاتے، اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورہ کر رہے ہیں، جو کچھ خبر ملتی شام کو آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے، حضرت ابو بکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا، اور آپؐ اور حضرت ابو بکرؓ ان کا دودھ پی لیتے، تین دن تک صرف یہی غذا تھی، لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو حضرت اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں، اسی طرح تین راتیں غار میں گذریں (۳)

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بجائے حضرت علیؓ تھے، ظالموں نے آپ کو پکڑ کر اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا، اور چھوڑ دیا (۴)، پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاش میں نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آگئے، آہٹ پاکر حضرت ابو بکرؓ غمزدہ ہوئے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کی کہ "اب دشمن اس قدر قریب آگئے کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے" آپؐ نے فرمایا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ۔ ۹: ۴۰) گھبراؤ نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آگئے تو خدا نے حکم دیا، دفعۃً ببول کا درخت اُگا، اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چھپا لیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے،

---

(۱) (صحیح بخاری باب الہجرۃ) "س" (۲) یہ غار مکہ سے تین میل دہنی جانب ہے، پہاڑ کی چوٹی قریباً ایک میل بلند ہے، سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے، دیکھو زرقانی (ج ۱ ص ۳۸۰) "س" (۳) یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب الہجرۃ میں ہے، باب مناقب المہاجرین میں بعض مزید حالات ہیں وہ بھی ہم نے شامل کر لئے ہیں۔ (۴) تاریخ طبری (ج ۳ ص ۱۲۳۴) "س"

اور گھونسلا بنا کر انڈے دیئے، حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں، اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے، اور زرقانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں، لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں، اس روایت کا اصلی راوی عون بن عمرو ہے، اس کی نسبت امام فنِ رجال یحییٰ بن معین کا قول ہے، "لاشیئ" یعنی ہیچ ہے، امام بخاری نے کہا ہے کہ "وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے"۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے، وہ مجہول الحال ہے، چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں، اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے (۱)۔

بہر حال چوتھے دن آپؐ غار سے نکلے، عبداللہ بن اُرَیقِط ایک کافر جس پر اعتماد تھا رہنمائی کے لئے اجرت پر مقرر کر لیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے گئے، دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہو گئی تو حضرت ابو بکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سایہ میں آرام فرمالیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھادی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آرام فرمایا، تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں، پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کردے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہایا، برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دودھ لے کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا، آپؐ نے پی کر فرمایا کہ "کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا"؟ آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لئے آپؐ وہاں سے روانہ ہوئے (۲)۔

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ابو بکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک خونبہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا، سراقہ (۳) بن جعشم نے سنا تو انعام کی امید میں نکلا، عین اس حالت میں کہ آپؐ روانہ ہو رہے تھے، اس نے آپؐ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آگیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، وہ گر پڑا، ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ

---

(۱) (سیرۃ النبی ج ۳ میں بہ ضمن "مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت" ان روایات پر مفصل تنقید کی گئی ہے) ص ۲ (۲) یہ پوری تفصیل حرف بہ حرف صحیح بخاری باب مناقب المہاجرین میں ہے، ہم نے تمام جزئیات اس لئے نقل کیں کہ اس سے حضرت ابو بکرؓ کی صفائی پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے (۳) سراقہ بعد میں اسلام لائے اور جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کے زیورات لوٹ میں آئے تو حضرت عمرؓ نے انہی کو زیورات پہنا کر عالم کی نیرنگی کا تماشا دیکھا

حملہ کرنا چاہیئے یا نہیں ؟ جواب میں "نہیں" نکلا، لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی، دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا، اور آگے بڑھا، اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے، گھوڑے سے اتر پڑا، اور پھر فال دیکھی، اب بھی وہی جواب تھا، مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کردی، اور یقین ہوگیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آکر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجئے، حضرت ابو بکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہؓ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمانِ امن لکھ دیا (۱)۔

حسنِ اتفاق یہ کہ حضرت زبیرؓ شام سے تجارت کا سامان لے کر آرہے تھے، انہوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کئے، جو اس بے سروسامانی میں غنیمت تھے۔

ابن سعد نے طبقات میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں، اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج ان کا نشان نہیں ملتا، تاہم عقیدت مند صرف نام سے لذت یاب ہو سکتے ہیں، خرار، ثنیۃ المرۃ، لقف، مدلجہ، مرجح، حدائد، اذاخر، رابغ (یہ مقام آج بھی حجاج کے رستہ میں آتا ہے، یہاں آپؐ نے مغرب کی نماز پڑھی) ذاسلم، عثانیہ، قاحہ، عرج، جدوات، رکوبۃ، عقیق، جثجاثۃ۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی، تمام شہر ہمہ تن چشمِ انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ "پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آرہے ہیں" لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے، اور دوپہر تک انتظار کرکے حسرت کے ساتھ واپس چلے آتے، ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ "اہل عرب لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آگیا"۔ تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا، انصار ہتھیار سج سج کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے۔

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے، اس کو عالیہ اور قباء کہتے ہیں۔ یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے، ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا، اور کلثوم بن الہدم خاندان کے افسر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پہنچے تو

(۱) صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریشانی میں بھی دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔

تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا، یہ فخر ان کی قسمت میں تھا کہ میزبانِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان ہی کی مہمانی قبول کی، انصار ہر طرف سے جوق جوق آتے اور جوشِ عقیدت کے ساتھ سلام عرض کرتے (۱)۔

اکثر اکابر صحابہؓ جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے مدینہ میں آچکے تھے، وہ بھی ان ہی کے گھر میں اترے تھے، چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ، مقدادؓ، خبابؓ، سہیلؓ، صفوانؓ، عیاضؓ، عبداللہؓ ابن مخرمۃ، وہبؓ بن سعدؓ، معمر بن ابی سرحؓ، عمیر بن عوفؓ، اب تک انہی کے مہمان تھے (۲)۔

جناب امیرؓ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روانہ ہونے کے تین دن بعد مکہ سے چلے تھے، وہ بھی آگئے، اور یہیں ٹھہرے، تمام مورخین اور اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا، لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے، اور یہی قرینِ قیاس ہے۔

یہاں آپ کا پہلا کام مسجد کی تعمیر کرانا تھا، حضرت کلثومؓ کی ایک افتادہ زمین تھی، جہاں کھجوریں سکھلائی جاتی تھیں، یہیں دستِ مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی، یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ

(توبہ۔ ۹:۱۰۸)

وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے اور خدا صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپ خود بھی کام کرتے تھے، بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہوجاتا تھا، عقیدت مند آتے اور عرض کرتے "ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ چھوڑدیں، ہم اٹھالیں گے"۔ آپ ان کی درخواست قبول فرماتے، لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھالیتے (۳)۔

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ شاعر تھے، وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے، اور جس

---

(۱) صحیح بخاری صفحہ ۶۰ طبقات ابن سعد سیرۃ نبوی صفحہ ۱۵۸ (۲) ابن سعد تذکرہ کلثوم بن الہدم۔ (۳) وفاء الوفاء بہ حوالہ طبرانی کبیر (جلد ا صفحہ ۱۸۰)

طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

افلح من يعالج المساجداً	وہ کامیاب ہے، جو مسجد تعمیر کرتا ہے.
ويقرء القرآن قائما وقاعدا	اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے.
ولا يبيت الليل عنه راقدا	اور رات کو جاگتا رہتا ہے.

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے (۱)۔

قباء میں آپؐ کا داخلہ اسلام کے دور خاص کی ابتدا ہے، اس لئے مورخین نے اس تاریخ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے، اکثر مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ آٹھ ربیع الاول سنہ ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰ / ستمبر ۶۲۲ء) ہے۔ (محمد بن) موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی تاریخ، اور رومی ماہ ایلول ۹۳۳ اسکندری کی دسویں تاریخ تھی (۲)، مورخ یعقوبی نے ہیئیت دانوں سے یہ زائچہ نقل کیا ہے۔

آفتاب	برج سرطان میں	۲۳ درجہ ۶ دقیقہ پر
زحل	برج اسد میں	۲ درجہ
مشتری	برج حوت میں	۶ درجہ
زہرہ	برج اسد میں	۱۳ درجہ
عطارد	برج اسد میں	۱۵ درجہ

چودہ دن کے بعد (جمعہ کو) (۳) آپ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے، (راہ میں بنی سالم کے محلہ میں نماز کا وقت آگیا، جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی نماز جمعہ اور سب سے پہلا خطبۂ نماز تھا، لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوشِ مسرت سے پیش قدمی کے لئے دوڑے) آپؐ کے ننہالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سج سج کر آئے (۴)، قباء سے مدینہ تک دو رویہ

(۱) وفاء الوفا، بحوالہ ابن شبہ ج ۱ ص ۱۸۱ مصر۔ (۲) عینی شرح بخاری جلد دوم ص ۳۵۳ (عینی مطبوعہ قسطنطنیہ میں مطبع کی غلطی سے ۲۳، سبعمایۃ لکھا گیا ہے، اس کو تسعمایۃ پڑھنا چاہیے، رومی ماہ ایلول کی دسویں کے بجائے جدید طریقہ حساب سے بیسویں ثابت ہوتی ہے، خوارزمی نے جمعرات کا دن بتایا ہے، لیکن جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے)۔ (۳) خوارزمی کے حساب کے مطابق روز ورود (جمعرات) نہ لیا جائے تو ۱۴ دن کے بعد جمعہ ہوگا۔ (۴) یہ واقعہ بخاری کے متعدد ابواب مسجد، ہجرت وغیرہ میں مذکور ہے۔

جاں نثاروں کی صفیں تھیں، راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آکر عرض کرتا "حضور! یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے"۔ آپؐ منت کا اظہار فرماتے، اور دعائے خیر دیتے۔ شہر قریب آگیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں: (۱)

طلع البدر علینا	چاند نکل آیا ہے،
من ثنیات الوداع	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
وجب الشکر علینا	ہم پر خدا کا شکر واجب ہے
ما دعیٰ للہ داع	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں،

معصوم لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی تھیں:

نحن جوار من بنی النجّار	ہم خاندان نجار کی لڑکیاں ہیں،
یا حبّذا محمدا من جار	محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا اچھا ہمسایہ ہے،

آپؐ نے ان لڑکیوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا "کیا تم مجھ کو چاہتی ہو؟ بولیں "ہاں" فرمایا کہ "میں بھی تم کو چاہتا ہوں"۔

جہاں اب مسجد نبویؐ ہے، اس سے متصل حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا گھر تھا، کوکبۂ نبویؐ یہاں پہنچا، سخت کشمکش تھی کہ آپؐ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو؟ قرعہ ڈالا گیا، اور آخر یہ دولت حضرت ابو ایوبؓ کے حصہ میں آئی (۲)۔

حضرت ابو ایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا، انہوں نے بالائی منزل پیش کی، لیکن آپؐ نے زائرین کی آسانی کے لئے نیچے کا حصہ پسند فرمایا، ابو ایوبؓ دو وقتہ آپؐ کی خدمت میں کھانا بھیجتے

---

(۱) وفاء الوفاء جلد اول ص ۱۸۰، پہلے اشعار کے متعلق زرقانی نے نہایت محققانہ، محدثانہ بحث کی ہے اور ابن قیم کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ثنیۃ الوداع شام کی طرف ہے نہ کہ مکہ کی طرف، مواہب میں لکھا ہے کہ یہ اشعار حلوانی نے شیخین کی شرط پر روایت کئے ہیں، بخاری میں بھی یہ اشعار منقول ہیں، مگر غزوہ تبوک کے موقع پر، لیکن ان دونوں روایتوں میں کچھ تناقض نہیں، ممکن ہے دونوں موقعوں پر یہ اشعار پڑھے گئے ہوں۔ (۲) ابو ایوبؓ کا نام خالد ہے، اصابہ فی احوال الصحابہ میں اسی نام سے ان کا ذکر کیا ہے اور وہیں یہ واقعہ لکھا ہے، اکثر سیر اور تواریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چونکہ ہر شخص اپنے گھر میں اتارنے کی درخواست کرتا تھا، آپؐ نے فرمایا کہ میرے ناقہ کو چھوڑ دو، وہ خدا کی طرف سے مامور ہے، چنانچہ ناقہ حضرت ابو ایوبؓ کے گھر کے سامنے جاکر بیٹھ گیا، اس لئے آپؐ نے انہی کے گھر پر قیام فرمایا، لیکن صحیح مسلم باب الہجرت میں ہے کہ جب لوگوں میں آپؐ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپؐ نے کہا کہ "میں بنو نجار کے ہاں اتروں گا جو عبدالمطلب کے ماموں ہیں"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً ایسا کیا تھا حضرت ابو ایوبؓ اسی خاندان سے تھے، امام بخاری نے تاریخ صغیر میں تصریح کی ہے، کہ ابو ایوبؓ کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا۔

اور آپؐ جو چھوڑ دیتے، ابو ایوبؓ اور ان کی زوجہ کے حصہ میں آتا۔ کھانے میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوتا، ابو ایوبؓ بھی تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ تھا کہ پانی بہ کر نیچے جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو۔ گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا۔ حضرت ابو ایوبؓ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے (۱)۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سات مہینہ تک یہیں قیام فرمایا، اس اثنا میں جب مسجد نبویؐ اور آس پاس کے حجرے تیار ہوگئے تو آپؐ نے نقل مکان فرمایا، تفصیل آگے آتی ہے۔

مدینہ میں آکر آپؐ نے حضرت زیدؓ (اور اپنے غلام ابو رافع) کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جاکر صاحبزادیوں اور حرم نبویؐ کو لے آئیں، حضرت ابو بکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سے حضرت رقیہؓ، حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبش میں تھیں، حضرت زینبؓ کو ان کے شوہر نے آنے نہ دیا، زیدؓ صرف حضرت فاطمہ زہراؓ (اور حضرت ام کلثومؓ) اور حضرت سودہؓ (زوجہ محترم نبوی) کو لے کر آئے، حضرت عائشہؓ اپنے بھائی کے ساتھ آئیں (۲)۔

مسجد نبویؐ اور ازواج مطہراتؓ کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانۂ خدا کی تعمیر تھی، اب تک یہ معمول تھا کہ مویشی خانہ میں (یا جہاں موقع ملتا تھا) آپؐ نماز پڑھا کرتے تھے (۳)، دولت کدہ کے قریب خاندانِ نجار کی زمین تھی جس میں کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپؐ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا "میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں" وہ بولے کہ "ہم قیمت لیں گے، لیکن آپ سے نہیں، بلکہ خدا سے"۔ چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی، آپؐ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا، ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی، لیکن آپ نے گوارا نہ کیا، حضرت ابو ایوبؓ نے قیمت ادا کی، قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کردی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، شہنشاہ دوعالم، پھر مزدوروں کے لباس میں تھا، صحابہؓ پتھر اٹھا اٹھا لاتے تھے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ان

---

(۱) اصابہ ذکر ابو ایوبؓ، اور زرقانی بہ حوالہ قاضی ابو یوسف و حاکم ودفا، الوفا۔ (۲) ابن سعد (جزء نساء ص ۴۲) (۳) ابو داود (باب بناء المسجد)

کے ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے (١)۔

اللّٰھم لاخیر الاخیر الاٰخرة — اے خدا! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے،
فاغفر الانصار و المھاجرة — اے خدا! مہاجرین اور انصار کو بخش دے،

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی۔ یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، برگ خرماں کا چھپر، کھجور کے ستون تھے۔ قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا۔ لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا، تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا۔ فرش چونکہ بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی، ایک دفعہ صحابہ نماز کے لئے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر بچھا لیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔

مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقف چبوترہ تھا، جو صفہ کہلاتا تھا۔ یہ ان لوگوں کے لے تھا جو اسلام لاتے تھے، اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔

مسجد نبویؐ جب تعمیر ہو چکی تو مسجد سے متصل ہی آپؐ نے ازواج مطہراتؓ کے لئے مکان بنوائے۔ اس وقت تک حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ عقد نکاح میں آ چکی تھیں۔ اس لئے دو ہی حجرے بنے۔ جب اور ازواج آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔ یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے، ان میں سے پانچ کھجور کی ٹٹیوں سے بنے تھے جو حجرے اینٹوں کے تھے ان کے اندرونی حجرے بھی ٹٹیوں کے تھے، ترتیب یہ تھی کہ حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ بنت جحش کے مکانات شامی جانب تھے، اور حضرت عائشہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت سودہؓ مقابل جانب تھیں (٢)۔ یہ مکانات مسجد سے اس قدر متصل تھے کہ جب آپؐ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے، تو مسجد سے سر نکال دیتے، اور ازواج مطہراتؓ گھر میں بیٹھے بیٹھے آپ کے بال دھو دیتی تھیں۔

یہ مکانات چھ چھ، سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا۔ دروازوں پر کمل کا پردہ پڑا رہتا تھا (٣)۔ راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے (٤)۔

---

(١) بخاری باب المساجد و باب الہجرة وحج و باب البیوع و عینی شرح بخاری جلد ٢ ص ٣٥٠ و زرقانی۔ (٢) طبقات ابن سعد، جلد سیرت نبوی ص ١٦١۔ (٣) منازل نبوی کا حال طبقات ابن سعد جز ٨ ص ١١٠، اور وفاء الوفا میں تفصیلاً ہے۔ (٤) بخاری باب الصلوٰة علی الفراش۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہمسایہ میں جو انصار رہتے تھے، ان میں حضرت سعدؓ بن عبادہ، حضرت سعدؓ بن معاذ، حضرت عمارہؓ بن حزم، اور حضرت ابو ایوبؓ رئیس اور دولت مند تھے، یہ لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں دودھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اور اسی پر آپؐ بسر فرماتے تھے، حضرت سعدؓ بن عبادہ نے التزام کر لیا تھا کہ رات کے کھانے پر ہمیشہ اپنے ہاں سے ایک بڑا بادیہ بھیجا کرتے تھے، جس میں کبھی سالن، کبھی دودھ، کبھی گھی ہوتا تھا (۱)، حضرت انسؓ کی ماں حضرت ام انسؓ نے اپنی جائداد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پیش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما کر اپنی دایہ حضرت امِ ایمنؓ کو دے دیا (۲)، اور خود فقر و فاقہ اختیار فرمایا۔

اذان کی ابتدا

اسلام کے تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت و اجتماع ہے، اس وقت تک کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز جماعت کا کوئی انتظام نہ تھا، لوگ (وقت کا اندازہ کر کے آتے تھے، اور نماز پڑھتے تھے) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ پسند نہ تھا، آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کر دیئے جائیں جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلالائیں، لیکن اس میں زحمت تھی، صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، کسی نے کہا نماز کے وقت مسجد پر ایک علم کھڑا کر دیا جائے۔ لوگ دیکھ کر آتے جائیں گے، آپؐ نے یہ طریقہ ناپسند فرمایا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں اعلانِ نماز کے جو طریقے ہیں وہ بھی آپؐ کی خدمت میں عرض کئے گئے، لیکن آپؐ نے حضرت عمرؓ کی رائے پسند کی، اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان دیں (۳)، اس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاع عام ہو جاتی تھی، دوسری طرف دن میں پانچ دفعہ دعوت اسلام کا اعلان ہو جاتا تھا۔

صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زیدؓ نے پیش کی تھی، جو انہوں نے خواب میں دیکھی تھی، ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی خواب میں توارد ہوا، لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں کسی اور روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی (۴)۔

---

(۱) طبقات ابن سعد جلد کتاب النساء، ص ۱۱۶۔ (۲) صحیح بخاری ص ۳۵۸ باب فضل المنیحہ۔ (۳) ابو داؤد باب بدء الاذان و بخاری باب الاذان، بخاری میں زید کے واقعہ کا ذکر نہیں۔ (۴) یہ روایت صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی میں بھی ہے، لیکن تمام روایات کو اور علماء کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے مسئلہ کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے دوسرے لوگوں کی رایوں کے مقابلہ میں اپنی رائے یہ پیش کی تھی جیسا کہ بخاری والی روایت میں ہے کہ ولا تبعثون رجلا ینادی بالصلوۃ کہ ایک آدمی بھیجا جائے جو پکار کر نماز کا اعلان کر دے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور الصلوۃ جامعۃ کے لفظ سے اس کا اعلان کر دیا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۳ پر دیکھیے)

بخاری میں صاف تصریح ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اذان کی تجویز پیش کی، اور آپ نے اس کے موافق حضرت بلالؓ کو بلا کر اذان کا حکم دیا، خواب کا ذکر نہیں۔

مواخاۃ

مہاجرین مکہ معظمہ سے بالکل بے سر و سامان آئے تھے، گو ان میں دولت مند اور خوش حال بھی تھے۔ لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے، اس لئے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔

اگرچہ مہاجرین کے لئے انصار کا گھر مہمان خانۂ عام تھا، تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ مہاجرین نذر اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دست و بازو سے کام لینے کے خوگر تھے، تاہم چونکہ بالکل نکھرے تھے، اور ایک حبہ تک پاس نہ تھا، اس لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خیال فرمایا کہ انصار اور ان میں رشتہ اخوت قائم کر دیا جائے۔ جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپ نے انصار کو طلب فرمایا، حضرت انسؓ بن مالک جو اس وقت دہ سالہ تھے، ان کے مکان میں لوگ جمع ہوئے، مہاجرین کی تعداد پینتالیس ۴۵ تھی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا "یہ تمہارے بھائی ہیں" پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو، اور اب وہ در حقیقت بھائی بھائی تھے۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا، کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔ سعدؓ بن الربیع جو عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے بھائی قرار پائے، ان کی دو بیویاں تھیں، عبدالرحمٰنؓ سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کر لیجئے۔ لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا (۱)۔

انصار کا مال و دولت، جو کچھ تھا، نخلستان تھے، روپے پیسے تو اس زمانہ میں تھے نہیں (۲)۔ انہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں۔ مہاجرین تجارت پیشہ تھے، اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل ناآشنا تھے، اس بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی طرف سے انکار کیا، انصار نے کہا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۲) بھی اور بعض دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے مروجہ الفاظ کے ساتھ اذان کو خواب میں دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو من جانب اللہ سمجھ کر قبول فرمایا، اور اسی کے مطابق اذان مروجہ جاری فرمائی گئی، فتح الباری و نووی و زرقانی و روض الانف باب بدء الاذان میں یہ تفصیلات بہ حوالہ و سند مذکور ہیں۔

(۱) مواخاۃ کا ذکر اور ایک ایک کا نام، ابن ہشام ص ۱۷۸ میں ہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا واقعہ صحیح بخاری کتاب المناقب باب اخاء النبی میں ہے۔ (۲) صحیح بخاری ص ۳۱۲۔

سب کاروبار ہم خود انجام دے لیں گے، جو کچھ پیداوار ہوگی اس میں نصف حصہ مہاجرین کا ہوگا، مہاجرین نے اس کو منظور کیا (۱)۔

یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا، کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کی جائداد اور مال مہاجرین کو ملتا تھا (۲)۔ اور بھائی بند محروم رہتے۔ یہ اس فرمان الٰہی کی تعمیل تھی:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ط (انفال-۸:۷۲)

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں۔

جنگ بدر کے بعد مہاجرین کو اعانت کی ضرورت نہ رہی، تو یہ آیت اتری:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ ؕ (انفال-۸:۷۵)

ارباب قرابت ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

اس وقت سے یہ قاعدہ جاتا رہا، چنانچہ کتب تفسیر و حدیث میں بہ تصریح مذکور ہے۔

سنہ ۴ھ میں بنو نضیر جب جلاوطن ہوئے اور ان کی زمین اور نخلستان قبضہ میں آئے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انصار کو بلاکر فرمایا کہ "مہاجرین نادار ہیں، اگر تمہاری مرضی ہو تو نئے مقبوضات تنہا ان کو دے دیئے جائیں، اور تم اپنے نخلستان واپس لے لو"۔ انصار نے عرض کی کہ نہیں ہمارے نخلستان بھائیوں ہی کے قبضہ میں رہنے دیجئے اور نئے بھی انھی کو عنایت فرمایئے (۳)۔

دنیا انصار کے اس ایثار پر ہمیشہ ناز کرے گی، لیکن یہ بھی دیکھو کہ مہاجرین نے کیا کیا، حضرت سعدؓ بن الربیع نے جب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر نصف لے لینے کی درخواست کی، تو انھوں نے کہا "خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے، مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے"۔ انھوں نے قینقاع کا جو مشہور بازار تھا، جاکر راستہ بتا دیا، انھوں نے کچھ گھی، کچھ پنیر خریدا، اور شام تک خرید و فروخت کی۔ چند روز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کرلی (۴) رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو یہ ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں

---

(۱) صحیح بخاری ص ۳۱۲۔ (۲) صحیح بخاری کتاب التفسیر آیہ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ۔
(۳) فتوح البلدان، مطبوعہ یورپ ص ۲۰۔ (۴) صحیح بخاری میں دو مختلف موقعوں پر یہ واقعہ مذکور ہے، (کتاب البیوع و باب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم باب اخاء النبی بین المہاجرین والانصار باب الولیمہ ولو بشاۃ)۔

تو سونا بن جاتی ہے،" ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا، اور جس دن مدینہ میں پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی (۱)۔

بعض صحابہؓ نے دوکانیں کھول لیں، حضرت ابو بکرؓ کا کارخانہ مقام سنح میں تھا، جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے (۲)، حضرت عثمانؓ بنو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید و فروخت کرتے تھے (۳)، حضرت عمرؓ بھی تجارت میں مشغول ہو گئے تھے (۴)، اور شاید ان کی اس تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی (۵)، اور صحابہؓ نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کر دی تھی، صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ پر لوگوں نے جب کثرتِ روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ صحابہ تو اس قدر روایت نہیں کرتے، تو انہوں نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے،" اور لوگ بازار میں تجارت کرتے تھے، اور میں رات دن بارگاہ نبوت میں حاضر رہتا تھا۔

پھر جب خیبر فتح ہوا تو تمام مہاجرین نے یہ نخلستان انصار کو واپس کر دیئے، صحیح مسلم باب الجہاد میں ہے:

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لما فرغ من قتال اهل خيبر وانصرف الى المدينة رد المهاجرون الى الانصار منائحهم التى كانوا منحوهم من ثمارهم.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ خیبر سے فارغ ہوتے اور مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت میں تھے، واپس کر دیئے۔

مہاجرین کے لئے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس جو افتادہ زمینیں تھیں، ان کو دے دیں، اور جن کے پاس زمین نہ تھی انہوں نے اپنے مسکونہ مکانات دے دیئے، سب سے پہلے حضرت حارثہؓ بن نعمان نے اپنی زمین پیش کی، بنو زہرہ مسجد نبوی کے عقب میں آباد ہوئے، حضرت عبد الرحمنؓ بن عوف نے یہاں ایک قلعہ (جس کو گڑھی کہنا زیادہ موزوں ہو گا) بنوایا، حضرت زبیرؓ بن العوام کو ایک وسیع زمین ہاتھ آئی، حضرت عثمانؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت عبیدؓ کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو میں زمینیں دیں (۶)۔

---

(۱) اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۱۳ و ۳۱۵ وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ (۲) ابن سعد ج ۳ ص ۱۳۱۔ (۳) مسند امام ابن حنبل جلد ۱ ص ۶۲۔ (۴) مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۴۰۰۔ (۵) ابن حنبل جلد ۴ ص ۳۴۷۔ (۶) یہ پوری تفصیل معجم البلدان مدینہ منورہ کے ذکر میں ہے۔

مواخاۃ کے رشتہ سے جو لوگ آپس میں بھائی بھائی بنے ،ان میں بعض حضرات کے نام یہ ہیں (۱) :-

انصار	مہاجرین
حضرت خارجہؓ بن زید انصاری	حضرت ابو بکرؓ
حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری	حضرت عمرؓ
حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری	حضرت عثمانؓ
حضرت سعدؓ بن معاذ انصاری	حضرت ابو عبیدہؓ جراح
حضرت سلامۃؓ بن وقش	حضرت زبیرؓ بن العوام
حضرت ابو ایوبؓ انصاری	حضرت مصعبؓ بن عمیر
حضرت حذیفہؓ بن یمان	حضرت عمارؓ بن یاسرؓ
حضرت منذرؓ بن عمرو	حضرت ابو ذر غفاریؓ
حضرت ابو درداؓ	حضرت سلمان فارسیؓ
حضرت ابو رویحہؓ	حضرت بلالؓ
حضرت عبادؓ بن بشر	حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ
حضرت ابیؓ بن کعب	حضرت سعیدؓ بن زیدؓ بن عمرو بن نفیل

مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لئے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چند روزہ انتظام ہو جائے ،لیکن در حقیقت یہ عظیم الشان اغراضِ اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا ۔

اسلام تہذیبِ اخلاق و تکمیلِ فضائل کی شہنشاہی ہے ،اس سلطنت الٰہی کے لئے وزراء ، اربابِ تدبیر ، سپہ سالارانِ لشکر ،ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں ،شرفِ صحبت کی برکت سے مہاجرین میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا ،اور ان میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ ان کی

(۱) یہ تفصیل ابن ہشام صفحہ ۱۰۹ میں ہے ۔

درسگاہ تربیت سے اور اربابِ استعداد بھی تربیت پاکر نکلیں، اس بنا پر جن لوگوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا گیا، ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحاد مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لئے ضرور ہے، تفحص اور استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا، دونوں میں یہ اتحادِ مذاق ملحوظ رکھا گیا، اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سیکڑوں اشخاص کی طبیعت اور فطرت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا قریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شانِ نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔

حضرت سعیدؓ بن زید عشرہ مبشرہ میں ہیں، ان کے والد زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہو چکے تھے، اور گویا اسلام کے مقدمۃ الجیش تھے، حضرت سعیدؓ نے ان ہی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی، اس لئے اسلام کا نام سننے کے ساتھ انہوں نے لبیک کہا، ان کی ماں بھی ان کے ساتھ یا ان سے پہلے اسلام لائیں، حضرت عمرؓ انہی کے گھر میں اور ان ہی کی ترغیب سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے، علم و فضل کے لحاظ سے فضلائے صحابہ میں تھے، ان کی اخوت حضرت ابیؓ بن کعب سے قائم کی گئی، جنھوں نے یہ مرتبہ حاصل کیا کہ حضرت عمرؓ ان کو سید المسلمین کہتے تھے، بارگاہ نبوت میں منصبِ انشاء پر سب سے پہلے وہی ممتاز ہوتے، فنِ قراءت کے وہ امام تسلیم کئے جاتے ہیں (۱)۔

حضرت ابو حذیفہؓ عتبہ بن ربیعہ کے فرزند تھے، جو قریش کا رئیس اعظم تھا، اس مناسبت سے ان کو حضرت عبادؓ بن بشر کا بھائی بنایا گیا، جو قبیلۂ اشہل کے سردار تھے۔

حضرت ابو عبیدہؓ جراح جن کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے امین الامۃ کا خطاب دیا تھا، ایک طرف تو فاتحِ شام ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، دوسری طرف اسلام کے مقابلہ میں پدری اور فرزندی کے جذبات ان پر کچھ اثر نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ غزوہ بدر میں جب ان کے باپ ان کے مقابلہ میں آئے تو انہوں نے پہلے حقوقِ ابوت کی مراعات کی، لیکن بالآخر اسلام پر باپ کو نثار کر دینا پڑا، ان کی تربیت میں حضرت سعدؓ بن معاذ دیئے گئے، جو قبیلۂ اوس کے رئیس اعظم تھے، ان میں بھی ایثار کا یہ وصف نمایاں طور پر نظر آتا ہے، بنو قریظہ ان کے حلیف تھے، اور عرب میں حلیف کا رشتہ اخوت اور ابوت کے برابر ہوتا تھا، تاہم غزوہ بنی قریظہ میں جب

---

(۱) اصابہ ذکر ابی بن کعب،

اسلام کا مقابلہ پیش آیا تو انہوں نے اپنے چار سو حلیفوں کو اسلام پر نثار کر دیا۔

حضرت بلالؓ اور حضرت ابو رویحہؓ، حضرت سلمانؓ فارسی، اور حضرت ابو درداؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر، حضرت حذیفہؓ بن یمان، حضرت مصعبؓ اور حضرت ابو ایوبؓ میں وہ وحدت موجود تھی جس کی بدولت نہ صرف شاگرد بلکہ استاد بھی شاگرد سے اثر پذیر ہو سکتا تھا، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف مدینہ میں آئے، تو پنیر سر پر رکھ کر بیچتے تھے، حضرت سعدؓ بن الربیع کی صحبت میں جو امیر الامراء تھے، دولت اور امارت کے جس درجہ پر پہنچے، ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

انصار نے مہاجرین کی مہمانی اور ہمدردی کا جو حق ادا کیا، دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں، انہوں نے عرض کی کہ "پہلے ہمارے بھائی مہاجروں کو اتنی ہی زمین عنایت فرمائیے تب ہم لینا منظور کریں گے (۱)۔

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کہ سخت بھوکا ہوں، آپؐ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب آیا کہ "صرف پانی" آپؐ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کوئی ہے؟ جو ان کو آج اپنا مہمان بنائے، حضرت ابو طلحہؓ نے عرض کی "میں حاضر ہوں" غرض وہ اپنے گھر لوا گئے، لیکن وہاں بھی برکت تھی، بیوی نے کہا صرف بچوں کا کھانا موجود ہے، انہوں نے بیوی سے کہا کہ چراغ بجھا دو، اور وہی کھانا مہمان کے سامنے لا کر رکھ دو، تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے، میاں بیوی بھوکے بیٹھے رہے اور اس طرح ہاتھ چلاتے رہے کہ گویا کھا رہے ہیں، اسی واقعہ (۲) کے بارہ میں یہ آیت اتری ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر۔ ۵۹: ۹)

اور گو ان کو خود تنگی ہو تاہم اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

صفہ اور اصحابِ صفہ

اصحابِ صفہ اسلامی لغت کا ایک متداول لفظ ہے، گو اس کی حقیقت سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں۔

"صفہ" سائبان کو کہتے ہیں، یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبویؐ کے ایک کنارے پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا، صحابہ میں سے اکثر تو مشاغل دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت

---

(۱) صحیح بخاری فضائل انصار۔ (۲) صحیح بخاری و فتح الباری فضائل الانصار۔

یا زراعت وغیرہ بھی کرتے تھے، لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تربیت پذیری پر نذر کردی تھی، ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے، اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے، ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لئے کچھ کھانا مہیا کرتی۔

یہ لوگ دن کو بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑ رہتے، حضرت ابوہریرہؓ بھی انہی لوگوں میں تھے، ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہمد دونوں چیزیں کبھی ساتھ مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی، اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے، اور چھت میں لگا دیتے، کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں یہ اٹھا کر کھالیتے، کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، یہ لوگ آکر شریک نماز ہوتے، لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے، باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں (۱)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو مسلم ان کے پاس بھیج دیتے، اور جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلالیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے، یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعدؓ بن عبادہ نہایت فیاض اور دولت مند تھے، وہ کبھی کبھی اسی اسی ۸۰-۸۰ مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے (۲)، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہؓ زہرا نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں، مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا کہ "یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں"۔ (۳) راتوں کو عموماً یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے، ان کے لئے ایک معلم مقرر تھا، اس کے پاس جا کر

---

(۱) صحیح ترمذی باب معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (۲) زرقانی (ج ۱ ص ۴۳، مصر) ذکر اصحابِ صفہ و مسجد نبوی
(۳) زرقانی (ج اول ص ۲۴۷ دار الطباعۃ میریہ مصر) ذکر اصحاب صفہ۔

پڑھتے (۱)، اسی بنا پر ان میں سے اکثر قاری کہلاتے تھے، دعوت اسلام کے لئے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوۂ معونہ میں انہی میں سے ستر، ۷۰ آدمی اسلام سکھانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

ان کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی، کل مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی، لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد نہیں ہوئی، نہ صفہ میں اس قدر گنجائش تھی، ان لوگوں کا مفصل (۲) حال ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی ۳۰۴ھ (جو ابن مندہ کے استاذ تھے) نے ایک الگ تصنیف میں لکھا ہے، سلمی نے بھی ان کے حالات میں ایک الگ کتاب لکھی ہے (۳)۔

مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ

مورخین عرب کا بیان ہے کہ مدینہ کے یہود نسلاً یہودی تھے، اور اس تقریب سے عرب میں آئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو عمالقہ کے مقابلہ کے لئے بھیجا تھا، لیکن تاریخی قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، یہود گو تمام دنیا میں پھیلے، لیکن انہوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے، آج بھی وہ جہاں ہیں اسرائیلی نام رکھتے ہیں، بخلاف اس کے عرب کے یہودیوں کے نام نضیر، قینقاع، مرحب، حارث وغیرہ ہوتے تھے، جو خالص عربی نام ہیں، یہودی عموماً بزدل اور دنی الطبع ہوتے ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے لڑنے کے لئے کہا تو بولے:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَا	تم مع اپنے خدا کے جاؤ اور لڑو ہم یہاں
اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ۔ ۵: ۲۴)	بیٹھے رہیں گے۔

بخلاف اس (۴) کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر، شجاع اور بہادر تھے۔

ان قرائن عقلی کے علاوہ ایک بڑے مورخ (یعقوبی) نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے جو یہودی بن گئے تھے۔

(۱) مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۷۔ (۲) (حافظ سیوطی نے دو صفحہ کا ایک رسالہ اصحاب صفہ کے نام سے لکھا ہے، اس رسالہ میں سو آدمیوں کے نام بہ ترتیب ہجا مذکور ہیں)۔ (۳) اصحاب صفہ کا حال بخاری باب المغازی وغیرہ اور صحیح مسلم میں جستہ جستہ مذکور ہے، زرقانی نے اور کتابوں سے لے کر اضافہ کیا ہے، میں نے یہ واقعات بخاری و مسلم کے علاوہ زرقانی ہی کے حوالہ سے لکھے ہیں (نیز مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۱۳۷ میں بھی ہیں)۔ (۴) مسٹر مرگولیوس نے یہود کے متعلق تفصیل سے محققانہ بحث کی ہے، ان کا میلان رائے یہ ہے اور غالباً صحیح ہے کہ یہودیوں کی اس بڑی آبادی میں ایک دو خاندان اصل یہودی بھی تھے، مگر عرب جو یہودی ہوتے گئے وہ بھی ان میں شامل ہوتے گئے۔

ثم كانت وقعة بني نضير وهم فخذ من جذام الا انهم تهودوا...... وكذلك قريظة (۱)

پھر بنو نضیر کا معرکہ ہوا، یہ قبیلہ جذام کا ایک خاندان تھا لیکن یہودی ہو گیا تھا اور اسی طرح قریظہ بھی۔

مورخ مسعودی نے بھی کتاب الاشراف والتنبیہ (۲) میں ایک روایت لکھی ہے کہ "یہ جذام کے قبیلہ سے تھے، کسی زمانہ میں عمالقہ سے اور ان کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور شام سے نقلِ مکان کر کے حجاز چلے آئے"۔

یہ تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر، اور قریظہ، مدینہ کے اطراف میں آباد تھے، اور مضبوط برج اور قلعے بنا لیے تھے۔

انصار کے جو دو قبیلے تھے، یعنی اوس اور خزرج، ان میں باہم جو اخیر معرکہ ہوا تھا، (جنگ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا، یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں۔

ان اسباب کی بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں، آپؐ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا، جس کو دونوں فریق نے منظور کیا، یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے، خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ خوں بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، اب بھی قائم رہے گا۔

۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا۔

۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

۴۔ یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

۵۔ کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔

۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہو گا تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے۔

۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریکِ صلح ہو گا، لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

---

(۱) یعقوبی جلد ۲ ص ۴۹۔ (۲) مطبوعہ یورپ ص ۲۴۷۔

واقعات متفرقہ

اس سال انصار میں سے دو نہایت معزز شخصوں نے جو مقربین خاص میں تھے، وفات پائی، حضرت کلثومؓ بن ہدم اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ، کلثومؓ وہ شخص ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب قبا میں تشریف لائے تو انہی کے مکان میں ٹھہرے، اکثر بڑے بڑے صحابہ بھی انہی کے گھر اترتے تھے، حضرت اسعدؓ بن زرارہ ان چھ شخصوں میں ہیں، جنھوں نے سب سے پہلے مکہ میں جاکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اور ابن سعد کی روایت کے موافق ان چھ شخصوں میں جس نے سب سے پہلے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا، یہی اسعدؓ تھے، یہ فخر بھی انہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہی نے مدینہ میں آکر جمعہ کی نماز قائم کی۔

چونکہ یہ قبیلۂ بنی نجار کے نقیب تھے، اس لئے ان کی وفات کے بعد اس قبیلہ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کی کہ ان کے بجائے کوئی شخص اس منصب پر مقرر کیا جائے، چونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی شخص مقرر ہوگا تو اوروں کو رشک ہوگا، اس لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ "میں خود تمہارا نقیب ہوں" (۱)۔ چونکہ آپؐ کی ننہال اسی قبیلہ میں تھی اس لئے اور قبائل کو رشک اور منافرت کا موقع نہ تھا۔

حضرت اسعدؓ کی وفات کا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہایت صدمہ ہوا، منافقین اور یہود نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر پیغمبر ہوتے تو ان کو یہ صدمہ کیوں پہنچتا"۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا:

لا املک لنفسی ولا لصاحبی	میں اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے خدا کے
من اللہ شئیا (طبری۔ ص ۱۲۶۱)	ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ عین اسی زمانہ میں دو بڑے رئیسانِ کفر نے بھی وفات پائی، یعنی ولید بن المغیرہ جو حضرت خالدؓ کا باپ تھا اور عاص بن وائل سہمی جس کے بیٹے حضرت عمروؓ بن عاص ہیں، جو فاتحِ مصر اور حضرت امیر معاویہؓ کے وزیر اعظم تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ولادت ہوئی، ان کے والد حضرت زبیرؓ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پھوپھیرے بھائی تھے، اور ان کی والدہ (حضرت اسماء)

(۱) طبری ص ۱۲۶۱ و ۱۲۶۲۔

حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی اور حضرت عائشہؓ کی بے مات بہن تھیں۔ اب تک مہاجرین میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہودیوں نے جادو کر دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے تو مہاجرین نے خوشی کا نعرہ مارا۔

اب تک نمازوں میں صرف دو رکعتیں تھیں۔ اب ظہر، عصر، عشاء میں چار چار ہو گئیں لیکن سفر کے لئے اب بھی وہی دو رکعتیں قائم رہیں۔

☆☆☆☆☆☆

سنہ ۲ھ

تحویلِ قبلہ و آغازِ غزوات

(اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام اپنے لئے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے، جو اب ۴۰ کرور قلوب کا مرکز ہے (۱)، دوسرا یہ کہ دشمنانِ اسلام اب مخالفت کے لئے تلوار اٹھاتے ہیں، اور مسلمان اس کی مدافعت کے لئے تیار ہوتے ہیں)

تحویل قبلہ، شعبان سنہ ۲ھ

ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے، جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہو سکتی، اسلام نے یہ شعار قبلہ نماز قرار دیا جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حکم و اسرار کا جامع ہے، اسلام کا خاص نمایاں وصف مساوات عام، جمہوریت اور توحید عمل ہے، یعنی تمام مسلمان یکساں اور متحد الجہتہ نظر آئیں، مذہب اسلام کا رکن اعظم نماز ہے، جس سے ہر روز پانچ وقت کام پڑتا ہے، نماز کی اصلی صورت یہ ہے کہ جمعیت اور افرادِ کثیر کے ساتھ ادا کی جائے، لیکن اس طرح کہ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی منفرد ہستیاں مٹ کر ایک ہستی بن جائے، اسی بنا پر نماز جماعت میں ایک امام ہوتا ہے، کہ مقتدیوں کی ایک ایک حرکت اس کے اشاروں سے وابستہ ہوتی ہے، اس لئے ضرور ہے کہ سب کا مرجع عمل بھی ایک نظر آئے، یہی اصول ہے جس کی بنا پر نماز کا ایک قبلہ قرار پایا اور اس شعار کا دائرہ اس قدر وسیع کیا گیا کہ اس قبلہ کی طرف رخ کرنا ہی کفر کے دائرہ سے نکل آنا ہے، اب صرف یہ بحث باقی تھی کہ قبلہ کس سمت قرار دیا جائے، یہودی اور عیسائی بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے، کیوں کہ ان کی قومی اور مذہبی ہستی بیت المقدس سے وابستہ تھی، لیکن ابراہیمؑ بت شکن کے جانشین کے لئے صرف کعبہ قبلہ ہو سکتا تھا، جو اس موحد اعظم کی یادگار اور توحید خالص کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تک مکہ میں تھے، دو ضرورتیں ایک ساتھ درپیش تھیں، ملت ابراہیمی کی تاسیس و تجدید کے لحاظ سے کعبہ کی طرف رخ کرنے کی ضرورت تھی،

(۱) اب یہ تعداد ایک ارب سے زائد ہو گئی ہے۔

لیکن یہ مشکل تھی کہ قبلہ کی جو اصلی غرض ہے، یعنی امتیاز اور اختصاص، وہ نہیں حاصل ہوتی تھی، کیوں کہ مشرکین اور کفار بھی کعبہ ہی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے، اس بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مقامِ ابراہیم کے سامنے نماز ادا کرتے تھے، جس کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا، اس طرح دونوں قبلے سامنے آجاتے تھے، مدینہ میں دو گروہ آباد تھے، مشرکین جن کا قبلہ کعبہ تھا، اور اہل کتاب جو بیت المقدس کی سمت نماز ادا کرتے تھے، شرک کے مقابلہ میں یہودیت اور نصرانیت دونوں کو ترجیح تھی، اس لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مدت یعنی تقریباً سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی، لیکن جب مدینہ میں اسلام زیادہ پھیل گیا تو اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اصل قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رخ کیا جاتا، اس بنا پر یہ آیت اتری اور دفعۃً قبلہ بدل گیا (۱)۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ	تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر دو
وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ	اور جہاں کہیں رہو اسی طرف منہ
شَطْرَهُ (بقرہ۔ ۲: ۱۴۴)	پھیر دو۔

تحویلِ قبلہ نے یہودیوں کو سخت برہم کر دیا، ان کو مشرکین کے مقابلہ میں مذہبی تفوق کا دعویٰ تھا اور اسلام سے پہلے مشرکین بھی ان کے مذہبی امتیاز کے معترف تھے، یہاں تک کہ (جیسا ابو داؤد میں روایت ہے) جن لوگوں کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی، وہ منتیں مانتے تھے کہ بچہ زندہ رہے تو ہم اس کو یہودی بنائیں گے، اسلام نے ان کے اس مذہبی اعزاز کو صدمہ پہنچایا، تاہم چونکہ اب تک اسلام کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا، اس لئے وہ فخر کرتے تھے کہ اسلام بھی ان ہی کے قبلہ کی طرف رخ کرتا ہے، جب اسلام نے قبلہ بھی بدل دیا تو ان کی ناراضی اور برہمی کا پیالہ بالکل لبریز ہو گیا، انھوں نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چونکہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرنا چاہتے ہیں، اس لئے قبلہ بھی مخالفت کے ارادہ سے بدل دیا ہے، دودلے اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ قبلہ بدلنے کی چیز نہیں اور اس سے بے استقلالی اور تزلزل اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے، اس بنا پر قبلہ کی اصلیت اور ضرورت اور تحویل قبلہ کے مصالح کے متعلق چند آیتیں اتریں جن سے مشکلیں حل ہوتی ہیں۔

(۱) اس مضمون میں جس قدر واقعات ہیں وہ صحیح بخاری (حدیث قبلہ نماز) اور فتح الباری شرح صحیح بخاری سے ماخوذ ہیں۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (بقرہ۔ ۲: ۱۴۲)

سفہا یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا، اس سے ان کو کس نے پھیر دیا، کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ (بقرہ۔ ۲: ۱۴۳)

تیرا جو پہلے قبلہ تھا (کعبہ) اس کو جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے، اور بے شبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے، بجز ان لوگوں کے جن کو خدا نے ہدایت کی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۝ (بقرہ۔ ۲: ۱۷۷)

پورب پچھم رخ کرنا ہی کوئی ثواب کی بات نہیں، ثواب تو یہ ہے کہ آدمی خدا پر، قیامت پر، ملائکہ پر، خدا کی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے اور خدا کی محبت میں عزیزوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو سائلوں کو، غلاموں کو (آزاد کرانے میں) اپنی دولت دے۔

ان آیتوں میں خدا نے پہلے یہ بتایا کہ قبلہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، خدا کی عبادت کے لئے پورب پچھم سب برابر ہیں، خدا ہر جگہ ہے ہر سمت ہے، ہر طرف ہے، پھر قبلہ کی تعیین کی ضرورت بتائی، کہ وہ اختصاصی شعار ہے، اور اصلی اور نمائشی مسلمانوں کو الگ کر دیتا ہے، بہت سے یہودی تھے، جو منافقانہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں بھی شرکت کرتے تھے، یہ اسلام کے لئے مارِ آستین تھے، لیکن جب قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ سے بدل گیا، تو نفاق کا راز بالکل فاش ہو گیا، کوئی یہودی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ جو چیز اس کی قومیت، مذہب بلکہ اس کی ہستی کی بنیاد ہے (یعنی بیت المقدس) اسی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے، پھر دوبارہ خدا نے اس نکتہ کو زیادہ واضح کر دیا کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رخ کرنا اصلی ثواب نہیں، بلکہ ثواب درحقیقت ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نام ہے۔

سلسلۂ[1] غزوات

کیا عجیب بات ہے، ارباب سیر، مغازی کی داستان جس قدر زیادہ دراز نفسی، اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں، یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے، کیوں کہ اس کو اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے، اس کے نقش ونگار کے لئے لہو کے چند قطرے نہیں، بلکہ چشمہ ہائے خون درکار ہیں۔

یورپ کے تمام مورخوں نے سیرت نبویؐ کو اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائیں۔

لیکن یہ خیال چونکہ واقع میں غلط اور سرتاپا غلط ہے، اس لئے مغازی کی ابتدا سے پہلے ضرور ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام جب تک مکہ میں تھا، مصائب گوناگوں کا آماج گاہ تھا مدینہ میں آکر اس کی کلفتیں دور ہوئیں، مگر یہ خیال صحیح نہیں، مکہ میں جو مصیبت تھی، گو سخت تھی، لیکن تنہا اور منفرد تھی، مدینہ میں آکر وہ متعدد اور گوناگوں بن گئی، مکہ کل ایک قوم تھا، مدینہ میں انصار کے ساتھ یہود بھی تھے، جو عادات، خصائل، مذہب اور دیانت میں انصار سے بالکل مختلف اور ان کے حریف مقابل تھے، اس پر ایک تیسری قسم (منافقین) کا اضافہ ہوا، جو مار آستین ہونے کی وجہ سے دونوں سے زیادہ خطرناک تھے، مکہ اگر قابو میں آجاتا تو حرم کی وسعت اثر کی وجہ سے تمام عرب کی گردنیں خم ہو جاتیں، لیکن مدینہ کا اثر چار دیواری تک محدود تھا، مدینہ اب تک بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا، لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قیام گاہ ہونے نے اس کو قریش کے غیظ وغضب کا تاراج گاہ بنا دیا۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مکہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبداللہ بن ابی کو جو واقعۂ ہجرت کے قبل رئیس الانصار تھا، اور انصار نے اس کی تاج پوشی کی

---

(۱) غزوات کا سلسلہ جن اسباب سے پیدا ہوا اور جس قسم کے واقعات غزوات میں پیش آئے ان کے لئے ہم نے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، کیوں کہ ضمنی طریقے سے وہ ادا نہیں ہو سکتے تھے، لیکن یہ عنوان اچھی طرح سے اسی وقت ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ تمام غزوات سرسری نظر سے گذر جائیں، اس لئے ہم نے اس کو تمام غزوات کے بعد لکھا ہے، ناظرین ابھی سے اس کا خیال رکھیں۔

شاہانہ رسم ادا کرنے کے لئے تیاری کر لی تھی (۱)، خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

انکم آویتم صاحبنا وانا نقسم باللّٰہ لتقاتلنّہ او تخرجنہ او لنسیرنّ الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم و نستبیح نسآئکم

(سنن ابوداؤد ص ۶۷ ج ۲ باب خبر النضیر)

تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔

جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپؐ عبداللہ کے پاس تشریف لے گئے، اس کو سمجھایا کہ "کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے"۔ چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے، اس لئے عبداللہ اس نکتہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا، بدر کے بعد پھر قریش نے اسی مضمون کا خط لکھا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(تاہم قریش کی شہ سے منافقین و یہود مدینہ کا سر پھر چکا تھا، اسی زمانہ میں یعنی بدر سے پہلے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بنو الحارث بن خزرج کے محلہ میں سوار ہو کر تشریف لے گئے، ایک جگہ مشرکین و منافقینِ مدینہ، یہود اور بعض مسلمان بیٹھے تھے، گدھے کے چلنے سے گرد اڑی تو عبداللہ بن ابی نے منہ پر کپڑا ڈال دیا، اور حقارت سے بولا "گرد نہ اڑاؤ"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع کو سلام کیا، اور کچھ قرآن کی آیتیں سنائیں، عبداللہ نے کہا (۲) "اے شخص مجھ کو یہ پسند نہیں، اگر تمہاری بات سچ بھی ہو تو ہماری مجلس میں آکر ہم کو نہ ستایا کرو، جو تمہارے پاس جائے اس سے بیان کیا کرو"۔ مسلمان اس تحقیر سے برافروختہ ہو گئے، اور قریب تھا کہ کشت و خون ہو جائے، آخر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دونوں کو ٹھنڈا کیا۔)

اسی زمانہ کے قریب حضرت سعدؓ بن معاذ جو قبیلۂ اوس کے رئیس الاعظم تھے، عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ گئے، امیہ بن خلف سے اور ان سے مدت کا یارانہ تھا، اور یہ تعلق اسلام کے بعد بھی قائم رہا، اس تعلق سے حضرت سعدؓ اب بھی امیہ ہی کے مہمان ہوئے، ایک دن وہ امیہ کو لے کر کعبہ کے طواف کو نکلے، اتفاق سے ابو جہل سامنے آگیا، امیہ سے اس نے پوچھا کہ یہ

---

(۱) بخاری باب (التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین) "س" (۲) صحیح مسلم صفحہ ۹۳ جلد ۲، بخاری باب مذکور۔

تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا "سعد ہیں"۔ ابو جہل نے کہا "تم لوگوں نے صابیوں (کفار، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اہل اسلام کو صابی یعنی مرتد کہتے تھے) کو پناہ دی ہے۔ میں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم کعبہ میں آسکو۔ خدا کی قسم اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو بچ کر واپس نہیں جاسکتے تھے"۔ حضرت سعدؓ نے کہا "اگر تم نے ہم کو حج سے روکا، تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ روک دیں گے" (۱) (یعنی شام کی تجارت کا راستہ)

حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے، سب قریش کے زیر اثر تھے (۲)۔ اس بنا پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا۔ ہجرت کے چھٹے سال تک یمن وغیرہ کے لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس نہیں پہنچ سکتے تھے، چنانچہ سنہ ۶ھ میں جب بحرین سے عبدالقیس کی سفارت آئی تو لوگوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں عرض کی کہ مضر کے قبائل ہم کو آپؐ تک پہنچنے نہیں دیتے، اس لئے ہم صرف ایام حج میں جب کہ لڑائی عموماً موقوف ہو جاتی ہے، آپؐ کی خدمت میں آسکتے ہیں (۳)۔

قریش نے انہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جیسا کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا اس کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلام کا استیصال کر دیں۔ مدت تک یہ حال رہا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) راتوں کو جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے، صحیح نسائی میں ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول جب مدینہ
اول ماقدم المدینۃ یسھر من اللیل	میں آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے۔

صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا"۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بن وقاص نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا، تب آپؐ نے آرام فرمایا۔ اس سے بڑھ کر حاکم کی روایت ہے، جس کے یہ الفاظ ہیں:

---

(۱) یہ پورا واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری باب المغازی کی ابتدا میں مذکور ہے۔ (۲) ابن ہشام واقعات وفود میں ہے وذالک ان قریشا کانوا امام الناس .... وقادۃ العرب لا ینکرون ذالک وکانت قریش ھی التی نصبت العرب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (۳) وفد بنی عبدالقیس کے ذکر میں صحیح بخاری اور دیگر تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

عن ابی بن کعب قال لما قدم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم واصحابہ المدینۃ وآوتھم الانصار رمتھم العرب عن قوس واحدۃ وکانو الایبیتون الابالسلاح ولا یصبحون الافیہ (۱)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ جب مدینہ آئے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ ان سے لڑنے کو آمادہ ہوگئے، صحابہ (رضی اللہ عنہم) صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔

مورخین مغازی کی ابتدا انہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال خدا نے جہاد کی اجازت دی۔ لیکن ایک نے قیقہ بیں انہی کی تصریحات سے پتہ لگا سکتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ مواہب لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ خدا نے ۱۲/ صفر سنہ ۲ ھ میں جہاد کی اجازت دی۔ اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

اول آیۃ نزلت فی الاذن بالقتال اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُ (زرقانی بحوالہ صحیح نسائی جلد ۱ ص ۳۴۸)	پہلی آیت جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی وہ یہ ہے اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ الخ یعنی جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیوں کہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے اور خدا ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔

تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے:

وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ (بقرہ۔ ۲: ۱۹۰)	اور خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو۔ جو تم سے لڑتے ہیں۔

لیکن غور سے دیکھو کہ دونوں آیتوں میں انہی لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانوں سے لڑنے آتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت مسلمان لڑنے پر مجبور کئے جاتے تھے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے پہلا

---

(۱) لباب فی اسباب النزول للسیوطی سورہ نور آیت وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ الخ مسند دارمی میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔

کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی، بلکہ انصار کی بھی، کیوں کہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا، اور اپنے تمام قبائلِ متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی، اس بنا پر آپؐ نے دو تدبیریں اختیار کیں، اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو ان کا مایۂ غرور تھی، بند کر دی جائے، تاکہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں، اور یاد ہوگا کہ حضرت سعدؓ بن معاذ نے مکہ میں ابو جہل کو اسی کی دھمکی دی تھی، دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب و جوار کے جو قبائل ہیں، ان سے امن و امان کا معاہدہ ہو جائے۔

بدر سے پہلے جو مہمیں بھیجی گئیں

(غرض ان حالات کی بنا پر غزوۂ بدر سے پہلے سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں، ابواء کی مہم سے پہلے بذاتِ خاص آپؐ نے کسی مہم میں شرکت نہیں کی، اس ابواء کی مہم سے پہلے جو صفر سنہ ۲ ھ میں واقع ہوئی اور جس میں آپؐ نے خود شرکت فرمائی تھی، اربابِ سیر نے تین مہموں کا ذکر کیا ہے، جن کو ان کی زبان میں "سریہ" کہتے ہیں، سریہ، حمزہ، سریہ، عبیدہ بن حارث، سریہ، سعد بن ابی‌ؓ وقاص، لیکن ان میں سے کسی مہم میں کوئی کشت و خون نہیں ہوا، یا تو بیچ بچاؤ ہو گیا، یا بچ کر نکل گئے، اربابِ سیر نے ان سرایا کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ قریش کے تجارتی قافلہ کو چھیڑنے کے لئے بھیجے جاتے تھے، یعنی حضرت سعدؓ کی تہدید کے مطابق ان کی شامی تجارت کو بند کرنا مقصود تھا، مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن یہ الزام کس قدر جہالت پر مبنی ہے کہ اول تو اسلام کی شریعت میں یہ سخت تر گناہ ہے، ثانیاً واقعہ کیا بتاتا ہے؟ کیا ان میں سے کسی مہم میں بھی یہ مذکور ہے کہ صحابہؓ نے قافلہ کا مال لوٹ لیا؟ ثالثاً اگر ان سرایا کا مقصد لوٹنا اور ڈاکہ ڈالنا ہی ہوتا تھا تو قریش کے قافلۂ تجارت کے سوا یہ مقصد کہیں اور نہیں حاصل ہو سکتا تھا؟)

جہینہ

اطراف کے جن قبائل کے پاس معاہدہ کے لئے مہم بھیجی گئی، ان میں سب سے پہلے جہینہ کا قبیلہ ہے، جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا، اور ان کا کوہستان دور تک پھیلا ہوا تھا، ان سے معاہدہ ہوا کہ وہ فریقین سے یکساں تعلقات رکھیں گے (۱)۔

(۱) اس واقعہ کا ذکر مورخین نے مستقل طور پر نہیں کیا، بلکہ جہاں سب سے پہلے سریہ، ضمرہ کا ذکر کیا ہے وہاں مجدی جہینی (رئیس قبیلہ) کی نسبت لکھا ہے کان موادعا للفریقین یعنی اس نے دونوں فریق سے صلح کر رکھی تھی۔

یعنی دونوں سے الگ رہیں گے۔

صفر سنہ ۲ھ میں آپؐ ساٹھ ۶۰ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ابواء تک گئے (جس کے قریب ہی غزوہ ابواء یا غزوہ ودّان واقع ہوا ہے) اور جہاں آپؐ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے۔ابواء کا صدر مقام فرع ہے، جو ایک وسیع قصبہ ہے، اور جہاں قبیلۂ مزینہ آباد ہے اور جو مدینہ سے تقریباً ۸ منزل (۸۰ میل) ہے، یہ مدینہ کی اخیر سرحد ہے، ان اطراف میں قبیلۂ بنو ضمرہ آباد تھا، اور یہ نواح ان کی حدود حکومت میں داخل تھے، یہاں آپؐ نے چند روز قیام کر کے بنو ضمرہ سے معاہدہ کیا جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا، معاہدہ کے یہ الفاظ تھے:

هذا كتاب من محمد رسول الله لبني ضمرة فانهم آمنون على اموالهم وانفسهم وان لهم النصر على من رامهم الا ان يحاربوا في دين الله مابل بحر صوفة وان النبي اذا دعاهم لنصره اجابوه الخ۔
(روض الانف (ج ۲ ص ۵۸) وزرقانی ج ۱ ص ۳۵۹)

یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر ہے بنو ضمرہ کے لئے، ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا، اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا، اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی، بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لئے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔

تمام محدثین مغازی کی ابتداء اسی واقعہ سے کرتے ہیں، صحیح بخاری میں بھی اسی کو اول الغزوات قرار دیا ہے۔

قریباً ایک مہینہ کے بعد کرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے رؤسا میں تھا (۱)، مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مویشی لوٹ لئے، اس کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا تھا، (کرز بعد کو مسلمان ہوئے اور فتح مکہ میں تنہا راہ چلتے شہید ہوئے)۔

جمادی الثانی یعنی اس واقعہ کے تیسرے مہینہ آپؐ دو سو مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور مقام ذو العشیرہ میں پہنچ کر بنو مدلج سے معاہدہ کیا، یہ مقام مدینہ سے ۹ منزل پر ینبوع کے نواحی میں ہے۔

بنو مدلج، بنو ضمرہ کے حلیف تھے، اور چونکہ بنو ضمرہ پہلے اسلام کے معاہدہ میں داخل ہو

(۱) اصابہ ذکر کرز فہری۔

چکے تھے، اس لئے انہوں نے آسانی سے یہ شرطیں منظور کر لیں (۱)۔

چند روز کے بعد یعنی رجب سنہ ۲ھ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطن نخلہ کی طرف بھیجا، یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں مکہ سے ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ کو ایک خط دے کر فرمایا تھا کہ دو دن کے بعد اس کو کھولنا، حضرت عبداللہؓ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ "مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو"۔ اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لئے آتے تھے، سامنے سے نکلے، حضرت عبداللہؓ نے ان پر حملہ کیا، ان میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور مال غنیمت ہاتھ آیا، حضرت عبداللہؓ نے مدینہ میں آکر یہ واقعہ بیان کیا، اور غنیمت کی چیزیں پیش کیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی"۔ غنیمت کو قبول کرنے سے بھی آپؐ نے انکار فرمایا، صحابہؓ نے حضرت عبداللہؓ سے نہایت برہم ہو کر کہا:

صنعتم مالم تومروا به وقاتلتم فی الشهر الحرام ولم تومروا بقتال (طبری۔ صفحہ ۱۲۷۵)	تم نے وہ کام کیا (قافلہ لوٹا) جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا، اور ماہ حرام میں لڑے، حالانکہ اس مہینہ میں تم کو لڑنے کا حکم نہ تھا۔

جو لوگ گرفتار اور قتل ہوئے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے، عمرو بن الحضرمی جو مقتول ہوا، عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا، جو حرب بن امیہ (امیر معاویہ کے دادا) کا حلیف تھا (۲)، حرب قریش کا رئیس اعظم تھا، اور عبدالمطلب کے بعد ریاست عام اسی کو حاصل ہوئی تھی، جو لوگ گرفتار ہوئے، یعنی عثمان و نوفل دونوں مغیرہ کے پوتے تھے (۳)، مغیرہ ولید کا باپ حضرت خالدؓ کا دادا، اور حرب کے بعد دوسرے درجہ کا رئیس تھا، اس بنا پر اس واقعہ نے تمام

(۱) میں تسلیم کرتا ہوں کہ مورخین نے دونوں پہلے واقعوں کی نسبت لکھا ہے کہ "ان کا مقصد قریش کے کارواں کا لوٹنا تھا، لیکن اتفاق سے کارواں ہاتھ نہ آیا اور بچ کر نکل گیا"۔ لیکن میں واقعات کا پابند ہوں، رائے اور قیاس سے غرض نہیں، اس قدر واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مقامات تک گئے، اور وہاں کے قبائل سے معاہدہ کیا، اس سے آگے مورخین کا قیاس ہے کہ قریش کے کارواں پر حملہ کرنا مقصود تھا، گو یہ مقصود نہ حاصل ہو سکا اگر خدانخواستہ کارواں کا لوٹنا ہی مقصود ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عیاذاً باللہ اس قدر بے تدبیر فرض کرنا پڑے گا کہ ہر مرتبہ ناکامیابی ہوتی تھی اور قافلہ بچ بچ کر نکل جاتا تھا، یہاں تک کہ بار بار کے تجربہ کے بعد بھی بدر میں اسی قسم کی ناکامیابی ہوئی اور قافلہ صحیح و سلامت نکل گیا۔ (۲) اصابہ ترجمہ علاء حضرمی۔ (۳) طبری ص ۱۲۷۳۔

قریش کو مشتعل کر دیا، اور ثار یعنی انتقامِ خون کی بنیاد قائم ہو گئی، معرکۂ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ سے وابستہ ہے، حضرت عروہؓ بن زبیر حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے، انہوں نے تصریح کی ہے کہ غزوہ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں، سب کا سبب یہی حضرمی کا قتل ہے، علامہ طبری لکھتے ہیں (۱):

وکان الذی هاج وقعة بدر وسائر الحروب التی کانت بین رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وبین مشرکی قریش فیما قال عروة بن الزبیر ما کان من قتل واقد بن عبداللّٰه السهمی عمرو بن الحضرمی۔

اور جس چیز نے بدر کے واقعہ کو ابھارا اور وہ تمام لڑائیاں چھیڑدیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین قریش میں پیش آئیں سب کا سبب یہی تھا، کہ واقد سہمی نے حضرمی کو قتل کر دیا تھا۔

چونکہ غزوہ بدر تمام غزوات کی اصلی بنیاد ہے، اس لئے ہم پہلے اس واقعہ کو سادہ صورت میں لکھ کر پھر تفصیل سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔

(۱) (۱۲۸۴،ص ۳)

غزوۂ بدر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ط (آل عمران۔ ٣ : ١٢٣)

رمضان سنہ ٢ھ

بدر ایک گاؤں کا نام ہے، جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے، یہ مقام اس نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گذار گھاٹیوں میں سے ہو کر گذرتا ہے، مدینہ منورہ سے قریباً ٨٠ میل کے فاصلہ پر ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کردی تھیں، عبداللہ بن ابی کو انہوں نے خط لکھ بھیجا کہ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کردو، یا ہم آکر ان کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کردیتے ہیں، قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں، کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آکر غارت گری کر گیا تھا۔

حملہ کے لئے سب سے بڑی ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست تھا، اس لئے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہوا، اس سر و سامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی کل کی کل دے دی (١)۔

نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبار تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں، ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا، قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آگیا، جس نے قریش کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا دیا۔

اسی اثنا میں یہ غلط خبر مکہ معظمہ میں پھیل گئی کہ مسلمان قافلہ کے لوٹنے کو آرہے ہیں، قریش کے غیظ و غضب کا بادل بڑے زور شور سے اٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے صحابہ کو جمع کیا اور واقعہ کا اظہار فرمایا، حضرت ابو بکرؓ وغیرہ نے جاں نثارانہ تقریریں کیں،

---

(١) ابن سعد جز ثانی قسم اول ص، میں ابوسفیان سردار قافلہ کا قول لکھا ہے۔ واللّٰہ ما بمکۃ من قرشی ولا قرشیۃ لہ نش فصاعدا الابعث بہ معنا، ہمارے مورخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی، اس لئے انہوں نے اس واقعہ کو محض ایک واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا، لیکن ان کو احساس نہیں کہ مکہ کو تمام سرمایہ کے اگل دینے کی ضرورت کیا تھی۔

لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) انصار کی طرف دیکھتے تھے، کیوں کہ انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئیں، حضرت سعدؓ بن عبادۃ (سردار خزرج) نے اٹھ کر کہا "کیا حضورؐ کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ خدا کی قسم آپؐ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں"۔

یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، بخاری میں ہے کہ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ "ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جاکر لڑیں، ہم لوگ آپ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے، پیچھے سے لڑیں گے"۔ ان کی اس تقریر سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چہرہ چمک اٹھا۔

غرض ۱۲ رمضان سنہ ۲ھ کو آپؐ تقریباً تین سو ۳۰۰ جاں نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے، ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا، جو کم عمر تھے، واپس کر دیئے گئے (۱) کہ ایسے پر خطر موقع پر بچوں کا کام نہیں، عمیرؓ بن ابی وقاص ایک کمسن بچہ تھے، جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی، عمیرؓ کے بھائی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے کمسن سپاہی کے گلے میں تلوار حمائل کی (۲)، اب فوج کی کل تعداد ۳۱۳ تھی جس میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے، چونکہ غیبت کی حالت میں منافقین اور یہود کی طرف سے اطمینان نہ تھا، اس لئے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا، اور حکم دیا کہ مدینہ کو واپس جائیں، عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی) پر عاصم بن عدی کو مقرر فرمایا، ان انتظامات کے بعد آپؐ بدر کی طرف بڑھے، جدھر سے اہل مکہ کی آمد کی خبر تھی، دو خبر رساں بسبس اور عدی آگے روانہ کر دیئے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں، روحاء، منصرف، ذات اجذال، معلاۃ، اثیل سے گذرتے ہوئے ۱۷ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے، خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آگئے ہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یہیں رک گئے، اور فوجیں اتر پڑیں۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سرو سامان سے نکلے تھے، ہزار آدمی کی جمعیت تھی، سو ۱۰۰ سواروں کا رسالہ تھا، رؤسائے قریش سب شریک تھے، ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا،

---

(۱) ابن سعد ص ۶۔ (۲) منتخب کنزالعمال بہ روایت ابن عساکر، بدر۔

اس لئے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا۔ رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس (بن مطلب) عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابو جہل، امیہ وغیرہ وغیرہ باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے (۱)۔ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔

قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابو سفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا "اب لڑنا ضرور نہیں"۔ لیکن ابو جہل نے نہ مانا، زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے۔ باقی فوج آگے بڑھی۔

قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بخلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں تک نہ تھا۔ زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریتی میں دھنس دھنس جاتے تھے، حضرت حباب ؓ بن منذر نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں عرض کی کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے، وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ "وحی نہیں ہے"۔ حضرت حباب ؓ نے کہا "تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ اور آس پاس کے کنویں بے کار کر دیئے جائیں" (۲)۔ آپ ؐ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے مینھ برس گیا، جس سے گرد جم گئی، اور جابجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لئے گئے۔ کہ وضو اور غسل کے کام آئیں۔ اس قدرتی احسان کا خدا نے قرآن مجید میں بھی ذکر کیا ہے:

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً	اور جب کہ خدا نے آسمان سے پانی
لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ (انفال - ۸: ۱۱)	برسایا کہ تم کو پاک کرے۔

پانی پر اگرچہ قبضہ کر لیا گیا، لیکن ساقی کوثر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیض عام تھا۔ اس لئے دشمنوں کو بھی پانی لینے کی عام اجازت تھی (۳)۔ یہ رات کا وقت تھا، تمام صحابہ نے کمر کھول کھول کر رات بھر آرام کیا، لیکن صرف ایک ذات تھی (ذات نبوی ؐ) جو صبح تک بیدار اور مصروف دعا رہی، صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لئے آواز دی۔ بعد نماز جہاد پر وعظ فرمایا (۴)۔

---

(۱) معارف ابن قتیبہ (باب اسماء المطعمین من قریش فی غزاۃ بدر و سیرۃ ابن اسحٰق بہ روایت ابن ہشام غزوۂ بدر۔ (۲) ابن ہشام (۳) ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۶۔ (۴) منتخب کنز العمال غزوہ بدر بہ روایت مسند ابن حنبل و ابن ابی شیبہ۔

قریش جنگ کے لئے بیتاب تھے، تاہم کچھ نیک دل بھی تھے، جن کے دل خوں ریزی سے لرزتے تھے، ان میں حکیم بن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردار فوج عتبہ سے جا کر کہا "آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادگار رہ جائے" عتبہ نے کہا کیوں کر؟ حکیم نے کہا "قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے، وہ آپ کا حلیف تھا، آپ اس کا خوں بہا ادا کر دیجئے"۔ عتبہ نیک نفس آدمی تھا، اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا، لیکن چونکہ ابو جہل کا اتفاق رائے ہونا ضرور تھا، حکیم عتبہ کا پیغام لے کر گئے، ابو جہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا، عتبہ کا پیغام سن کر بولا "ہاں عتبہ کی ہمت نے جواب دے دیا"۔ عتبہ کے فرزند حضرت ابو حذیفہؓ اسلام لا چکے تھے، اور اس معرکہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ آئے تھے، اس بنا پر ابو جہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لئے لڑائی سے جی چراتا ہے کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔

ابو جہل نے حضرمی کے بھائی عامر کو بلا کر کہا، "دیکھتے ہو! تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آ کر نکلا جاتا ہے" عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے اور گرد اڑا کر واعمراہ واعمراہ کا نعرہ مارنا شروع کیا، اس واقعہ نے تمام فوج میں آگ لگا دی۔

عتبہ نے ابو جہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا، اور کہا میدان جنگ بتا دے گا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے، یہ کہہ کر مغفر مانگا، لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہ اترا، مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا اور لڑائی کے ہتھیار سجے۔

چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ہاتھ کو خون سے آلودہ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، صحابہ نے میدان کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپؐ اس میں تشریف رکھیں، حضرت سعدؓ بن معاذ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے۔

اگرچہ بارگاہ الٰہی سے فتح و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا، عناصر عالم آمادۂ مدد تھے، ملائکہ کی فوجیں ہم رکاب تھیں، تاہم عالم اسباب کے لحاظ سے آپؐ نے اصول جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں، مہاجرین کا علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو عنایت فرمایا، خزرج کے علم بردار حضرت حبابؓ بن منذر اور اوس کے حضرت سعدؓ بن معاذ مقرر ہوئے۔

صبح ہوتے ہوتے آپؐ نے صف آرائی شروع کی، دست مبارک میں ایک تیر تھا، اس

کے اشارے سے صفیں قائم کرتے تھے، کہ کوئی شخص تل بھر آگے یا پیچھے نہ رہنے پائے، لڑائی میں شور و غل عام بات ہے لیکن منع کر دیا گیا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے۔

اس موقع پر بھی جب کہ دشمن کی عظیم الشان تعداد مقابل تھی اور مسلمانوں کی طرف ایک آدمی بھی بڑھ جاتا تو کچھ نہ کچھ مسرت ہوتی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمہ تن وفا تھے، (حضرت) حذیفہؓ بن الیمان اور (حضرت) حسیلؓ دو صحابی کہیں سے آ رہے تھے، راہ میں کفار نے روکا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کو جا رہے ہو، انہوں نے انکار کیا، اور عدم شرکت کا وعدہ کیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے، تو صورت حال عرض کی، فرمایا ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے (۱)۔

اب دو صفیں آمنے سامنے مقابل تھیں، حق و باطل؛ نور و ظلمت، کفر و اسلام۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا	جو لوگ باہم لڑے ان میں تمہارے لئے عبرت
فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	کا نشان ہے، ایک خدا کی راہ میں لڑ رہا تھا، اور
وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ (آلِ عمران۔ ۳: ۱۳)	دوسرا منکر خدا تھا۔

یہ عجیب منظر تھا، اتنی بڑی وسیع دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی، صحیحین میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی، دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے، "خدایا تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر"، محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی، اور آپؐ کو خبر تک نہ ہوتی تھی، کبھی سجدہ میں گرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ "خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے، تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا"۔

اس بے قراری پر بندگان خاص کو رقت آ گئی، حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی "حضور خدا اپنا وعدہ وفا کرے گا"، آخر روحانی تسکین کے ساتھ:

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ	فوج کو شکست دی جائے گی اور وہ پشت
(قمر۔ ۵۴: ۴۵)	پھیر دیں گے۔

پڑھتے ہوئے لب مبارک فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے۔

قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آ گئیں، تاہم آپؐ نے صحابہؓ کو پیش قدمی سے روکا،

(۱) صحیح مسلم (باب الوفا بالعهد کتاب الجهاد والسیر) ص ۔

اور فرمایا کہ جب دشمن پاس آجائیں تو تیر سے روکو۔

یہ معرکہ ایثار اور جان بازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا۔ دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں، حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے (جو اب تک کافر تھے) میدان جنگ میں بڑھے تو حضرت ابو بکرؓ (۱) تلوار کھینچ کر نکلے، عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہؓ (عتبہ کے فرزند تھے) اس کے مقابلہ کو نکلے، حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی (۲)۔

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ سب سے پہلے عامر حضرمی جس کو بھائی کے خون کا دعویٰ تھا آگے بڑھا، مہجع حضرت عمرؓ کا غلام اس کے مقابلہ کو نکلا اور مارا گیا۔

عتبہ جو سردار لشکر تھا، ابو جہل کے طعنہ سے سخت برہم تھا، سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا، اور مبارز طلبی کی، عرب میں دستور تھا کہ نامور لوگ کوئی امتیازی نشان لگا کر میدانِ جنگ میں جاتے تھے، عتبہ کے سینہ پر شترمرغ کے پر تھے، حضرت عوفؓ، حضرت معاذؓ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ مقابلہ کو نکلے، عتبہ نے نام پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصارؓ ہیں تو عتبہ نے کہا ہم کو تم سے غرض نہیں، پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف خطاب کر کے پکارا، کہ محمدؐ یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں (۳)، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ آئے، اور حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبیدہؓ میدان میں آئے، چونکہ (یہ لوگ خود پہنے تھے، جس سے چہرے چھپ گئے تھے)، (۴) عتبہ نے پوچھا تم کون ہو، سب نے نام و نسب بتائے، عتبہ نے کہا "ہاں اب ہمارا جوڑ ہے"۔

عتبہ حضرت حمزہؓ سے اور ولید حضرت علیؓ سے مقابل ہوا، اور دونوں مارے گئے، لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہؓ کو زخمی کیا، حضرت علیؓ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل

(۱) استیعاب ذکر عبدالرحمن بن ابی بکرؓ۔ (۲) سیرت ابن ہشام (۳۸۸ مطبع محمد علی مصر)۔ (۳) کتب حدیث میں، جو الفاظ ہیں، مختلف ہیں، ابو داؤد: (کتاب الجہاد) میں ہے کہ عتبہ نے کہا کہ ہم کو اپنے برادرانِ عم زاد سے غرض ہے، تم سے کام نہیں، انصاری محدثین نے اس کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ "اس سے انصار کی توہین منظور نہ تھی، بلکہ یہ غرض تھی کہ انتقام خون کا مطالبہ قریش سے ہے انصار سے نہیں" لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ مکہ والے انصار کو اپنا ہم سر نہیں سمجھتے تھے، صحیح روایتوں میں مذکور ہے کہ جب ابو جہل انصار کے ہاتھ سے مارا گیا تو مرتے وقت اس نے کہا کاش مجھ کو فلاحوں (کاشت کاروں) کے سوا کسی اور نے مارا ہوتا، انصار کھیتی کا پیشہ کرتے تھے، جو قریش کے نزدیک معیوب تھا۔ (۴) (ابن سعد غزوہ بدر و بدایہ ونہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۷۳، مصر)۔

کر دیا، اور حضرت عبیدہؓ کو کندھے پر اٹھا کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں لائے، حضرت عبیدہؓ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا کہ کیا میں دولت شہادت سے محروم رہا؟ آپؐ نے فرمایا، "نہیں تم نے شہادت پائی" حضرت عبیدہؓ نے کہا آج ابو طالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے کہ ان کے اس شعر کا مستحق میں ہوں (۱)۔

ونسلمه حتى نصرع حوله	ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دشمنوں کے حوالہ کریں گے جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں اور ہم اپنے بیٹوں اور بی بیوں سے بھلا نہ دیے جائیں۔
ونذهل عن ابنائنا والحلائل	

سعید بن العاص کا بیٹا (عبیدہ) سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا صف سے نکلا، اور پکارا کہ "میں ابو کرش ہوں" حضرت زبیرؓ اس کے مقابلہ کو نکلے، اور چونکہ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں، تاک کر آنکھ میں برچھی ماری، وہ زمین پر گرا، اور مر گیا، برچھی اس طرح پیوست ہو گئی تھی، کہ حضرت زبیرؓ نے اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر کھینچا تو بڑی مشکل سے نکلی، لیکن دونوں سرے خم ہو گئے، یہ برچھی یادگار رہی، یعنی حضرت زبیرؓ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مانگ لی، پھر چاروں خلفاء کے پاس منتقل ہوتی رہی، پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس آئی (۲)۔

حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں کئی کاری زخم اٹھائے، شانہ پر جو زخم تھا، اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہو جانے پر اس میں انگلی چلی جاتی تھی، چنانچہ ان کے بیٹے (عروہ) بچپن میں ان زخموں سے کھیلا کرتے تھے، جس تلوار سے لڑے تھے وہ لڑتے لڑتے کر گئی تھی، چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہوئے تو عبدالملک نے عروہ سے کہا تم زبیرؓ کی تلوار پہچان لو گے؟ انہوں نے کہا ہاں، عبدالملک نے پوچھا کیوں کر؟ بولے کہ بدر کے معرکہ میں اس میں دندانے پڑ گئے تھے، عبدالملک نے تصدیق کی، اور یہ مصرع پڑھا بهن فلول من قراع الكتائب، عبدالملک نے تلوار عروہ کو دے دی، انہوں نے اس کی قیمت انکوائی تو تین ہزار ٹھہری، اس کے قبضہ پر چاندی کا کام تھا (۳)۔

---

(۱) زرقانی ان واقعات میں روایتیں مختلف ہیں، اور قریباً سب ہم رتبہ ہیں، اس لئے جو روایت اختیار کر لی جائے قابل الزام نہیں۔ (۲) صحیح بخاری غزوہ بدر میں پورا واقعہ منقول ہے۔ (۳) یہ پوری تفصیل صحیح بخاری غزوہ بدر کے ذکر میں ہے۔

اب عام حملہ شروع ہو گیا، مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے، لیکن ادھر سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) سر بہ سجدہ صرف خدا کی قوت کا سہارا ڈھونڈھ رہا تھا۔

ابو جہل کی شرارت اور دشمنیِ اسلام کا عام چرچا تھا، اس بنا پر انصار میں معوذؓ اور معاذؓ دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آجائے گا، یا اس کو مٹا دیں گے، یا خود مٹ جائیں گے، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعۃً مجھ کو داہنے بائیں دو نوجوان نظر آئے، ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا کہ ابو جہل کہاں ہے؟ میں نے کہا برادر زادہ! ابو جہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ "میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ ابو جہل کو جہاں دیکھ لوں گا یا اسے قتل کر دوں گا، یا خود لڑ کر مارا جاؤں گا"۔ میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ سے کانوں میں یہی باتیں کہیں، میں نے دونوں کو اشارے سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے، بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابو جہل خاک پر تھا، دونوں جوان عفراء کے بیٹے تھے۔ (۱) "معوذ و معاذ" ابو جہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آکر معاذؓ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا، لیکن تسمہ باقی لگا رہا، معاذؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا، وہ بچ کر نکل گیا، معاذؓ اسی حالت میں لڑ رہے تھے، لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی، ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہو گیا، اور اب وہ آزاد تھے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لڑائی سے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ "کفار کے ساتھ جو لوگ آئے ہیں، ان میں ایسے بھی لوگ ہیں، جو خوشی سے نہیں بلکہ قریش کے جبر سے آئے ہیں" ان لوگوں کے نام بھی آپؐ نے بتا دیئے تھے، ان میں ابو البختری بھی تھا، مجذر کی نظر (جو انصار کے حلیف تھے) ابو البختری پر پڑی، مجذر نے کہا چونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تیرے قتل سے منع فرمایا ہے، اس لئے تجھ کو چھوڑ دیتا ہوں، ابو البختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا، ابو البختری نے کہا اس کو بھی؟ مجذر نے کہا "نہیں" ابو البختری نے کہا تو میں خاتونانِ عرب کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا، کہ ابو البختری نے اپنی جان بچانے کے لئے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا، یہ کہہ کر ابو البختری یہ رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا، اور مارا گیا:

---

(۱) بعض روایتوں میں معاذ بن عمر (بن جموح اور بعض میں "عمرو") و معاذ بن عفراء ہے۔

لن یسلم ابن حرۃ زمیلہ — شریف زادہ اپنے رفیق کو چھوڑ نہیں سکتا جب
حتیٰ یموت اویری سبیلہ — تک کہ مرنہ جائے یا وہ اپنا راستہ نہ دیکھ لے۔

عتبہ اور ابو جہل کے مارے جانے سے قریش کا پائے ثبات اکھڑ گیا، اور فوج میں بے دلی چھا گئی۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا شدید دشمن امیہ بن خلف بھی جنگ بدر میں شریک تھا، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے اس سے کسی زمانہ میں معاہدہ کیا تھا کہ وہ مدینہ میں آئے گا تو یہ اس کی جان کے ضامن ہوں گے۔ بدر میں اس دشمن خدا سے انتقام لینے کا خوب موقع تھا، لیکن چونکہ عہد کی پابندی اسلام کا شعار ہے، حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے چاہا کہ وہ بچ کر نکل جائے، اس کو لے کر ایک پہاڑ پر چلے گئے، اتفاق یہ کہ حضرت بلالؓ نے دیکھ لیا، انصار کو خبر کردی، دفعتہً لوگ ٹوٹ پڑے، انہوں نے امیہ کے بیٹے کو آگے کر دیا، لوگوں نے اس کو قتل کر دیا، لیکن اس پر بھی قناعت نہ کی، اور امیہ کی طرف بڑھے، انہوں نے امیہ سے کہا کہ تم زمین پر لیٹ جاؤ، یہ لیٹ گیا، تو یہ اس پر چھا گئے کہ لوگ اس کو مارنے نہ پائیں لیکن لوگوں نے ان کی ٹانگوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اس کو قتل کر دیا، حضرت عبدالرحمنؓ کی بھی ایک ٹانگ زخمی ہوئی، اور زخم کا نشان مدتوں تک قائم رہا (۱)۔

ابو جہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈال دی، اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔

حضرت عباسؓ، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی) نوفل، اسود بن عامر، عبداللہ بن زمعہ، اور بہت سے بڑے بڑے معزز لوگ گرفتار ہوئے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ کوئی شخص جا کر خبر لائے، ابو جہل کا کیا انجام ہوا؟ حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ نے جا کر لاشوں میں دیکھا تو زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا، بولے تو ابو جہل ہے؟ اس نے کہا "ایک شخص کو اس کی قوم (۲) نے قتل کر دیا، تو یہ فخر کی کیا بات ہے"، ابو جہل نے ایک دفعہ ان کو تھپڑ مارا تھا، انہوں نے اسکے انتقام میں اس کی گردن پر پاؤں

(۱) یہ پورا واقعہ صحیح بخاری میں ہے، لیکن چونکہ کتاب المغازی میں نہیں بلکہ کتاب الوکالہ میں ہے، اس لئے ارباب سیر کی نظر نہیں پڑی۔ (۲) بخاری غزوہ بدر۔

رکھا، ابو جہل نے کہا او بکری چرانے والے! دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے، حضرت عبد اللہؓ ابن مسعودؓ اس کا سر کاٹ لائے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدموں پر ڈال دیا (۱)۔

مغربی مورخین کو جن کے نزدیک عالمِ اسباب میں جو کچھ ہے، صرف اسبابِ ظاہری کے نتائج ہیں، حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا، کیوں کر فتح پائی، لیکن تائید آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں، تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں، اوّل تو قریش میں باہم اتفاق نہ تھا، عتبہ سردار لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا، قبیلہ زہرہ کے لوگ بدر تک آکر واپس چلے گئے، پانی برسنے سے موقع جنگ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ قریش جہاں صف آرا تھے، وہاں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا، قریش مرعوب ہو کر اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے، یعنی اپنی تعداد سے دو گنا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

یَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ	وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ سے
(آلِ عمران - ۳ : ۱۳)	دو گنا دیکھ رہے تھے۔

کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی، بخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دستِ مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں، مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے تھے، صبح اٹھے تو تازہ دم تھے، بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔

تاہم یہ اسباب ہیں، ان کا اجتماع اور تہیہ یہی تائید الٰہی ہے، پھر قریش اور مسلمانوں کی فوج کا باہم مقابلہ کرو تو نظر آئے گا کہ عام فوجی نظر کیا مسلمانوں کی فتح کی مقتضی تھی، قریش کی فوج میں بڑے بڑے دولت مند تھے، جو تنہا تمام فوج کی رسد کا سامان کرتے تھے، مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا، قریش کی تعداد ایک ہزار تھی، مسلمان صرف ۳۰۰ تھے، قریش میں سو سوار تھے، مسلمانوں کی فوج میں صرف دو گھوڑے تھے، مسلمانوں میں بہت کم سپاہی تمام ہتھیاروں سے پورے تھے، اور ادھر قریش کا ہر سپاہی لوہے میں غرق تھا۔

---

(۱) بخاری غزوۂ بدر۔

بااین ہمہ خاتمہ، جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ شخصوں نے شہادت پائی، جن میں ۶ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی، اور روسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قبائل کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے، ان میں شیبہ، عتبہ، ابو جہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج، قریش کے سرتاج تھے، قریباً ۷۰ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اسیرانِ جنگ میں سے عقبہ اور نضر بن حارث قتل کر دیئے گئے، باقی گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے، ان میں حضرت عباسؓ، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی) ابوالعاص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد) بھی تھے۔

لڑائیوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معمول تھا کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی، آپؐ اس کو زمین میں دفن کرا دیتے تھے (۱)، لیکن اس موقع پر کشتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرانا مشکل تھا، ایک وسیع کنواں تھا، تمام لاشیں آپؐ نے اس میں ڈلوادیں، لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی، کہ جگہ سے ہٹائی جاوے، اس لئے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔

اسیرانِ جنگ جب مدینہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے آئے تو حضرت سودہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ) بھی تشریف رکھتی تھیں، ان قیدیوں میں ان کے عزیز سہیل بن عمر بھی تھے، ان پر نگاہ پڑی تو بے ساختہ بول اٹھیں کہ تم نے بھی عورتوں کی طرح خود بیڑیاں پہن لیں، یہ نہ ہو سکا کہ لڑ کر مر جاتے (۲)۔

اسیرانِ جنگ دو دو چار چار صحابہ کو تقسیم کر دیئے گئے، اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہؓ نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے، ان قیدیوں میں ابو عزیز بھی تھے، جو حضرت مصعبؓ بن عمیر کے بھائی تھے، ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا، جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے، اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا، لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے، اور مجھ ہی کو واپس دیتے، اور یہ اس بنا پر تھا کہ

(۱) روض الانف۔ (۲) ابن ہشام۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاکید کی تھی، کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے (۱)

قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا، جو نہایت فصیح اللسان تھا، اور عام مجموں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہؐ! اس کے ڈو نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا، (مثلہ) تو گو نبی ہوں، لیکن خدا اس کی جزا میں میرے اعضاء بھی بگاڑے گا (۲)۔

حضرت عباسؓ (کے بدن پر کرتا نہ تھا، لیکن ان) کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ ان کے بدن پر ٹھیک نہیں اترتا تھا، عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) نے کہ حضرت عباسؓ کا ہم قد تھا، اپنا کرتا منگوا کر دیا، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عبداللہ کے کفن کے لئے جو اپنا کرتا عنایت فرمایا تھا، وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا (۳)۔

عام روایت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینہ میں آکر صحابہ سے مشورہ کیا کہ اسیرانِ جنگ کے معاملہ میں کیا کیا جائے، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں، لیکن حضرت عمرؓ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دوست دشمن، عزیز و بیگانہ، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی، اس لئے انہوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیئے جائیں، اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صدیق اکبرؓ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا، اس پر خدا کا عتاب آیا، اور یہ آیت اتری:

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (انفال - ۸ : ۶۸)	اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اس پر عذاب نازل ہوتا۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابوبکرؓ یہ عتاب ربانی سن کر رو پڑے۔

یہ روایت تمام تاریخوں میں مذکور ہے، احادیث میں بھی موجود ہے، لیکن سببِ عتاب کے بیان میں اختلاف ہے، ترمذی میں جو روایت ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس وقت تک

(۱) طبری صفحہ ۱۳۳۸۔ (۲) طبری صفحہ ۱۳۴۴ (۳) صحیح بخاری صفحہ ۴۲۲: باب الکسوۃ للاساری

مالِ غنیمت کے متعلق احکام نہیں آئے تھے، عرب کے عام دستور کے موافق صحابہ غنیمت میں مصروف ہو گئے، اس پر عتاب آیا، لیکن چونکہ اس کے متعلق پہلے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لئے یہ جرم معاف کر دیا گیا، اور حکم آیا کہ مالِ غنیمت جو ہاتھ آچکا حلال ہے۔

قرآن مجید میں عتاب کے بعد یہ الفاظ ہیں:

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا — تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلالِ طیب ہے۔

(انفال - ۸ : ۶۹)

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ مال جو ہاتھ آیا تھا وہ حلال کر دیا گیا، اور وہ مالِ غنیمت تھا، غرض صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے یا مالِ غنیمت کے لوٹنے پر تھا، صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی، تو آپؐ رونے لگے، اور جب حضرت عمرؓ نے سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا "ابکی الذی عرض علی اصحابک من اخذھم الفداء یعنی تمہارے ساتھیوں نے جو فدیہ لیا، اس پر جو خدا کی طرف سے پیش کیا گیا، اس پر میں رو رہا ہوں" عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیرانِ جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا، چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ — کسی نبی کو یہ مناسب نہیں کہ بغیر اچھی طرح خوں ریزی کرنے کے لوگوں کو قیدی بنائے۔

(انفال - ۸ : ۶۷)

لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدانِ جنگ میں جب تک کافی خوں ریزی نہ ہو چکے، قیدی بنانا مناسب نہیں، اس سے یہ کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر خوں ریزی سے پہلے لوگ گرفتار کر لئے گئے، تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کئے جا سکتے ہیں۔

بہر حال اسیرانِ جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا، لیکن جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، وہ چھوڑ دیئے گئے، ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے، ان کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں (۱) تو چھوڑ دیئے جائیں گے، حضرت زیدؓ بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سکھا تھا (۲)۔

---

(۱) مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۴۷۔ (۲) طبقات ابن سعد ص ۱۴۔

انصار نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت عباسؓ ہمارے بھانجے ہیں، ہم ان کا فدیہ چھوڑ دیتے ہیں لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا (۱) اور ان کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا۔ فدیہ کی عام مقدار ۴۰۰۴ ہزار درہم تھی، لیکن امراء سے زیادہ لیا گیا، حضرت عباسؓ دولت مند تھے، اس لئے ان سے بھی زیادہ رقم وصول کی گئی، انہوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شکایت کی، لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی، اس میں قریب و بعید، عزیز و بیگانہ، عام و خاص کے تمام تفرقے مٹ چلے تھے، (لیکن ایک طرف تو ادائے فرض کی یہ مساوات تھی، دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا، کہ حضرت عباسؓ کی کراہ سن کر رات کو آپؐ آرام نہ فرما سکے، لوگوں نے ان کی گرہ کھولی، تو آپؐ نے آرام فرمایا)۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے داماد ابو العاص بھی اسیرانِ جنگ میں آئے تھے ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو (جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں) کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں، حضرت زینبؓ کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں ان کو ایک قیمتی ہار دیا تھا، حضرت زینبؓ نے زرِ فدیہ کے ساتھ وہ ہار بھی گلے سے اتار کر بھیج دیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا تو ۲۵ برس کا محبت انگیز واقعہ یاد آگیا، آپؐ بے اختیار رو پڑے، اور صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہو، تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو، سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں، اور وہ ہار واپس کر دیا (۲)

(ابو العاص رہا ہو کر مکہ آئے اور حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیا، ابو العاص بہت بڑے تاجر تھے، چند سال کے بعد بڑے سر و سامان سے شام کی طرف مالِ تجارت لے کر نکلے، واپسی میں مسلمان دستوں نے ان کو مع ان کے تمام مال و اسباب گرفتار کر لیا، اسباب ایک ایک سپاہی پر تقسیم ہو گیا، یہ چھپ کر حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے، انہوں نے پناہ دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر مناسب سمجھو تو ابو العاص کا اسباب واپس کر دو، پھر تسلیم کی گردنیں جھک گئیں، اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگا تک لا لا کر واپس کر دیا، اب یہ دار الیاسہ تھا،

---

(۱) بخاری ص ۵۷۲ (جلد کتاب المغازی)۔ (۲) تاریخ طبری ص ۱۳۴۸ و ابو داؤد۔

جو خالی جاتا۔ ابو العاص مکہ آئے۔ اور تمام شرکاء کو حساب سمجھا کر دولت اسلام سے فائز ہوئے اور کہہ دیا کہ میں اس لئے یہاں آکر اور حساب سمجھا کر جاتا ہوں تا کہ یہ نہ کہو کہ ابو العاص ہمارا روپیہ کھا کر تقاضے کے ڈر سے مسلمان ہو گیا۔) (۱)

بدر کی خبر مکہ پہنچی تو گھر گھر ماتم تھا، لیکن غیرت کی وجہ سے قریش نے منادی کرادی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے، اس لڑائی میں اسود کے تین لڑکے مارے گئے تھے، اس کا دل امنڈا آتا تھا، لیکن قومی عزت کے خیال سے رو نہیں سکتا تھا، اتفاق یہ کہ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی، سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دے دی ہے۔ نوکر سے کہا دیکھنا کون روتا ہے؟ کیا رونے کی اجازت ہو گئی۔ میرے سینہ میں آگ لگ رہی ہے۔ جی کھول کر رولوں تو تسکین ہو جائے۔ آدمی نے آکر کہا ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے اس کے لئے رو رہی ہے، اسود کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکلے:

اتبکی ان یضل لها بعیر	اونٹ کے گم ہوجانے پر روتی ہے
ویمنعها من النوم السهود	اور اس کو نیند نہیں آتی، اونٹ
فلا تبکی علی بکر ولکن علی	پر مت رو، بدر پر آنسو بہا، جہاں
بدر تقاصرت الجدود	قسمت نے کمی کی، تجھ کو رونا ہے تو
فبکی ان بکیت علی عقیل	عقیل پر رو، اور حارث پر رو جو
وبکی حارثا اسد الاسود،	شیروں کا شیر تھا۔

(عمیر بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا، وہ اور صفوان بن امیہ حجر میں بیٹھے ہوئے مقتولین بدر کا ماتم کر رہے تھے، صفوان نے کہا۔ "خدا کی قسم اب جینے کا مزہ نہیں" عمیر نے کہا سچ کہتے ہو، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر آتا، میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے۔ صفوان نے کہا تم قرض کی اور بچوں کی فکر نہ کرو، ان کا میں ذمہ دار ہوں، عمیر نے گھر آکر تلوار زہر میں بجھائی، اور مدینہ پہنچا، حضرت عمرؓ نے اس کے تیور دیکھ لئے، گلا دبائے اس کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں لائے، آپؐ نے فرمایا عمر! چھوڑ دو، عمیر قریب آجاؤ، پوچھا کس ارادے سے آئے ہو، جواب دیا کہ بیٹے کو

(۱) (تاریخ طبری۔)

چھڑانے آیا ہوں، فرمایا تلوار کیوں حمائل ہے؟ عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں، فرمایا کیوں نہیں؟ تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی؟ عمیرؓ یہ کی بات سن کر سناٹے میں آگیا، بے اختیار ہو کر بولا محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک تم پیغمبر ہو، بخدا میرے اور صفوان کے سوا اس معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ قریش جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی خبر سننے کے منتظر تھے، انہوں نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سنی۔

حضرت عمیرؓ مسلمان ہو کر بہادرانہ مکہ میں آئے، جہاں کا ہر ذرہ اس وقت مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، ان کو اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی، اسی شدت سے وہ اب دشمنانِ اسلام کے دشمن تھے، یہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا، اور ایک مجمع کثیر کو اس روشنی سے منور کر دیا (۱)۔

غزوۂ بدر کا ذکر قرآن میں

(اس غزوہ کو دیگر غزوات پر جو امتیازات حاصل ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خود خدا نے اپنے کلام پاک میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے، اور ایک خاص سورہ (انفال) بدر کے احسانات و نعم کی تفصیل اور بعض مسائلِ متعلقۂ بدر کی توضیح کے لئے مخصوص کر دیا ہے، واقعہ کی اصل حقیقت جاننے کے لئے آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح ماخذ موجود نہیں:

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ط اُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ • کَمَآ اَخْرَجَکَ رَبُّکَ مِنْۢ بَیْتِکَ بِالْحَقِّ ص وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ	مومن وہ ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، اور وہ اپنے خدا پر بھروسہ کرتے ہیں جو نماز بہ پابندی پڑھتے ہیں، اور خدا نے جو ان کو روزی دی ہے، اس سے راہ خدا میں بھی کچھ دیتے ہیں، یہ ہیں سچے مومن، ان کے لئے خدا کے پاس رتبے ہیں، بخشش ہے، اور اچھی روزی ہے؛ جس طرح اے

(۱) (یہ تمام واقعات تاریخ طبری میں بحوالہ عروہ بن زبیرؓ مذکور ہیں، ص ۱۳۵۴)

الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ يُجَادِلُوْنَكَ
فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا
يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۙ
وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ
اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ
الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ
يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ
الْكٰفِرِيْنَ ۙ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ
الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۚ
اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ
لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُرْدِفِيْنَ ۚ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى
وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ
اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ۚ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً
مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً
لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ
الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ
وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۚ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى
الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ
فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا
مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ

پیغمبر تیرا خدا تجھ کو حق پر تیرے گھر سے (بدر تک)
نکال لایا، حالانکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے
ناخوش تھا، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑتا
ہے، گویا کہ وہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں،
اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں، اور جب خدا تم سے
قریش کے قافلہ اور قریش کی فوج میں سے ایک کا
وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے لئے ہے، تم چاہتے ہو کہ
بے خرخشہ والا گروہ تم کو مل جائے (یعنی قافلہ) اور
خدا یہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنے حکم سے ثابت کرے
اور باطل کو مٹائے گو گنہ گار اس سے رنجیدہ
ہوں، یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر
رہے تھے، اس نے تمہاری سنی (اور کہا) میں
تمہاری لگاتار ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا، خدا
نے یہ صرف مسلمانوں کی خوشی اور اطمینانِ قلب
کے لئے کیا، اور فتح تو صرف خدا کے پاس ہے،
خدا غالب و دانا ہے، یاد کرو جب تمہارے چین
کے لئے اپنی طرف سے اونگھ تم پر طاری کر رہا
تھا اور آسمان سے پانی برسا رہا تھا کہ تم کو پاک
کرے اور شیطان کی ناپاکی تم سے دور کرے اور
تمہارے دل مضبوط کرے اور ثابت قدم رکھے،
یاد کرو جب خدا فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں
تمہارے ساتھ ہوں، مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا،
میں کافروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا،
کافروں کی گردنیں مارو اور ہر جوڑ پر مارو، یہ اس لئے

وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ذٰلِكُمْ
فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ط
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۔ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ
دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى
فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ
جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ
بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ ذٰلِكُمْ
وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِيْنَ ۔ اِنْ
تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ وَاِنْ تَنْتَهُوْا
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ وَلَنْ تُغْنِيَ
عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ
مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔

(انفال - ۸ : ۲ تا ۱۹)

کہ انہوں نے خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کی ہے اور جو خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کرے گا خدا اس کو سخت عذاب دینے والا ہے، یہ ہے عذاب، اس کا مزہ چکھو۔ کافروں کے لئے عذاب دوزخ ہے۔ مسلمانو! جب میدانِ جنگ میں کافروں کے مقابل آؤ تو پشت نہ پھیرو اور بجز اس کے کہ لڑنے کے لئے مڑے یا کسی دستہ کی طرف پھرے۔ جو کوئی پشت پھیرے وہ خدا کا غضب لائیگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور کیا برا ٹھکانا ہے۔ مسلمانو! ان کافروں کو تم نے نہیں مارا، لیکن خدا نے مارا، اور اے محمدؐ! تم نے نہیں پھینکا جب تم نے پھینکا، لیکن خدا نے پھینکا تاکہ اپنی طرف سے اہل ایمان کو اچھا انعام دے، خدا دانا اور بینا ہے، اور کافروں کے داؤ پیچ کو کمزور کرنے والا ہے، اگر فتح چاہتے تھے تو فتح آچکی، اب اگر رک جاؤ تو بہتر ہے اور تم پھر مخالفت پر آمادہ ہوگے، تو ہم پھر مسلمانوں کی مدد کریں گے، یاد رکھو کہ تمہاری جمعیت کچھ مفید نہیں، گو وہ کتنی ہی کثیر ہو، اور خدا مومنوں کے ساتھ ہے۔

(۲) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ
لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ
كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا
يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ

(۲) اور جان لو کہ جو مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور اس کے رسول کے لئے، اہل قرابت کے لئے، یتیموں کے لئے، مسکینوں کے لئے اور مسافروں کے لئے ہے، اگر خدا پر تم ایمان لاچکے ہو اور حق و باطل میں فرق کردینے والے

عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ • اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِى الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَىَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ • اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِىْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ط وَلَوْ اَرٰكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ • وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِىْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِىْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ط وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ • يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ • وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ • وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ •

(انفال ۔ ۸: ۴۱ تا ۴۷)

دن میں (یعنی بدر میں) خدا نے اپنے بندے پر جو فتح اتاری اس کو مان چکے جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئیں اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا، اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے تو وقت میں اختلاف ہو جاتا، لیکن (خدا نے یہ اس لئے کر دیا) تاکہ جو ہونے والا تھا خدا اس کو کر دے تاکہ جس کو مرنا ہو وہ بھی دلیل دیکھ کے مرے اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل دیکھ کے زندہ رہے، اور بیشک خدا سننے والا اور جاننے والا ہے، یاد کرو جب خدا تم کو رویا میں ان کو تھوڑا دکھارہا تھا، اگر زیادہ دکھاتا تو تم سست پڑ جاتے اور باہم جھگڑے پڑتے، لیکن خدا نے محفوظ رکھا وہ سینوں کے بھید سے واقف ہے، جب تمہاری نظر میں خدا ان کو تھوڑا دکھارہا تھا اور تم کو ان کی نگاہ میں تاکہ جو ہونے والا ہے، خدا اس کو پورا کرے اور اسی کی طرف تمام معاملے پھرتے ہیں، مسلمانو! جب کسی دستۂ فوج سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو اور خدا کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ کامیاب ہو، اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، مستقل رہو، خدا مستقل لوگوں کے ساتھ ہے، اور ان لوگوں (یعنی قریش) کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور دکھاوے کے ساتھ اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اور خدا ان کے تمام کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔

(۲) مَا كَانَ لِنَبِىٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى

(۲) پیغمبر کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے پاس

حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ
الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ
حَکِیْمٌ ۔ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ
لَمَسَّکُمْ فِیْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ
فَکُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّاتَّقُوا
اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔

(انفال - ۸ : ۶۷ تا ۶۹) ۔

قیدی ہوں تاآنکہ خوب زمین میں لڑ نہ لے۔ تم دنیا کی دولت چاہتے ہو (قیدی ہوں گے تو فدیہ ہاتھ آئے گا) اور خدا آخرت چاہتا ہے۔ خدا دانا اور توانا ہے۔ اگر خدا کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں سے لے لیا، اس پر دردناک عذاب پہنچتا۔ اب جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا، کھاؤ وہ حلال طیب ہے۔ اور خدا سے ڈرو، خدا آمرزگار اور مہربان ہے۔

(۴) یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْٓ اَیْدِیْکُمْ
مِّنَ الْاَسْرٰٓی اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ
خَیْرًا یُّؤْتِکُمْ خَیْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْکُمْ وَیَغْفِرْ
لَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَکَ
فَقَدْ خَانُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْکَنَ مِنْھُمْ
وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۔

(انفال - ۸ : ۷۰ تا ۷۱)

(۴) اے پیغمبر تمہارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ خدا اگر تمہارے دلوں میں کچھ نیکی دیکھے گا تو تم سے جو لیا گیا ہے اس کے بدلہ وہ نیکی عطا کرے گا، اور تمہیں معاف کرے گا وہ بخشش اور مہربانی والا ہے اور اگر یہ قیدی تجھ سے خیانت کرنا چاہتے ہیں، تو اس سے پہلے وہ خدا کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، اسی لئے تو خدا نے ان کو تمہارے قابو میں کر دیا، خدا دانا اور باخبر ہے۔

خدا نے اسی احسان کو احد کے موقع پر یاد دلایا ہے :

وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ
فَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۔

(آلِ عمران - ۳ : ۱۲۳)

یقیناً خدا نے تمہاری بدر میں مدد کی، جب تم کمزور تھے، تو خدا سے ڈرو تاکہ تم شکر گذار بن جاؤ۔

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور سے اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوۂ بدر کا مقصد جیسا کہ عام مورخین نے بیان کیا ہے کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔

میں اس بات سے خوب واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمۂ عدالت میں فرق ہے مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا انداز بیان مقدمۂ دیوانی یا فوجداری کے فیصلہ لکھنے سے بالکل مختلف ہے، میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ نگاری ہے، فیصلہ نویسی نہیں، لیکن موقع ایسا آپڑا ہے کہ ایک واقعۂ تاریخی نے مقدمۂ عدالت کی حیثیت حاصل کرلی ہے، اس لئے مجھ کو اپنے منصب سے ہٹ کر فصلِ مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے۔

اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مورخین اور اربابِ سیر میرے حریف مقابل ہیں، نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے، سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیش نظر رکھنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو بتا دینا چاہئیے کہ (ہماری تحقیقات کے رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوشِ انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آگئیں، دونوں فریق ایک دوسرے سے پُر حذر رہتے تھے اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے، غلط خبریں خود بخود مشہور ہو کر پھیل جاتی ہیں، انہی اثنا میں ابوسفیان قافلۂ تجارت کے ساتھ شام گیا، اور ابھی وہ شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہو گئی کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہو جائے، قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں، مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیت عظیم لے کر مدینہ آرہے ہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔

اس بحث کے فیصلہ کے لئے سب سے پہلے ان واقعات کو سلجھا لکھ دینا چاہئیے، جن پر

دونوں فریق کا اتفاق ہے تاکہ وہ انفصالِ بحث میں اصول موضوعہ کے طور پر کام آئیں، وہ یہ ہیں:

(۱) قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

(۲) کتب حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرق مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں تو آپؐ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر ان کا استمزاج کیا، مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر سعدؓ یا اور کوئی معزز انصاری اٹھے اور کہا یا رسول اللہ کیا آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنھوں نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے، خدا کی قسم اگر آپؐ حکم دیں تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں۔

یہ بھی مسلم ہے کہ صحابہؓ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے، چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے:

وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ — اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعاً ناخوش تھا۔

(انفال ۔ ۸: ۵)

عموماً ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تو صرف یہ اقرار کیا تھا کہ "جب کوئی دشمن خود مدینہ پر حملہ آور ہو گا تو انصار مقابلہ کریں گے"۔ یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے، ان واقعات کے بعد اب مرکز بحث یہ ہے کہ "یہ واقعات کہاں پیش آئے"۔ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ مدینہ سے جب آپؐ نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا، دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لئے چلے آتے ہیں، اس وقت آپؐ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ

دریافت فرمائیں۔ آگے کے واقعات یہیں پیش آئے۔ لیکن کتب سیر، تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے۔ (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیئے:

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۔ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۔ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۔

(انفال۔ ۸: ۵ تا ۷)

جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآنحالیکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا، یہ لوگ حق کے ظاہر ہوئے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں، اور موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب کہ خدا تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی، اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے، اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

(۱) ترکیب نحوی کے رو سے وَاِنَّ میں جو واو ہے حالیہ ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپؐ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپؐ آگے بڑھے۔ کیوں کہ واو حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیئے۔

(۲) آیت مذکورہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے، ایک کاروانِ تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی، ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیتِ قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بدر کے قریب پہنچ چکے تھے، لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت صحیح سلامت بچ کر نکل گیا تھا، اس وقت یہ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ "دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے"۔ اس لئے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیئے، جب دونوں گروہ کے

ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو، اور یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے، اور دونوں طرف کی خبریں آگئی تھیں کہ ادھر ابو سفیان کاروانِ تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سرو سامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

(۳) سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورۂ بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا نے بیان کیا ہے، ایک قافلۂ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے آرہے تھے، آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروانِ تجارت پر حملہ کیا جائے، خدا نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا:

وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ	اور تم چاہتے ہو کہ بے خرخشہ والا گروہ تم
تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ	کو ہاتھ آجائے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ اپنی
الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ	باتوں سے حق کو قائم کردے اور کافروں
الْكٰفِرِيْنَ ۝ (انفال - ۸: ۷)	کی جڑ کاٹ دے۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کردے، اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

(۴) اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو، واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے اس سرو سامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین۳ سو سے زیادہ جاں باز مہاجر و انصار ساتھ ہیں ان میں فاتح خیبرؓ اور حضرت امیر حمزہؓ سید الشہداء بھی ہیں، جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے، باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بہ تصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے کچھ صحابہ کا دل بیٹھا جاتا ہے، اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لیے جاتا ہے:

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝	اور مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی وہ تجھ سے
يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ	حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑا کرتی تھی، گویا کہ
كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ (انفال - ۸: ۶)	موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں۔

اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب، یہ پہلوتہی کس

بنا پر تھی۔ اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیج دیئے گئے تھے، اور کبھی ان کو ضرر نہیں پہنچا تھا۔ اس دفعہ اسی قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے، اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں۔ یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ پر آرہے ہیں۔

(۵) قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپؐ مدینہ ہی میں تشریف رکھتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری تفسیر سورۂ نساء میں تصریحاً مذکور ہے۔ آیت یہ ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً (نساء۔ ۴: ۹۵)	بجز معذوروں کے۔ وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، برابر نہیں ہو سکتے۔ خدا نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، درجہ میں فضیلت دی ہے۔

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے، صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ کا جملہ نہ تھا، یہ آیت سن کر حضرت عبداللہؓ بن ام مکتوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اندھے پن کا عذر کیا۔ اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا، "غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ" یعنی "معذوروں کے سوا"۔ یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

(۶) کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے بدر میں آئے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (انفال۔ ۸: ۴۷)	اور (ان لوگوں کی طرح نہ ہو) جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائشی اور خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لئے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہارِ شان اور دکھاوے کے لئے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ اس میں اظہارِ شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی، اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ البتہ چونکہ درحقیقت وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تھے، جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمایش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا، اس لئے خدا نے اس کو غرور و نمایش اور صدعن سبیل اللہ کہا۔

(قرآن مجید کے بعد احادیث نبویؐ کا درجہ ہے، احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل و مجمل ذکر ہے، لیکن حضرت کعبؓ بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔

حضرت کعبؓ کی حدیث یہ ہے:

عن عبداللہ بن کعب قال کعب لم اتخلف عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ غزاھا الا غزوۃ تبوک غیر انی کنت تخلفت فی غزوۃ بدر ولم یعاتب احد تخلف عنھا، انما خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرید عیر قریش حتی جمع اللہ بینہ وبینھم علی غیر میعاد	کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا، بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا، اور جو اس میں شریک نہ ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لئے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔

اس کے برخلاف حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے:

۱۔ عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکر فاعرض عنہ ثم تکلم عمر فاعرض عنہ فقام سعد بن عبادۃ فقال ایانا ترید یارسول اللہ	۱۔ انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپؐ نے مشورہ طلب کیا، حضرت ابوبکرؓ بولے تو آپؐ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمرؓ بولے آپؐ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ کی، پھر حضرت

والذی نفسی بیده لو امرتنا ان نخیضها البحر لاخضناها. ولو امرتنا ان نضرب اکبادها الی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدرا

۲۔ ووردت علیهم روایا قریش وفیهم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوه فکان اصحاب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم یسئلونه عن ابی سفیان واصحابه فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن هذا ابو جهل وعتبة وشیبة وامیة بن خلف فاذا قال ذلک ضربوه فقال نعم انا اخبرکم هذا ابو سفیان فاذا ترکوه فسألوه فقال مالی بابی سفیان علم ولکن هذا ابو جهل وعتبة وشیبة وامیة بن خلف فی الناس فاذا قال هذا ایضا ضربوه ورسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قائم یصلی فلما رای ذلک انصرف قال والذی نفسی بیده لتضربوه اذا صدقکم وتترکوه اذا کذبکم

سعدؓ بن عبادہ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپؐ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے؟ خدا کی قسم اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپؐ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے تو ہم کریں گے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپؐ نے لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی، لوگ چل پڑے اور بدر پر اترے۔

۲۔ اور (پہلے) قریش کا ہراول آکر اترا، اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا، مسلمانوں نے اس کو گرفتار کر لیا، اور اس سے ابو سفیان کا حال پوچھنے لگے، وہ کہتا تھا مجھے ابو سفیان کی خبر نہیں لیکن یہ ابو جہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف آرہے ہیں، جب وہ یہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ کہتا اچھا ابو سفیان کو بتاتا ہوں، تب اس کو چھوڑ دیتے، تو پھر پوچھتے تو وہ کہتا مجھ کو ابو سفیان کی خبر نہیں لیکن ابو جہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف رؤسائے قریش آرہے ہیں لیکن جب وہ یہ کہتا تب بھی اس کو مارتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول تھے، آپؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو

(صحیح مسلم باب غزوہ بدر)

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابو سفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا، اسی وقت آپؐ نے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی، اور یہ

متفقاً ثابت ہے کہ ابو سفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا۔ اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لئے آپؐ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی، ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیر میں مذکور ہے، تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے؟ اور نیز اسی ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، حالانکہ ارباب سیر کے مطابق واقعہ یہ ہونا چاہیئے کہ انصار معاہدہ اور معمولِ سابق کے خلاف شرکت کے لئے نکلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لئے آمادہ کیا، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بہ وضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے، گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔

اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنا ہے، اگر پہلے صرف ابو سفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اصرار اور سرو سامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لئے ابو سفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضاء یہ ہے کہ یہ ہو کہ "جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی"۔ چنانچہ اسی واقعہ کو ان ہی الفاظ کے ساتھ امام احمد ابن حنبل (۱) نے مسند میں، ابن ابی شیبہ نے مصنف (۲) میں، ابن جریر نے تاریخ (۳) میں اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے، اور اس کو "صحیح" کہا ہے، اور اس کے راوی معرکۂ بدر کے ہیرو اسد اللہ علیؓ بن ابی طالب ہیں:۔

عن علی قال لما قدمنا المدینة	حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو
اصبنا من ثمارها فاجتویناها	وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج
واصابنا بها وعک وکان النبی	تھے، اس لئے ہم لوگ بیمار ہو گئے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم یتخبر عن بدر فلما	صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو پوچھا کرتے تھے۔ جب
بلغنا ان المشرکین قد اقبلوا سار	ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آرہے ہیں، تو رسول اللہ

(۱) جلد اول ص ۱۱۷۔ (۲) منتخب کنز العمال غزوہ بدر۔ (۳) جلد ۳ صفحہ ۱۲۸۹۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی بدرو بدربئر فسبقنا المشرکین الیھا (اس کے بعد بدر کے تمام واقعات وجزئیات مذکور ہیں)

صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو چلے، بدر ایک کنویں کا نام ہے، جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ نکلے تھے، اور بدر آکر قیام فرمایا تھا، اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے)

ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں، لیکن لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کے طور پر واقعات ذیل پر لحاظ کرنا چاہیئے۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو سو دو دو سو تک کی جمعیت تھی، ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، ارباب سیر اس امر کو بہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لئے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا، اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی، یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی جن میں ۷۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپؐ نکلے یہ خبر آچکی تھی کہ قریش مدینہ پر آرہے ہیں، اسی بنا پر آپؐ نے انصار کو مخاطب کیا، کیوں کہ معاہدہ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آچکا تھا۔

(۲) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لئے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا، مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے، عموماً قریش کے زیر اثر تھے، بخلاف اس کے مدینہ سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا، اس بنا پر اگر کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا، یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آرہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو چکی ہے، اور آپؐ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں، مکہ کی طرف جاتے ہیں، اور پانچ منزل مکہ کی طرف جاکر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا، اور قریش سے جنگ پیش آجاتی ہے۔

(۳) واقعات کی ترتیب یہ ہے:

۱۔ قریش نے عبداللہ بن ابیؓ کو خط لکھا کہ "محمدؐ اور ان کے رفقاء کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم مدینہ آکر تم کو بھی برباد کردیں گے" (بحوالہ سنن ابی داؤد اوپر گذر چکا)۔

۲۔ ابو جہل نے سعد بن معاذ سے کہا کہ تم نے ہمارے مجرموں کو پناہ دی ہے، اگر امیہ کی ضمانت نہ ہوتی تو میں تم کو قتل کر دیتا۔

۳۔ کرز بن جابر نے جمادی الثانی سنہ ۲ھ میں مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اونٹ لوٹ لئے۔

۴۔ اس کے بعد ہی رجب سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہؓ بن جحش کو تجسس کے لئے بھیجا کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔

۵۔ عبداللہؓ بن جحش نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف) قریش کا ایک مختصر سا قافلہ لوٹ لیا اور ایک آدمی قتل اور دو اسیر کیے۔

قریش نے مکہ میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس کو پیش نظر رکھو، پھر یہ خیال کرو کہ ان کا جوشِ انتقام کسی طرح کم نہیں ہوتا، اور وہ عبداللہ بن ابیؓ کو لکھتے ہیں کہ ہم مدینہ آکر تم کو اور محمدؐ دونوں کو فنا کردیں گے، کرز فہری مدینہ پر چھاپہ مارتا ہے، اسی اثنا میں قریش کا اشتعال اس سے اور بڑھ جاتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن جحش نے ان کا قافلہ لوٹ لیا اور ان کے دو معزز خاندان کے ممبر اسیر کرلئے، ان تمام باتوں کے ساتھ قریش صبر کرتے ہیں اور کسی قسم کے انتقام کا ارادہ نہیں کرتے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قافلہ کو جس میں مکہ کی کل کائنات تھی، لوٹنے کے لئے نکلتے ہیں، تب مجبوراً ان کو مدافعت کے لئے نکلنا پڑتا ہے، اس پر بھی بدر کے قریب پہنچ کر جب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا تو ان کے بڑے بڑے سردار اور خود عتبہ جو سالارِ لشکر تھا، رائے دیتا ہے کہ اب لڑنے کی ضرورت نہیں، واپس چلنا چاہیئے، کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوشِ عداوت اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شانِ نبوت کے موافق ہے؟

(۴) اربابِ سیر عموماً لکھتے ہیں کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں صحابہؓ کو کاروانِ تجارت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو لوگوں نے چنداں مستعدی ظاہر نہیں

کی، کیوں کہ لوگ سمجھے کہ کوئی مہم اور معرکہ و جہاد نہیں ہے، بلکہ صرف تحصیلِ غنیمت ہے، اس لئے جن لوگوں کو مال کی حاجت تھی وہ گئے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انصار میں جس قدر اعیانِ قوم اور سرِ لشکر تھے، سب گئے، زر و مال کے محتاج اگر تھے تو مہاجرین تھے، لیکن جانے والوں میں انصار کی تعداد مہاجرین سے دو گنی تگنی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استمزاج کے جواب میں جن لوگوں نے جاں نثارانہ فقرے کہے تھے، مہاجرین میں حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ و مقدادؓ تھے، اور انصار میں حضرت سعد بن عبادہؓ (۱) تھے، حضرت سعدؓ بن عبادہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور مدینہ سے باہر نہیں جاسکے تھے، اس لئے قطعاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت سعدؓ نے یہ جواب مدینہ ہی میں دیا تھا، اور وہیں قریش کے حملہ کا حال معلوم ہو گیا تھا، اور اس لئے یہ قطعی ہے کہ مدینہ ہی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تھی کہ انصار کا استمزاج لیا جائے۔

(۵) عام اربابِ سیر بلکہ احادیث کی کتابوں میں بھی منقول ہے کہ غزوۂ بدر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چلنے کی ترغیب دی تو کچھ لوگ آمادہ نہ ہوئے اور کسمسائے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ نہیں ہے، صرف قافلہ کا مال لوٹنا ہے، اس لئے یہ اپنی مرضی پر موقوف ہے، جس کا جی چاہے جائے جس کا جی چاہے نہ جائے، طبری میں ہے:

قالوا لما سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بابی سفیان مقبلا من الشام ندب المسلمین الیھم وقال ھذہ عیر قریش فیھا اموالھم فاخرجوا الیھا لعل اللہ ان ینفلکموھا فانتدب الناس فخف بعضھم وثقل بعضھم وذلک انھم لم یظنوا ان رسول اللہ یلقی حربا (ص ۱۲۹۳)	لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیان کا شام سے روانہ ہونا سنا تو مسلمانوں کو بلایا اور فرمایا کہ یہ قریش کا قافلہ آرہا ہے جس میں ان کا مال ہے، چلو شاید خدا تم کو اس میں سے مالِ غنیمت دلوادے، لوگ آمادہ ہوئے، لیکن بعضوں نے پہلو تہی کی، کیوں کہ وہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی لڑائی تو پیش نہیں آئے گی۔

(۱) صحیح مسلم و صحیح بخاری غزوۂ بدر۔

لیکن یہ واقعات صریح قرآنی آیات کے خلاف ہیں۔ قرآن مجید میں بتصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے، وہ عدمِ ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں:

وَاِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ (انفال - ۸ : ۶)	اور مسلمانوں کا ایک فریق نکلنے سے ناراض تھا، وہ تجھ سے حق کے متعلق جھگڑتا تھا، بعد اس کے کہ حق ظاہر ہو گیا تھا، وہ گویا موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں۔

(۶) تمام کتب احادیث اور سیر میں تصریح ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک میل چل کر (مقام بیر ابی غبتہ میں) آپؐ نے فوج کا جائزہ لیا، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ اس بنا پر واپس بھیج دیئے گئے کہ ان کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں، یا یہ کہ سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے تھے، اگر صرف قافلہ کا لوٹنا مقصود ہوتا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ واقع میں جہاد مقصود تھا، جو ایک فریضہ الٰہی ہے، اور اس کے لئے بلوغ کی قید ہے، اس لئے نابالغ لوگ واپس کر دیئے گئے کہ ابھی اس کے اہل نہیں۔

(۷) حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب (۱) میں روایت کی ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو خثیمہؓ نے جو ایک انصاری تھے، اپنے بیٹے سعدؓ سے کہا کہ مجھے جانے دو، اور تم یہاں مستورات کی خبر گیری کرو۔ سعدؓ نے کہا "حضور! اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ضرور میں آپؐ کو اپنے اوپر ترجیح دیتا۔ لیکن یہ شہادت کا درجہ ہے، میں اس کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں"۔ چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور سعدؓ کے نام قرعہ نکلا، سعدؓ شریکِ جنگ ہو کر شہید ہوئے۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ قافلہ لوٹنا نہیں بلکہ جہاد پیش نظر تھا، اور لوگوں کو دولتِ شہادت کے حاصل ہونے کی آرزو ہے۔

غزوۂ بدر کا اصلی سبب

عرب کا خاصۂ قومی تھا کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی آدمی کسی طریقہ سے کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو ایک سخت ہنگامۂ

---

(۱) استیعاب تذکرۂ سعدؓ بن خثیمہ، اصابہ اور طبقات میں یہ واقعہ باختلاف الفاظ منقول ہے۔

کارزار قائم ہوجاتا تھا، دونوں طرف ٹڈی دل امنڈ آتا تھا اور خون کی ندیاں بہ جاتی تھیں، یہ لڑائیاں مدتوں تک قائم رہتی تھیں قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے، تاہم یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا، عرب لکھے پڑھے نہ تھے تاہم مقتول کا نام کاغذ پر درج ہوکر خاندان میں وراثتاً چلا آتا تھا، بچوں کو یہ نام یاد کرایا جاتا تھا کہ بڑے ہوکر اس خون کا انتقام لینا ہے، داحس اور بسوس کی قیامت خیز لڑائیاں جو چالیس چالیس برس قائم رہیں اور جن میں ہزاروں لاکھوں جانیں برباد ہوگئیں اسی بنا پر ہوئیں، عربی زبان میں اس انتقام کو ثار کہتے ہیں اور یہ عرب کی قومی تاریخ کا سب سے بڑا اہم لفظ ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، حضرت عبداللہ بن جحش کے واقعہ میں عمرو بن حضرمی قتل کر دیا گیا تھا، حضرمی عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا، جو تمام قریش کا سردار تھا، بدر اور تمام غزوات کا سلسلہ اسی خون کا انتقام تھا، عروہ بن زبیر (حضرت عائشہؓ کے بھانجے) نے اس واقعہ کو بہ تصریح بیان کیا ہے:

وکان الذی ھاج وقعة بدرو سائر الحروب التی کانت بین رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم وبین مشرکی قریش فیما قال عروۃ بن الزبیر ما کان من قتل واقد (۱) بن عبداللّٰہ التمیمی عمرو بن الحضرمی (تاریخ طبری ۱۲۸۴)	جس چیز نے غزوہ بدر اور دیگر وہ تمام لڑائیاں برپا کیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکینِ عرب کے درمیان واقع ہوئیں، وہ جیسا کہ عروہ بن زبیر کا بیان ہے عمرو بن حضرمی کا قتل کیا جانا ہے، جس کو واقد بن عبداللہ تمیمی نے قتل کر دیا تھا۔

ایک عام غلطی جس نے واقعۂ بحث طلب میں غلطی پیدا کر دی ہے، یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لڑائی کفار سے ہوئی وہ بدر تھی، حالانکہ بدر سے پہلے لڑائیاں شروع ہوچکی تھیں، عروہ بن الزبیر نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک کو جو خط لکھا تھا اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

ان اباسفیان بن حرب اقبل من الشام فی قریب من سبعین راکبا	ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سوار کے ساتھ شام سے آرہا تھا، جو کل کے کل

(۱) عبداللہؓ بن جحش جن کی سرداری میں یہ قتل واقع ہوا، حضرت حمزہؓ کے بھانجے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں زاد بھائی تھے، قاتل یعنی واقد بن عبداللہ حضرت عمرؓ کے خاندان کے حلیف تھے، اور حضرت عمرؓ کے آغازِ خلافت تک زندہ رہے، دیکھو طبقات ابن سعد ذکر عبداللہ بن جحش و واقد بن عبداللہ۔

من قبائل قریش فذکروا لرسول اللّٰہ (صلی اللہ علیہ وسلم) واصحابه وقد کانت الحرب بینهم فقتلت قتلیٰ وقتل ابن الحضرمی فی اناس بنخلة وامرت اساریٰ من قریش......... وکانت تلک الوقعة هاجت الحرب بین رسول اللّٰہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وبین قریش و اول ما اصاب به بعضهم بعضا من الحرب وذلک قبل مخرج ابی سفیان و اصحابه الی الشام

(طبری صفحہ ۱۲۸۵)

قریشی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے اس کا تذکرہ ہوا اور دونوں فریق میں لڑائی شروع ہو چکی تھی، اور ادھر کے چند لوگ جن میں ابن حضرمی بھی تھا مارے جاچکے تھے، اور کچھ قید بھی ہو چکے تھے.....اور اسی واقعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش میں جنگ برپا کردی تھی، اور یہی سب سے پہلا واقعہ تھا جس میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کو صدمہ پہنچایا اور یہ لڑائی ابوسفیان کی روانگیِ شام سے پہلے وقوع میں آچکی تھی۔

اس میں تصریح ہے کہ ابوسفیان جب شام کو روانہ بھی نہیں ہوا تھا، اسی وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی، غزوۂ بدر ابوسفیان کی واپسیِ شام کے بعد واقع ہوا ہے۔

اصلیتِ واقعہ کی تحقیق کا سب سے بڑا اصلی ذریعہ یہ ہے کہ خود حریفانِ جنگ کی شہادت بہم پہنچائی جائے، اس قسم کی شہادتیں بہت کم ہاتھ آسکتی ہیں، لیکن خوش قسمتی سے یہاں اس قسم کی شہادت موجود ہے، حضرت حکیمؓ بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) غزوۂ بدر میں شریک تھے، اور اس وقت تک کافر تھے، وہ عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ برس بڑے تھے، اور گو زمانہ جاہلیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت رکھتے تھے اور نبوت کے بعد بھی یہ محبت قائم رہی، تاہم فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے، وہ رؤسائے قریش میں تھے، حرم کا ایک بڑا منصب یعنی رفادہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا، دار الندوہ کے مہتمم اور مالک بھی وہی تھے (۱)، وہ مروان بن حکم کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے، ایک دفعہ وہ مروان سے ملنے گئے، مروان نے نہایت تعظیم و تکریم کی، صدرِ مجلس سے اٹھ کر ان کے پاس آبیٹھا، اور کہا بدر کا واقعہ بیان کیجئے، انہوں نے واقعہ کے ابتدائی حالات بیان کر کے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اتریں تو میں عتبہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے یہ کہا:

(۱) اصابہ تذکرہ حکیمؓ بن حزام۔

يا اباالوليد هل لك ان تذهب بشرف هٰذا اليوم ما بقيت قال افعل ماذا ؟ قلت انكم لاتطلبون من محمد الا دم ابن الحضرمی وهو حليفك فتحمل ديته فترجع بالناس (۱)

اے ابوالولید! کیا تم چاہتے ہو کہ تمام عمر کے لئے ساری نیک نامی تم ہی کو ہاتھ آئے؟ عتبہ نے کہا کیوں کر؟ میں نے کہا تم (یعنی قریش) محمدؐ سے ابن حضرمی کے خون کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے، اور وہ تمہارا حلیف تھا، اس لئے تم اس کا خوں بہا ادا کردو، کہ سب لوگ واپس چلے جائیں۔

عتبہ نے یہ تجویز پسند کی، لیکن ابو جہل نے نہ مانا، اور حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا، خون کا بدلہ سامنے ہے، کھڑے ہو کر قوم سے دُہائی دو، عامر عرب کے دستور کے موافق ننگا ہو گیا اور پکارا (۲)۔

واعمراه واعمراه — ہائے عمر (حضرمی) ہائے عمر!

آغاز جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدان جنگ میں نکلا وہ یہی عامر حضرمی تھا۔

حکیم بن حزام اور عامر حضرمی غزوۂ بدر تک کافر تھے، عتبہ و ابو جہل جو سرداران قریش تھے، کفر پر تادمِ مرگ قائم رہے، اگر اس درجہ کے لوگ غزوۂ بدر کو حضرمی کے خون کا انتقام سمجھتے تھے اور سمجھتے رہے تو ہم کو کچھ پروا نہیں کرنی چاہئیے کہ اوروں نے جو اس کے سیکڑوں برس بعد پیدا ہوئے، اس کا سبب قافلۂ تجارت کا بچانا سمجھا، وشتان بينهما

ایک ضروری نکتہ

گو یہ امر اب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ غزوۂ بدر کا سبب کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا، تاہم اس گرہ کا کھولنا ضرور ہے کہ ایسے صاف اور صریح واقعہ کے متعلق تمام اربابِ سیر نے متفقاً کیوں غلطی کی؟ اور صحیح بخاری وغیرہ میں یہ تصریحات کیوں پائی جاتی ہیں کہ بدر کی ابتدا قافلہ ہی پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ اصولِ جنگ کے موافق، اکثر غزوات میں یہ ظاہر نہیں کیا جاتا تھا کہ کدھر جانا اور کس غرض سے جانا مقصود ہے؟ صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں حضرت کعبؓ بن مالک جو مشہور صحابی ہیں، ان کا قول نقل کیا ہے:

---

(۱) طبری صفحہ ۱۳۱۳ (و سیرۃ ابن ہشام بمعناہ ذکر غزوۂ بدر) "س"۔ (۲) پوری تفصیل طبری صفحہ ۱۳۱۴ تا ۱۳۱۶ میں ہے۔

ولم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرید غزوۃ الا وری بغیرھا — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے تھے۔

"توریہ" کے معنی شارحینِ بخاری نے یہ لکھے ہیں کہ "آپؐ ایسے موقع پر مبہم اور محتمل المعنیین الفاظ استعمال فرماتے تھے"۔ گو میرے نزدیک یہ کلیہ اس معنی میں صحیح نہیں، تاہم واقعات کے استقصاء سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر واقعہ اس طرح مبہم رکھا جاتا تھا کہ لوگ مختلف قیاس پیدا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جنگِ بدر میں سعدؓ بن خثیمہ کو پہلے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ نہیں بلکہ فوج کا مقابلہ ہے۔ بخلاف اس کے صحیح بخاری میں انہی کعبؓ بن مالک کا قول منقول ہے کہ بدر میں صرف قافلہ سے تعرض کرنا مقصود تھا۔

دیباچہ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ راوی (جس میں صحابہ بھی داخل ہیں) بہت سے موقعوں پر جو واقعہ بیان کرتا ہے، وہ حقیقت میں واقعہ نہیں بلکہ استنباط ہوتا ہے۔ یعنی اس نے اس کو یوں ہی سمجھا، بدر میں بھی یہی صورت پیش آئی، اور اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صحابہؓ نے مختلف قیاس کئے، اور جو قیاس مذاقِ عام کے مناسب تھا وہی پھیل گیا۔

بدر کے نتائج

بدر کے معرکہ نے مذہبی اور ملکی حالت پر گوناگوں اثرات پیدا کئے اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا قدمِ اولین تھا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی ترقی کی راہ میں سدِ آہن تھا، فنا ہو گئے، عتبہ اور ابو جہل کی موت نے قریش کی ریاستِ عامہ کا تاج ابو سفیان کے سر پر رکھا، جس سے دولت اموی کا آغاز ہوا، لیکن قریش کے اصلی زور و طاقت کا معیار گھٹ گیا۔

مدینہ میں اب تک عبداللہ بن ابی بن سلول علانیہ کافر تھا، لیکن اب بظاہر وہ اسلام کے دائرہ میں آگیا، گو تمام عمر منافق رہا، اور اسی حالت میں جان دی۔ "قبائلِ عرب جو سلسلۂ واقعات کا رخ دیکھتے تھے، اگرچہ رام نہیں ہوئے لیکن سہم گئے۔

ان موافق حالات کے ساتھ مخالف اسباب میں بھی انقلاب شروع ہو گیا، یہود سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں یک سو رہیں گے، لیکن اس فتحِ نمایاں نے ان میں حسد کی آگ بھڑکا دی، اور وہ اس کو ضبط نہ کر سکے، چنانچہ اس کی تفصیل یہودیوں کے واقعات میں بالتفصیل آتی ہے۔

قریش کو پہلے صرف حضرمی کا رونا تھا، بدر کے بعد ہر گھر ماتم کدہ تھا اور مقتولین بدر کے انتقام کے لئے مکہ کا بچہ بچہ مضطرب تھا، چنانچہ سویق کا واقعہ اور احد کا معرکہ اسی جوش کا مظہر تھا۔

غزوہ سویق ذی الحجہ ۲ھ

ابو سفیان اب قریش کا رئیس تھا، اور اس منصب کا سب سے بڑا فرض غزوۂ بدر کا انتقام تھا، اس نے بدر سے مشرکین کی واپسی پر منت مانی تھی کہ جب تک مقتولانِ بدر کا انتقام نہ لے گا، نہ غسل جنابت کرے گا نہ سر میں تیل ڈالے گا، چنانچہ دو سو ۲۰۰ شتر سواروں کے ساتھ مدینہ پر بڑھا، یہود کی نسبت معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مدد دیں گے اس لئے پہلے حیی بن اخطب کے پاس گیا، لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا، مایوس ہو کر سلام بن مشکم کے پاس آیا، وہ یہودِ بنو نضیر کا سردار تھا، اور تجارتی خزانہ اسی کے زیر اہتمام رہتا تھا، اس نے بڑے جوش سے استقبال کیا، خوش گوار کھانے کھلائے، شراب پلوائی، مدینہ کے مخفی راز بتائے، صبح کو ابو سفیان عُریض پر حملہ آور ہوا، جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے، ایک انصاری کو جن کا نام سعدؓ بن عمرو تھا، قتل کیا، چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیئے، ان باتوں سے اس کے نزدیک قسم پوری ہو گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، تو آپؐ نے تعاقب کیا، ابو سفیان کے پاس رسد کا سامان صرف ستو تھا، گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا، جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے، عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں، اس لئے یہ واقعہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت فاطمہ زہراؓ کی شادی ذی الحجہ ۲ھ

حضرت فاطمہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سب سے کمسن تھیں، اب ان کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی تھی، اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے،

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی، آپؐ نے فرمایا کہ جو خدا کا حکم ہو گا، پھر حضرت عمرؓ نے جراءت کی، ان کو بھی آپؐ نے کچھ جواب نہیں دیا، بلکہ وہی الفاظ فرمائے، لیکن بظاہر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابن سعد کی اکثر روایتیں، حضرت فاطمہؓ کے حال میں روایت کی ہیں، لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہر حال حضرت علیؓ نے جب درخواست کی تو آپؐ نے حضرت فاطمہؓ کی مرضی دریافت کی، وہ چپ رہیں، یہ ایک طرح کا اظہارِ رضا تھا، آپؐ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تمہارے پاس مہر میں دینے کے لئے کیا ہے، بولے کچھ نہیں، آپؐ نے فرمایا "اور وہ حطمیہ زرہ کیا ہوئی (جنگ بدر میں ہاتھ آئی تھی) عرض کی وہ تو موجود ہے، آپؐ نے فرمایا بس وہ کافی ہے۔

ناظرین کو خیال ہوگا کہ بڑی قیمتی چیز ہوگی، اگر وہ اس کی مقدار جاننا چاہتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ صرف سوا سو روپے (۱)، زرہ کے سوا اور جو کچھ حضرت علیؓ کا سرمایہ تھا وہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک بوسیدہ یمنی چادر تھی، حضرت علیؓ نے یہ سب سرمایہ حضرت فاطمہؓ زہرا کے نذر کیا، حضرت علیؓ اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس رہتے تھے؛ شادی کے بعد ضرورت ہوئی کہ الگ گھر لیں، حضرت حارثہؓ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے، جن میں سے وہ کئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کر چکے تھے، حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ انہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجئے، آپؐ نے فرمایا کہ کہاں تک؟ اب ان سے کہتے شرم آتی ہے، حضرت حارثہؓ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضور میں اور میرے پاس جو کچھ ہے، سب آپؐ کا ہے، خدا کی قسم میرا جو مکان آپؐ لے لیتے ہیں، مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے، غرض انہوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا، حضرت فاطمہؓ اس میں اٹھ گئیں۔

شہنشاہ کونینؐ نے سیدۂ عالم کو جو جہیز دیا وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا، جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے۔

حضرت فاطمہؓ جب نئے گھر میں جا لیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے، دروازہ پر کھڑے ہو کر اذن مانگا، پھر اندر آئے، ایک برتن میں پانی منگوایا، دونوں ہاتھ اس میں ڈالے، اور حضرت علیؓ کے سینہ اور بازوؤں پر پانی چھڑکا، پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا، وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں، ان پر بھی پانی چھڑکا، اور فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل تر شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے (۲)۔

---

(۱) [غلطی سے پہلے اور دوسرے اڈیشن میں سوا روپے چھپ گیا ہے، اس کی تصحیح کر لی جائے] "س" (۲) یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد اور اصابہ سے ماخوذ ہے۔

واقعات متفرقہ
سنہ ۲ھ

(مورخین کے بیان کے مطابق اسی سال رمضان مبارک کے روزے فرض ہوئے۔

صدقۂ عید الفطر کا حکم بھی اسی سال سے جاری ہوا، پہلے آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے، پھر صدقہ کا حکم دیا۔

عید الفطر کی نماز باجماعت عیدگاہ میں بھی اسی سال ادا فرمائی، اس سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔

ارباب سیر کی ترتیب کے مطابق غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر بھی اسی سال کے واقعات میں ہونا چاہیے تھا، لیکن اتصال اور تسلسلِ واقعہ کی بنا پر وہ آیندہ مذکور ہوگا۔)

سنہ ۳ھ

غزوۂ اُحد[1]

(وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ [2] ○ آلِ عمران۔ ۳: ۱۳۹)

عرب میں صرف ایک شخص کا قتل لڑائی کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتا تھا جو سیکڑوں برس تک ختم نہیں ہو سکتا تھا، طرفین میں سے جس کو شکست ہوتی تھی وہ انتقام کو ایسا فرض مؤبد جانتا تھا جس کے ادا کئے بغیر اس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی تھی، بدر میں قریش کے ستّر آدمی مارے گئے تھے جن میں اکثر وہ تھے، جو قریش کے تاج و افسر تھے، اس بنا پر تمام مکہ جوشِ انتقام سے لبریز تھا۔

قریش کا کاروانِ تجارت جو جنگ بدر کے زمانے میں نفع کثیر کے ساتھ شام سے واپس آرہا تھا، اس کا راس المال حصہ داروں کو تقسیم کر دیا گیا تھا، لیکن زرِ منافع امانت کے طور پر محفوظ تھا۔

قریش کو کشتگانِ بدر کے ماتم سے فرصت ملی تو اس فرض کے ادا کا خیال آیا، چند سردارانِ قریش جن میں ابو جہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، ان لوگوں کو جن کے عزیز و اقارب جنگ بدر میں قتل ہو چکے تھے، ساتھ لے کر ابو سفیان کے پاس گئے اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہماری قوم کا خاتمہ کر دیا، اب انتقام کا وقت ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مالِ تجارت کا جو نفع اب تک جمع ہے، وہ اس کام میں صرف کیا جائے، یہ ایک درخواست تھی، جو پیش ہونے سے پہلے قبول کر لی گئی تھی، لیکن قریش کو اب مسلمانوں کے قوت و زور کا اندازہ ہو چکا تھا، وہ جانتے تھے کہ جنگ بدر میں جس سامان سے وہ گئے تھے، اس سے اب کچھ زیادہ درکار ہے، عرب میں جوش پھیلانے اور دلوں کے گرمانے کا سب سے بڑا آلہ شعر تھا، قریش میں دو شاعر، شاعری میں مشہور تھے، عمرو جمحی اور مسافع، عمرو جمحی غزوۂ بدر میں گرفتار ہو گیا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اقتضائے رحم سے اس کو رہا کر دیا تھا، قریش کی درخواست پر وہ اور مسافع مکہ سے نکلے اور تمام قبائلِ قریش میں اپنی آتش بیانی سے آگ لگا آئے۔

---

(۱) مدینہ منورہ سے شمالی جانب قریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔ (۲) (صحیح بخاری باب غزوۂ احد میں ہے کہ یہ آیت غزوۂ احد میں نازل ہوئی۔)

لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوشِ جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں، جس لڑائی میں خاتونیں ساتھ ہوتی تھیں، عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوگی تو عورتیں بے حرمت ہوں گی، بہت سی عورتیں ایسی تھیں جن کی اولاد جنگِ بدر میں قتل ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ خود جوشِ انتقام سے لبریز تھیں اور انہوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گے۔ غرض جب فوجیں تیار ہوئیں تو بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتیں بھی فوج میں شامل ہوئیں۔ ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں (۱)۔

۱۔ ہند،	عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں،
۲۔ امِ حکیم،	عکرمہ (فرزند ابو جہل) کی بیوی،
۳۔ فاطمہ (بنت ولید)	حضرت خالدؓ کی بہن،
۴۔ برزۃ	مسعود ثقفی جو طائف کا رئیس تھا، اس کی بیٹی،
۵۔ ریطہ	عمرو بن العاص کی زوجہ،
۶۔ خناس	حضرت مصعبؓ بن عمیر کی ماں

حضرت حمزہؓ نے ہند کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا، جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اس بنا پر ہند نے وحشی کو جو جبیر کا غلام اور حربہ اندازی میں کمال رکھتا تھا، حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا، اور یہ اقرار ہوا کہ اس کارگذاری کے صلہ میں وہ آزاد کر دیا جائے گا۔

حضرت عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا گو اسلام لا چکے تھے، لیکن اب تک مکہ ہی میں مقیم تھے، انہوں نے تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجے، اور قاصد کو تاکید کی کہ تین رات دن میں مدینہ پہنچ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے پانچویں شوال سنہ ۳ھ کو دو خبر رساں جن کے نام انس اور مونس تھے، خبر لانے کے لئے بھیجے، انہوں نے آکر

(۱) طبری (ج ۳ ص ۱۳۸۶) زرقانی (ج ۲ ص ۳۰) نے ان چھ خواتین کے سوا سُلافہ بنت سعد اور عمیرہ بنت علقمہ دو اور خاتونوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں خناس اور عمیرہ کے سوا باقی خواتین بعد کو مسلمان ہو گئیں۔ خناس اور عمیرہ کے اسلام کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ (زرقانی علی المواہب) "س"

اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آگیا اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا۔

آپؐ نے حبابؓ بن منذر کو بھیجا کہ فوج کی تعداد کی خبر لائیں۔ انہوں نے آکر صحیح تخمینہ سے اطلاع دی۔ چونکہ شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے۔ حضرت سعدؓ بن عبادہؓ، اور حضرت سعدؓ بن معاذ ہتھیار لگا کر تمام رات مسجدِ نبویؐ کے دروازہ پر پہرہ دیتے رہے۔

صبح کو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول جو اب تک کبھی شریکِ مشورہ نہیں کیا گیا تھا (۱)۔ اس نے بھی یہی رائے دی۔ لیکن ان نوخیز صحابہ (۲) نے جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافِ مرضی نکلنے پر مجبور کیا، سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں، ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچے اور کوہ احد پر پڑاؤ ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن نمازِ جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکلے۔ عبداللہ بن ابی تین سو کی جمعیت لے کر آیا تھا، لیکن یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میری رائے نہ مانی"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اب صرف ... سات سو صحابہ رہ گئے۔ ان میں ایک سو زرہ پوش تھے۔ مدینہ سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا، اور جو لوگ کمسن تھے، واپس کر دیئے گئے۔ ان میں حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت براءؓ بن عازب، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت عرابہؓ اوسی بھی تھے۔ لیکن جاں نثاری کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے جب حضرت رافعؓ بن خدیج سے کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو، واپس جاؤ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، چنانچہ ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ

(۱) طبری (ج ۳ ص ۱۳۸۹ مطبوعۂ یورپ) س۔ (۲) (زرقانی ج ۲ ص ۲۵) س۔

لے لئے گئے (۱) سمرہؓ ایک نوجوان، جوان کے ہم سن تھے، انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافعؓ کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں، اس لئے اگر ان کو اجازت ملتی ہے، تو مجھ کو بھی ملنی چاہیئے، دونوں کا مقابلہ کرایا گیا، اور سمرہؓ نے رافعؓ کو زمین پر دے مارا اس بنا پر ان کو اجازت مل گئی۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی، حضرت مصعب بن عمیرؓ کو علم عنایت کیا، حضرت زبیرؓ بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہؓ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے (۲)، پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن اُدھر سے آئیں، اس لئے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ "گو لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں"۔ حضرت عبداللہؓ بن جبیر ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے انہوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی، میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابو جہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان ابن امیہ کی کمان میں تھا، جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیر اندازوں کے دستے الگ تھے، جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علم بردار تھا، دو سو ۲۰۰ گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونانِ قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں، جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقامِ خون کے رجز تھے، ہند (ابو سفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے:

نحن بنات طارق	ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
نمشی علی النمارق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
ان تقبلوا نعانق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی
او تدبروا نفارق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گی

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبول عام شخص تھا اور مدینہ

(۱) طبری جلد ۲ صفحہ ۱۳۹۱ (یہ طبری کی روایت ہے، لیکن بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافعؓ کو اجازت مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس نوجوانی ہی میں تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کا یہ حال معلوم ہوا تو ان کو شرکت کی اجازت دے دی، ابن ہشام ذکر غزوۂ اُحد و زرقانی ج ۲ ص ۲۹ و بدایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۵) "س"

(۲) ایضاً ص ۱۳۹۴۔

چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو ۱۵۰ آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا، اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا، چونکہ اس کو خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیں گے، میدان میں آکر پکارا، "مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں"، انصار نے کہا "ہاں او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، خدا تیری آرزو بر نہ لائے"۔

قریش کا علم بردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا "کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے؟ کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے" (۱)، حضرت علی مرتضیٰؓ نے صف سے نکل کر کہا "میں ہوں" یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی، طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا:

ان علی اھل اللواء حقا — علم بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون میں
ان تخضب الصعدۃ او تندقا — رنگ دے، یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے،

حضرت حمزہؓ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا کہ "میں ساقیِ حجاج کا بیٹا ہوں"۔

اب عام جنگ شروع ہو گئی، حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابو دجانہؓ، فوجوں کے دل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں، حضرت ابو دجانہؓ عرب کے مشہور پہلوان تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دستِ مبارک میں تلوار لے کر فرمایا، کون اس کا حق ادا کرتا ہے، اس سعادت کے لئے دفعتاً بہت سے ہاتھ بڑھے، لیکن یہ فخر حضرت ابو دجانہؓ کے نصیب میں تھا، اس غیر متوقع عزت نے ان کو بادۂ شجاعت سے مست کر دیا، سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے، لیکن اس وقت پسند ہے"۔ حضرت ابو دجانہؓ فوجوں کو چیرتے لاشوں پر لاشے گراتے، بڑھتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہند سامنے آگئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھالی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

---

(۱) یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں۔

حضرت حمزہؓ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے، اور جس طرف بڑھتے تھے، صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں، اسی حالت میں سباع غبشانی سامنے آگیا، پکارے کہ "او ختانۃ النساء کے بچے کہاں جاتا ہے؟" - یہ کہہ کر تلوار ماری، وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا، اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا، وہ حضرت حمزہؓ کی تاک میں تھا، حضرت حمزہؓ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں، اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے، پھینک کر مارا، جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا، حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کرنا کرنا چاہا، لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے، اور روح پرواز کر گئی (۱)۔

کفار کے علم بردار لڑ لڑ کر قتل ہو جاتے تھے، تاہم علم گرنے نہیں پاتا تھا، ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جانباز بڑھ کر علم کو ہاتھ میں لے لیتا تھا، ایک شخص نے جس کا نام صواب تھا جب علم ہاتھ میں لیا تو کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ ساتھ کٹ کر گر پڑے، لیکن وہ قومی علم کو اپنی آنکھوں سے خاک پر نہیں دیکھ سکتا تھا، علم کے گرنے کے ساتھ سینہ کے بل زمین پر گرا، اور علم کو سینہ سے دبا لیا، اسی حالت میں یہ کہتا ہوا مارا گیا کہ "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا" (۲)۔ علم دیر تک خاک پر پڑا رہا، آخر ایک بہادر خاتون (عمرۃ بنت علقمہ) دلیرانہ بڑھی اور علم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا، یہ دیکھ کر ہر طرف سے قریش سمٹ آئے اور اکھڑے ہوئے پانوں پھر جم گئے۔

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا لیکن اس کے بیٹے حضرت حنظلہؓ اسلام لا چکے تھے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی، لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے، حضرت حنظلہؓ نے کفار کے سپہ سالار (ابو سفیان) پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابو سفیان کا فیصلہ کر دے، دفعۃً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر ان کے وار کو روکا اور ان کو شہید کر دیا، تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف بھاری تھا، علم برداروں کے قتل اور حضرت علیؓ اور حضرت ابو دجانہؓ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پانوں اکھڑ گئے، بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں

(۱) صحیح بخاری باب قتل حمزہ، صفحہ ۵۸۳ - (۲) ابن ہشام و طبری (ج ۳ ص ۱۴۰۱) "س"

بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں، اور مطلع صاف ہو گیا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی، یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر مقرر کئے گئے تھے وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

حضرت عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا، لیکن وہ رک نہ سکے (۱)، تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا، عبداللہؓ بن جبیر چند جاں بازوں کے ساتھ جم کر لڑے، لیکن سب کے سب شہید ہوئے، اب راستہ صاف تھا، خالد نے سواروں کے دستہ کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا، لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں، بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے، حضرت مصعبؓ بن عمیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی، اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی، حضرت حذیفہؓ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں، حضرت حذیفہؓ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں، لیکن کون سنتا تھا، غرض وہ شہید ہو گئے، اور حضرت حذیفہؓ نے ایثار کے لہجہ میں کہا "مسلمانو! خدا تم کو بخش دے"۔ (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جاں نثار پہلو میں ہیں جن میں حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت زبیر بن العوام، حضرت ابو دجانہؓ، حضرت طلحہؓ کا نام بہ تخصیص معلوم ہے، صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ رہ گئے تھے۔

اس ہلچل اور اضطراب میں اکثروں نے تو بالکل ہمت ہار دی، لیکن جاں بازوں کا بھی زور نہیں چلتا تھا، جو جہاں تھا وہیں گھر کر رہ گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کو خبر نہ تھی، حضرت علیؓ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے، لیکن کعبۂ مقصود (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)، کا پتہ نہ تھا، حضرت انسؓ کے چچا ابن نضر لڑتے بھڑتے موقع سے آگے نکل گئے، دیکھا تو حضرت عمرؓ نے مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیا ہے (۳)، پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟

(۱) صحیح بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۷۹۔ (۲) صحیح بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۸۱۔ (۳) یہ عام ارباب سیر کی روایت ہے، صحیح بخاری میں یہ واقعہ مذکور ہے، لیکن حضرت عمرؓ کا نام نہیں۔

بولے "اب لڑ کر کیا کریں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شہادت پائی"۔ ابن نضر نے کہا "ان کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے"۔ یہ کہہ کر فوج میں گھس گئے اور لڑ کر شہادت پائی۔ لڑائی کے بعد جب ان کی لاش دیکھی گئی تو اسی ۸۰ سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے۔ کوئی شخص پہچان تک نہ سکا، ان کی بہن نے انگلی دیکھ کر پہچانا (۱)۔

جاں نثارانِ خاص برابر لڑتے جاتے تھے، لیکن نگاہیں سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ڈھونڈھتی تھیں، سب سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک کی نظر پڑی چہرہ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں، حضرت کعبؓ نے پہچان کر پکارا "مسلمانو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں"۔ یہ سُن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے، کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رخ پر زور دیا، دل کا دل ہجوم کر کے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کون مجھ پر جان دیتا ہے"؟ زیادؓ بن سکن پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے، اور ایک ایک نے جاں بازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں (۲)، حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ، لوگ اٹھا کر لائے، کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منھ رکھ دیا، اور اسی حالت میں جان دی۔

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہان نیاز مندے ۔۔۔ کہ بہ وقتِ جان سپردن بسرش رسیدہ باشی

(ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا، اس نے بڑھ کر پوچھا کہ "یا رسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہونگا"۔ آپؐ نے فرمایا "جنت میں" اس بشارت سے بے خود ہو کر اس طرح کفار پر ٹوٹ پڑا کہ مارا گیا (۳)۔

عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا، صفوں کو چیرتا پھاڑتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آگیا، اور چہرۂ مبارک پر تلوار ماری، اس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں، چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے، یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے آپؐ کو دائرہ میں لے لیا، ابو دجانہؓ جھک کر سپر بن گئے اب جو تیر آتے تھے،

---

(۱) (صحیح بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۷۹ و صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۳۸۔ باب ثبوت الجنۃ للشہید) س۔ (۲) صحیح مسلم غزوۂ احد میں ہے کہ سات انصاری تھے اور ساتوں نے باری باری اپنی جانیں فدا کیں۔ [(۳) بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۷۹]س۔

ان کی پیٹھ پر آتے تھے، حضرت طلحہؓ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا، ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا، بے درد۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر برسا رہے تھے، اور آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

(۱) رب اغفر قومی فانہم لا یعلمون — اے خدا میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں۔

حضرت ابو طلحہؓ جو حضرت انسؓ کے علاتی باپ تھے، مشہور قدر انداز تھے، انہوں نے اس قدر تیر برسائے کہ دو تین کمانیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گئیں، انہوں نے سپر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر اوٹ کر لیا تھا کہ آپؐ پر کوئی وار نہ آنے پائے، آپؐ کبھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو عرض کرتے کہ آپؐ گردن نہ اٹھائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے، یہ میرا سینہ سامنے ہے (۲)؛ (حضرت سعدؓ بن وقاص بھی مشہور تیرانداز تھے، اور اس وقت آپؐ کے رکاب میں حاضر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ترکش ان کے آگے ڈال دیا، اور فرمایا "تم پر میرے ماں باپ قربان، تیر مارتے جاؤ" (۳)۔

اسی حالت میں آپؐ کی زبان سے عبرت کے لہجہ میں یہ لفظ نکلا "وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے"۔ بارگاہ خداوندی میں یہ الفاظ پسند نہ آئے اور یہ آیت اتری:

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (۱۲۸:۳) تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں۔

چنانچہ صحیح بخاری غزوۂ اُحد میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے، کہ دشمن ادھر نہیں آسکتے تھے، ابو سفیان نے دیکھ لیا، فوج لے کر پہاڑی پر چڑھا، لیکن حضرت عمرؓ اور چند صحابہؓ نے پتھر برسائے جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا (۴)۔

آپؐ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی تو اخلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے، جناب فاطمہؓ زہرا نے آکر دیکھا تو ابھی تک چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے، حضرت علیؓ سپر میں بھر کر پانی لائے، جناب سیدہؓ دھوتی تھیں لیکن خون نہیں تھمتا تھا، بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا، اور زخم پر رکھ دیا، خون فوراً تھم گیا (۵)۔

ابو سفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ "یہاں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں"؟ آپؐ

---

(۱) (صحیح مسلم غزوۂ اُحد ج ۲ ص ۹۰) (۲) صحیح بخاری غزوۂ اُحد صفحہ ۵۸۱۔ (۳) صحیح بخاری غزوۂ اُحد صفحہ ۵۸۰۔ (۴) طبری ۱۴۱۰ و ۱۴۱۱۔ (۵) صحیح بخاری غزوۂ اُحد (ج ۲ ص ۵۸۴)

نے حکم دیا کوئی جواب نہ دے، ابو سفیان نے حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کا نام لے کر پکارا اور جب کچھ آواز نہ آئی تو پکار کر بولا سب مارے گئے، حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا، بول اٹھے، "او دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں"۔

ابو سفیان نے کہا،

اعل هبل (۱) اے ہبل تو اونچا رہ،

صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کہا

اللہ اعلیٰ واجلّ خدا اونچا اور بڑا ہے،

ابو سفیان نے کہا،

لنا العزّیٰ ولا عزّیٰ لکم ہمارے پاس عزیٰ ہے (۲) تمہارے پاس نہیں،

صحابہؓ نے کہا،

اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم خدا ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں۔

ابو سفیان نے کہا "آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے، فوج کے لوگوں نے مردوں کے ناک کان کاٹ لئے ہیں، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا، لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو کچھ رنج بھی نہیں ہوا" (۳)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مستورات اور بچوں کو حضرت یمانؓ اور حضرت ثابتؓ کی حفاظت میں مدینہ کے پاس کے قلعوں میں بھیج دیا تھا، ان لوگوں کو شکست کی خبر معلوم ہوئی تو سب کو چھوڑ کر اُحد کی طرف بڑھے، حضرت ثابتؓ مشرکوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت یمانؓ کو مسلمان ہجومِ عام میں پہچان نہ سکے، ان پر تلواریں برس پڑیں، ان کے صاحبزادے حضرت حذیفہؓ نے ہر چند "ہاں ہاں" کہا اور پکارا کہ میرے باپ ہیں، لیکن ہنگامہ میں کون سنتا تھا، حذیفہؓ یہ کہہ کر رہ گئے کہ "مسلمانو! خدا تمہارے اس گناہ کو بخش دے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یمانؓ کا خوں بہا مسلمانوں کی طرف سے ادا کرنا چاہا، لیکن حضرت حذیفہؓ نے معاف کر دیا، ابن ہشام میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے، صحیح بخاری میں بھی ہے، لیکن مختصر ہے۔

---

(۱) بت کا نام۔ (۲) بت کا نام ہے، لفظی معنی عزت کے ہیں۔ (۳) یہ تمام تفصیل بخاری غزوۂ اُحد کے ذکر میں ہے۔

خاتونانِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ان کے ناک کان کاٹ لئے۔ہند (حضرت امیر معاویہؓ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا۔حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا۔اور چبا گئی۔لیکن گلے سے اتر نہ سکا۔اس لئے اگل دینا پڑا۔تاریخوں میں ہند کا لقب جو جگرخوار لکھا جاتا ہے۔اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔ہند فتحِ مکہ میں ایمان لائی۔لیکن جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے تفصیل آگے آئے گی۔

اس غزوہ میں اکثر خاتونانِ اسلامؓ نے بھی شرکت کی۔حضرت عائشہؓ اور حضرت امِ سلیمؓ جو حضرت انسؓ کی ماں تھیں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ "میں نے حضرت عائشہؓ اور امِ سلیمؓ کو دیکھا کہ پائنچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتی تھیں۔اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔مشک خالی ہو جاتی تھی تو جاکر بھر لاتی تھیں (۱)"۔ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امِ سلیطؓ نے بھی جو حضرت ابو سعید خدریؓ کی ماں تھیں یہی خدمت انجام دی (۲)۔

عین اس وقت جب کہ کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا۔اور آپؐ کے ساتھ صرف چند جاں نثار رہ گئے تھے۔حضرت امِ عمارہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہو گئیں۔کفار جب آپؐ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ابن قمیہ جب دڑ اتا ہوا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچ گیا، تو حضرت امِ عمارہؓ نے بڑھ کر روکا۔چنانچہ کندھے پر زخم آیا۔اور غار پڑ گیا۔انہوں نے بھی تلوار ماری۔لیکن وہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا۔اس لئے کارگر نہ ہوئی (۳)۔

حضرت صفیہؓ حضرت حمزہؓ کی بہن،شکست کی خبر سن کر مدینہ سے نکلیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاحبزادے حضرت زبیرؓ کو بلا کر ارشاد کیا کہ حمزہ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔حضرت زبیرؓ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیغام سنایا بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سن چکی ہوں لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) (صفحہ ۵۸۱۔کتاب المغازی غزوۂ اُحد) (۲) صحیح بخاری صفحہ ۵۸۲ ذکر امِ سلیطؓ۔ (۳) ابن ہشام ص ۸۴ ج ۲، مطبع محمد علی مصر)

نے اجازت دی۔ لاش پر گئیں۔ خون کا جوش تھا، اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے، لیکن اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہہ کر چپ ہو رہیں اور مغفرت کی دعا مانگی (۱)۔

انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں مارے گئے تھے، باری باری تین سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی، لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں۔ اس نے پاس آکر چہرۂ مبارک دیکھا، اور بے اختیار پکار اٹھی (۲)۔

کل مصیبۃ بعدک جلل، تیرے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں،

میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا اے شہِ دین ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

(مسلمانوں کی طرف ستر، آدمی مارے گئے، جن میں زیادہ تر انصار تھے، لیکن مسلمانوں کے افلاس کا یہ حال تھا کہ اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ شہداء کی پردہ پوشی ہو سکتی، حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ ایک صحابی تھے کہ ان کا پانوں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا تو پانوں کھل جاتا، آخر پانوں اذخر کی گھاس سے چھپادیئے گئے، یہ وہ حیرت انگیز منظر تھا، کہ بعد کو بھی یہ واقعہ مسلمانوں کو یاد آجاتا تو آنکھیں تر ہو جاتیں، شہدا بے غسل اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دو دو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کئے گئے، جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کو مقدم کیا جاتا، ان شہداء پر نماز جنازہ بھی اس وقت نہیں پڑھی گئی (۳)، آٹھ برس کے بعد وفات سے ایک دو برس پہلے جب آپؐ ادھر سے گذرے تو بے اختیار آپؐ پر رقت طاری ہوئی، اور اس طرح آپؐ نے پردرد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو، اور اس کے بعد آپؐ نے ایک خطبہ دیا کہ "مسلمانو! تم سے یہ خوف نہیں ہے کہ پھر مشرک بن جاؤ گے، لیکن یہ ڈر ہے کہ دنیا میں نہ پھنس جاؤ" (۴)۔

(۱) طبری (۱۴۲۱)۔ (۲) طبری ص ۱۴۲۵۔ (۳) (یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، لیکن دوسری کتابوں میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہؓ پر تو خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے شہداء پر بھی نماز جنازہ پڑھی، یہ شہداء ایک ایک کر کے اور بعض میں ہے کہ دس دس کر کے لائے جاتے تھے، اور آپؐ ان پر نماز جنازہ پڑھتے تھے، اور حضرت حمزہؓ کی لاش مبارک پر ہر جماعت کے ساتھ گویا ستر، دفعہ یا سات، دفعہ نماز ادا کی گئی، شرح معانی الآثار طحاوی باب الصلوٰۃ علی الشہداء، و نصب الرایہ زیلعی باب احادیث الصلوٰۃ علی الشہید و مغازی واقدی ص ۳۰۰ مطبوعہ کلکتہ) "س"۔ (۴) یہ تمام واقعات صحیح بخاری غزوۂ اُحد کے متفرق ابواب میں ہیں۔

دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو مسلمان زخم سے چور تھے، تاہم یہ خیال کر کے کہ ابوسفیان مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو، آپؐ نے مسلمانوں کی طرف روے خطاب کر کے فرمایا کہ کون ان کا تعاقب کرے گا فوراً ستر، آدمیوں کی ایک جماعت اس مہم کے لئے تیار ہو گئی جن میں حضرت ابوبکرؓ و زبیرؓ بھی داخل تھے (۱)۔

ابوسفیان اُحد سے روانہ ہو کر جب مقام روحا پہنچا، یہاں خیال آیا کہ کام ناتمام رہ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی سے گمان تھا، دوسرے ہی دن آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی واپس نہ جائے، چنانچہ حمراء اسد تک جو مدینہ سے ۸ میل ہے تشریف لے گئے، قبیلۂ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا، لیکن در پردہ اسلام کا طرف دار تھا، اس کا رئیس معبد خزاعی شکست کی خبر سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور واپس جا کر ابوسفیان سے ملا، ابوسفیان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا، معبد نے کہا "میں دیکھتا آتا ہوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سر و سامان سے آرہے ہیں کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہے"۔ غرض ابوسفیان واپس گیا (۲)، یہی واقعہ ہے جس کو مورخین نے تکثیر غزوات کے شوق میں ایک نیا غزوہ بنا لیا ہے، اور حمراء الاسد کا ایک نیا عنوان قائم کیا ہے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں تشریف لائے تو تمام مدینہ ماتم کدہ تھا، آپؐ جس طرف سے گذرتے تھے، گھروں سے ماتم کی آوازیں آتی تھیں، آپؐ کو عبرت ہوئی کہ سب کے عزیز و اقارب ماتم داری کا فرض ادا کر رہے ہیں، لیکن حمزہؓ کا کوئی نوحہ خواں نہیں ہے، رقت کے جوش میں آپؐ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

اما حمزۃ فلا بواکی لہ (۳) — لیکن حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں۔

انصارؓ نے یہ الفاظ سنے تو تڑپ اٹھے، سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینانِ انصار کی بھیڑ تھی، اور حضرت حمزہؓ کا ماتم بلند تھا، ان کے حق میں دعاے خیر کی اور فرمایا میں تمہاری ہمدردی کا شکر گذار ہوں، لیکن مردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں، (عرب میں دستور تھا کہ مردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بین کرتی تھیں، کپڑے پھاڑ لیتی تھیں گال نوچتی، گالوں پر تھپڑ مارتی تھیں، اور چیختی

(۱) (صحیح بخاری صفحہ ۵۸۴) س۔ (۲) طبری ۱۴۲۸ - ۱۴۲۹ (۳) (مسند احمد ج ۲ ص ۸۴) س۔

چلاتی تھیں، یہ رسمِ بد اسی دن سے بند کر دی گئی، اور فرمایا گیا کہ آج سے کسی مردہ پر نوحہ نہ کیا جائے (۱)، یہ بھی بعد کو ارشاد ہوا کہ اس طرح ماتم کرنا مسلمان کی شان نہیں (۲)۔

(قرآن مجید میں سورۂ آلِ عمران میں غزوۂ اُحد کا مفصل ذکر موجود ہے)

واقعاتِ متفرقہ ۳ھ

اس سال یعنی ۳ھ حضرت امام حسن (رضی اللہ عنہ) کی ولادت ہوئی، رمضان کی پندرہ ویں تاریخ تھی، اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ سے جو حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں اور غزوۂ بدر کے زمانہ میں بیوہ ہو گئی تھیں نکاح کیا، اسی سال حضرت عثمانؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت امِ کلثومؓ سے شادی کی۔

وراثت کا قانون بھی اسی سال نازل ہوا، اب تک وراثت میں ذوی الارحام کا کوئی حصہ نہ تھا، ان کے حقوق کی بھی تفصیل کی گئی، مشرکہ کا نکاح مسلمان سے اب تک جائز تھا، اس سال اس کی بھی تحریم نازل ہوئی۔

---

(۱) ابن ہشام (غزوۂ اُحد) اور مسند احمد (ج ۲ صفحہ ۸۴) (۲) (صحیح بخاری کتاب الجنائز) "س"

☆☆☆☆☆

سنہ ۴ھ

سلسلۂ غزوات و سرایا[1]

تمام قبائلِ عرب بجز ایک دو کے، اسلام کے دشمن تھے، دشمنی زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ ہر قبیلہ بت پرستی کو اپنا دین و آئین سمجھتا تھا، اسلام اسی کو مٹاتا تھا، اس کے ساتھ قریش کا اثر تمام عرب پر تھا، حج کے زمانہ میں تمام قبائل مکہ میں جمع ہوتے تھے، اور قریش ان کو اسلام کی دشمنی پر برانگیختہ کرتے تھے، ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ تمام قبائل کی وجہِ معاش لوٹ اور غارت گری تھی، اور اسلام اس کو نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی روکتا تھا، اس لئے وہ جانتے تھے کہ اسلام اگر قائم ہو گیا تو ہمارے ذرائع معاش بند ہو جائیں گے، تاہم بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھا دیا تھا، جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے۔ لیکن اُحد کی شکست نے حالت بدل دی اور دوبارہ تمام قبائل دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے، سیرتِ نبویؐ میں سرایا (چھوٹی لڑائیاں) کا جو ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے، اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں، عام مورخوں نے اگرچہ اپنی عادت کے موافق ان لڑائیوں کے ذکر میں ان کے اسباب سے بحث نہیں کی، لیکن ابن سعد نے طبقات میں، اور ائمہ فن نے قریباً ہر واقعہ کا سبب لکھ دیا ہے، یعنی کسی خاص قبیلہ نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کے لئے فوجیں بھیجیں۔

سریہ ابی سلمہ

۱۔ سب سے پہلے ۱/ محرم سنہ ۴ھ میں طلحہ اور خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو فید کے کوہستانی علاقہ قطن میں رہتا تھا، مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت ابو سلمہؓ کو ایک سو پچاس (۱۵۰) مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس طرف روانہ کیا، یہ خبر سن کر ان کی جماعت منتشر ہو گئی (۲)۔

---

(۱) غزوہ اور سریہ میں جو فرق ہے اس کی نسبت علمائے سیرت مختلف الرائے ہیں، زیادہ مقبول یہ رائے ہے کہ جس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے، وہ غزوہ کے نام سے موسوم ہے، اور جس میں صحابہ افسر مقرر کر کے بھیج دیئے جاتے تھے وہ سریہ کہلاتا تھا۔ (۲) ابن سعد ص ۳۵ (ج ۲ قسم اول) اصل عبارت یہ ہے بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان طليحة و سلمة ابنی خویلد قد سارا فی قومهما و من اطاعهما یدعو نهم الی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

سریہ ابن انیس

۲۔ اس کے بعد محرم سنہ ۴ھ میں سفیان بن خالد جو قبیلہ لحیان کا تھا اور جو کوہستان عُرنہ کا رئیس تھا، مدینہ پر حملہ کا قصد کیا، اس کے مقابلہ کے لئے آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو بھیجا جنہوں نے لطائف الحیل سے موقع حاصل کیا اور سفیان کو قتل کر دیا (۱)۔

صفر سنہ ۴ھ میں ابو براء کلابی (۲) جو قبیلہ کلاب کا رئیس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ چند لوگوں کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں، آپؐ نے فرمایا "مجھ کو نجد کی طرف سے ڈر ہے"۔ (۳) ابو براء نے کہا "ان کا میں ضامن ہوں"۔ آپؐ نے منظور فرمایا، اور ستر ۷۰ انصار ساتھ کر دیئے، یہ لوگ نہایت مقدس اور درویش تھے، اور اکثر اصحاب صفہ میں سے تھے، ان کا معمول تھا کہ دن بھر لکڑیاں چنتے شام کو فروخت کر کے کچھ اصحابِ صفہ کے نذر کرتے، کچھ اپنے لئے رکھتے۔

بیر معونہ

ان لوگوں نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا، اور حرام بن ملحان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دے کر عامر بن طفیل (بن مالک بن جعفر کلابی عامری) کے پاس بھیجا، جو قبیلہ کا رئیس تھا، عامر نے حرام کو قتل کر دیا، اور آس پاس کے جو قبائل تھے، یعنی عصیۃ، رعل، ذکوان، سب کے پاس آدمی دوڑا دیئے کہ تیار ہو کر آئیں، ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا، اور عامر کی سرداری میں آگے بڑھا، صحابہؓ حرام کی واپسی کے منتظر تھے، جب دیر لگی تو خود روانہ ہوئے، راستہ میں عامر کی فوج کا سامنا ہوا، کفار نے ان کو گھیر لیا، اور سب کو قتل کر دیا (۴)

---

(۱) طبقات ابن سعد ص ۳۶ اصل عبارت یہ ہے وذلک انہ بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان سفین بن خالد الھذلی...... قد جمع الجموع لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۲) (ابو براء بعد کو اسلام لائے یا نہیں اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے، ذہبی کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اسلام نہیں لائے، اصابہ میں ہے کہ ان کے قبول اسلام کی کوئی روایت نہیں ہے، تاہم بعض روایات کی بنا پر ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسلام لائے تھے، زرقانی جلد ۲ ص ۸۶) "س" (۳) (اور یہ کچھ بے جا بھی نہ تھا عامر بن طفیل جو ان اطراف کا رئیس تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ "میرے تمہارے درمیان تین ۳ باتیں ہیں، بادیہ کے مالک تم ہو، اور شہروں کا میں بنوں، یا اپنے بعد مجھ کو اپنا جانشین بناؤ ورنہ غطفان کو لے کر میں چڑھ آؤں گا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور نہیں فرمایا تھا، اس لئے اس کی طرف سے ڈر تھا، (صحیح بخاری غزوۃ الرجیع ورعل وذکوان)۔ (۴) (صحابہ کی اس جماعت میں حضرت کعبؓ بن زید بھی تھے، کفار نے سمجھا کہ یہ بھی شہید ہو گئے ہیں، لیکن ان میں جان باقی تھی، اور بعد کو زندہ بچ گئے، اور غزوۂ خندق میں شہید ہوئے، زرقانی ج ۲ ص ۸۸) "س"

صرف عمرو (بن) امیہؓ (۱) کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ "میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی، میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں" یہ کہہ کر ان کی چوٹی کاٹی اور چھوڑ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا، مہینہ بھر نماز فجر میں ان ظالموں کے حق میں بد دعا کی، حضرت عمروؓ بن امیہ نے (واپسی میں راستہ میں بنی عامر کے) ۲ دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا (جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امان دے چکے تھے، مگر حضرت عمروؓ بن امیہ کو اس کا علم نہ تھا وہ یہ سمجھے کہ ہم نے بنی عامر سے ان کی اس بے وفائی کا بدلہ لے لیا جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ کیا ہے (۲)۔ (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو) اس پر آپؐ نے ناراضی ظاہر فرمائی اور دونوں کے خوں بہا ادا کر دینے کا اعلان فرمایا۔

واقعہ رجیع

انہی دنوں عضل اور قارۃ جو دو مشہور قبیلے ہیں، ان کے چند آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا ہے، چند لوگوں کو ہمارے ہاں بھیجئے کہ اسلام کے احکام اور عقائد سکھائیں، آپؐ نے دس شخص ساتھ کر دیئے، جن کے سردار حضرت عاصم بن ثابتؓ تھے، یہ لوگ جب مقام رجیع پر پہنچے جو عسفان اور مکہ کے وسط میں ہے، تو ان غداروں نے بد عہدی کی، اور قبیلہ بنو لحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دیں، بنو لحیان دو سو ۲۰۰ آدمی لے کر جن میں ایک سو ۱۰۰ تیر انداز تھے، ان لوگوں کے تعاقب میں چلے، اور ان کے قریب آگئے، ان لوگوں نے بڑھ کر ایک ٹیکرے پر پناہ لی، تیر اندازوں نے ان سے کہا کہ "اتر آؤ ہم تم کو امن دیتے ہیں"۔ حضرت عاصمؓ نے کہا، میں کافر کی پناہ میں نہیں آتا"۔ یہ کہہ کر خدا سے خطاب کیا کہ "اپنے پیغمبر کو خبر پہنچا دے"۔ غرض وہ مع سات، آدمیوں کے لڑ کر تیر اندازوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ (قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ عاصم کے بدن سے گوشت کا ایک لوتھڑا کاٹ لائیں کہ ان کی شناخت ہو، قدرت خداوندی نے شہید مسلم کی یہ تحقیر گوارا نہ کی، شہد کی مکھیوں نے لاش پر پرا ڈال دیا، قریش ناکام پھر گئے) لیکن

---

(۱) (حضرت عمروؓ بن امیہ اور حضرت منذرؓ بن محمد عقبہ انصاری پیچھے تھے، جب یہ مقام حادثہ پر پہنچے تو حضرت منذرؓ کو شہید کر دیا گیا، اور حضرت عمروؓ بن امیہ کو قید کر لیا گیا، اور بعد کو وہ چھوڑ دیئے گئے زرقانی ج ۲ ص ۸۹) "س"

(۲) (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۳، زرقانی ج ۲ ص ۹۲)

(تین) ۳ شخصوں (۱) نے جن (میں سے دو) کے نام حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ (بن الدثنہ) تھے، کافروں کے وعدہ پر اعتماد کیا اور ٹیکرے سے اتر آئے۔ کافروں نے بدعہدی کر کے ان کی مشکیں کس لیں، اور مکہ میں لے جاکر بیچ ڈالا۔ حضرت خبیبؓ نے جنگ اُحد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا، اس لئے ان کو حارث کے لڑکوں نے خریدا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے (۲) چند روز انہی کے گھر میں رہے، ایک دن حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے، اتفاق سے ہاتھ میں چھری تھی (۳)، بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آگئی، دیکھا کہ حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے، کانپ اٹھی، حضرت خبیبؓ نے کہا "کیا تو یہ سمجھی کہ میں اس کو قتل کر دوں گا؟ ہمارا یہ کام نہیں" خاندانِ حارث ان کو حرم کے حدود سے باہر لے گیا، اور قتل کرنا چاہا، انہوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی، قاتلوں نے اجازت دی، انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا "دیر تک پڑھنے کو جی چاہتا تھا، لیکن تم کو خیال ہو گا کہ موت سے ڈرتا ہوں" پھر یہ اشعار پڑھے:

وما ان ابالی حین اقتل مسلما	جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں تو
علی ای شق کان للّٰہ مصرعی	مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو قتل کیا جاؤں گا
وذلک فی ذات الالٰہ وان یشاء	یہ جو کچھ ہے خالصاً خدا کے لئے ہے، اگر وہ چاہے گا تو
یبارک علی اوصال شلو ممزع	جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کرے گا

اسی زمانہ سے دستور ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول پہلے دو رکعت نماز ادا کر لیتا ہے (۴)، (اور یہ مستحب (۵) سمجھا جاتا ہے)۔

---

(۱) (بخاری (کتاب المغازی) نے اس موقع پر جن تیسرے بزرگ کا ذکر کیا ہے، ان کا نام نہیں لکھا ہے، ابن اسحاق نے ان کا نام حضرت عبداللہؓ بن طارق بتلایا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ اسی وقت اسی موقع پر شہید کر دیئے گئے، لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ یہاں سے آگے چل کر مکہ کے راستہ میں بہ مقام ظہران ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، زرقانی ج ۲ ص ۷۰) "س" (۲) (حارث کے بیٹے ابو سروعہ جنہوں نے حضرت خبیبؓ کو شہید کیا تھا، بعد کو مسلمان ہوئے، اور شرف صحابت سے سرفراز ہوئے، زرقانی ج ۲ ص ۷۰) "س" (۳) (صحیح بخاری میں استرہ لکھا ہے۔) "س"

(۴) طبری صفحہ ۱۴۳۵ و طبقات ابن سعد، اشعار اور اکثر جزئیات واقعہ صحیح بخاری غزوۃ الرجیع سے لئے گئے ہیں، نیز صحیح بخاری ھل یستاسر ومن لم یستاسر وصلی رکعتین عند القتل۔ (۵) اس نماز کے استحباب کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خبیبؓ کے اس فعل کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اس کو پسند فرمایا (شرح سیر کبیر سرخسی اول ص ۱۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس استحسان نے اس نماز کو استحباب کا درجہ عطا فرمایا، (الروض الانف ج ۲ ص ۱۷۱) محدثین کی اصطلاح میں اس صورت حال کو تقریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں، یعنی حضورؐ کے سامنے کوئی فعل کیا گیا ہو یا حضورؐ کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو، اور حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی ہو، مگر آپؐ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو تو اس سے بھی اس فعل کا مسنون و مستحب یا جائز ہونا سمجھا جائے گا) "س"

دوسرے صاحب حضرت زیدؓ تھے۔ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادہ سے خرید تھا۔ان کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے آئے۔جن میں ابو سفیان بھی تھا، جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابو سفیان نے کہا "سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل کئے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے"؟ بولے "خدا کی قسم میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے"۔ صفوان کے غلام نِسطاس (۱) نے ان کی گردن ماردی۔

ان لڑائیوں کا سلسلہ یہود کی لڑائیوں سے مل جاتا ہے۔اور چونکہ یہود کے واقعات اور ان کی سرگذشت تاریخ اسلام سے گوناگوں تعلقات رکھتی ہے۔اس لئے ہم ان کے واقعات مستقل حیثیت سے لکھتے ہیں۔اور اس غرض کے لئے کسی قدر ہم کو پچھلے زمانہ کی طرف واپس آنا پڑے گا۔

واقعات متفرقہ سنہ ۴ھ

اسی سال شعبان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔

اسی سال ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت زینبؓ بنت خزیمۃ نے انتقال فرمایا جن سے اسی سال نکاح بھی ہوا تھا۔

اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں۔اور فرمایا کہ مجھ کو یہود پر اطمینان نہیں۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت زیدؓ نے صرف پندرہ۱۵ دن میں عبرانی زبان سیکھ لی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں عبری زبان سے لوگ بہت کچھ آشنا تھے۔

اسی سال شوال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امِ سلمۃؓ سے نکاح فرمایا۔

اسی سال یہودیوں نے آپؐ کے سامنے ایک یہودی کا مقدمہ پیش کیا۔اور آپؐ نے توراۃ کے مطابق رجم کا حکم دیا۔(تفصیل ان واقعات کی دوسرے حصوں میں آئے گی)۔

بعض مورخوں کے نزدیک شراب کی حرمت کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا۔لیکن اس میں روایتیں نہایت مختلف ہیں۔پوری تحقیق احکامِ شرعیہ کے ذکر میں آئے گی۔

---

(۱) (نِسطاسؓ نے بعد کو اسلام قبول کیا۔زرقانی ج ۲ صفحہ ۸۴) س س۔

****

یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اور جنگ

سنہ ۲ھ و سنہ ۳ھ و سنہ ۴ھ

اوپر گذر چکا ہے کہ یہود مدت دراز سے مدینہ پر فرمانروا تھے، انصار نے آکر ان کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور رفتہ رفتہ حریفانہ اقتدار حاصل کیا، لیکن جنگ بعاث نے ان کی قومی طاقت توڑ دی اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ یہود سے ہم سری کا دعویٰ کر سکتے۔

یہود کے تین قبیلے تھے، قینقاع، نضیر، قریظہ، یہ سب مدینہ کے اطراف اور حوالی میں آباد تھے، اور عموماً زمیں دار، دولت مند، تجارت پیشہ اور صناع تھے، قینقاع زرگری کا پیشہ کرتے تھے، اور چونکہ سب میں زیادہ بہادر اور شجاع تھے اس لئے ہمیشہ ان کے پاس اسلحہ جنگ کے ذخیرے مہیا رہتے تھے، انصار عموماً ان کے مقروض اور زیر بار تھے، ملکی اور تجارتی افسری کے ساتھ ان لوگوں کا مذہبی اور علمی اثر بھی تھا، انصار عموماً بت پرست اور جاہل تھے، اس بنا پر وہ یہود کو عزت کی آنکھ سے دیکھتے، اور ان کو اپنے سے زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھتے تھے، جن لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے، وہ منت مانتے تھے کہ ہمارا بیٹا زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنادیں گے، چنانچہ مدینہ میں اس قسم کے بہت سے جدید الیہودیۃ موجود تھے (۱)۔

یہود میں امتداد زمانہ سے نہایت اخلاقِ ذمیمہ پیدا ہوگئے تھے، ان کے امتیازی خصائصِ زندگی یہ تھے کہ ہر طرف لین دین کا کاروبار پھیلا رکھا تھا، اور تمام آبادی ان کے قرضوں میں زیر بار تھی اور چونکہ تنہا وہی صاحبِ دولت تھے اس لئے نہایت بے رحمی سے سود کی بڑی شرحیں مقرر کرتے تھے، اور قرضہ کی کفالت میں لوگوں کے بال بچے یہاں تک کہ مستورات کو رہن رکھواتے تھے، کعب اشرف نے خود اپنے انصاری دوستوں سے یہی درخواست کی تھی (۲)، اور مختلف طریقوں سے لوگوں کے مال اور جائداد پر تصرف کرتے تھے۔

طماعی اور حرص کی شدت سے یہ حالت تھی کہ معصوم بچوں کو دو چار روپئے کے زیور کے لئے پتھر سے مار ڈالتے تھے - دولت کی بہتات سے زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا، اور

---

(۱) ابوداؤد (ج ۲ ص ۹) کتاب الجہاد باب الاسیر۔ (۲) بخاری و مسلم ذکر قتل کعب اشرف۔ (۳) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۱۶ (کتاب الدیات، باب اذا قتل بحجر أو بعصا" ن"

چونکہ زیادہ تر امراء اس کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے ان کو سزا نہیں دے سکتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے دریافت فرمایا کہ "کیا تمہاری شریعت میں زنا کی سزا صرف درّہ مارنا ہے؟" اس نے کہا نہیں بلکہ سنگسار کرنا ہے، لیکن ہمارے شرفا میں زنا کی کثرت ہو گئی، اور جب کوئی شریف اس جرم میں پکڑا جاتا تو ہم اس کو چھوڑ دیتے تھے، البتہ عام آدمیوں کو یہ سزا دیتے تھے، بالآخر یہ قرار پایا کہ سنگسار کرنے کی سزا درّہ سے بدل دی جائے تاکہ شریف اور رذیل سب کو یکساں سزا دی جاسکے (۱)۔

اسلام مدینہ میں آیا تو یہود کو نظر آیا کہ اب ان کا جابرانہ اور خود غرضانہ اقتدار قائم نہیں رہ سکتا، اسلام جس قدر روز بروز مدینہ میں پھیلتا جاتا تھا، اسی قدر یہودیوں کے مذہبی وقار کو جو ان کو مدتوں سے حاصل تھا، زوال ہوتا جاتا تھا، مدینہ کے مشرکین میں یہودیت جو تدریجاً پھیل رہی تھی دفعتاً رک گئی، نئے نئے فتوحات کی بدولت انصار جس قدر دولت مند ہوتے جاتے تھے، یہودیوں کے قرض کے شکنجوں سے آزاد ہوتے جاتے تھے، یہودیوں میں جو اخلاقِ بد عموماً پھیلے ہوئے تھے اور جن پر دولت مندی اور مذہبی پیشوائی نے پردہ ڈال رکھا تھا، اب ان کا راز فاش ہونے لگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ ان سے معاہدہ کیا تھا کہ ان کے جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا، اور ان کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی، لیکن منصبِ نبوت کی حیثیت سے ذمائمِ اخلاق پر وعظ اور تذکیر آپؐ کا فرضِ نبوت تھا، قرآن مجید میں ان کے اخلاق کی پردہ دری پر صاف صاف آیتیں نازل ہوتی تھیں:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ ۔ ۵ : ۴۲)	وہ جھوٹ باتوں کے سننے والے اور مالِ حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔
وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ ۔ ۵ : ۶۲)	اور تو ان میں سے اکثروں کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں۔
وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (نساء ۔ ۴ : ۱۶۱)	اور چونکہ یہ سود خوری کرتے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا، اور چونکہ یہ لوگوں کا مال خورد برد کر جاتے ہیں،

(۱) اسباب النزول، واحدی صفحہ ۱۴۳ مصر، (و صحیح مسلم (ص ۴۹) ذکر رجم الیہود) مس۔

ان اسباب نے تمام یہود میں اسلام کی طرف سے سخت ناراضی پھیلا دی۔ انہوں نے طرح طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں دینی اور اسلام کے خلاف کوششیں کرنی شروع کیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ ان کی ہر طرح کی ایذا رسانیوں کو برداشت کریں۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	اور اہلِ کتاب اور مشرکوں سے تم
مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا	بہت سی ایذا (کی باتیں) سنو گے،
أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَ	اور اگر صبر کئے رہو اور پرہیز گاری
تَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ○	پر قائم رہو تو یہ ہمت کے کام ہیں،
(آلِ عمران - ۳ : ۱۸۶)	

یہودیوں نے معمول کر لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سَلَامٌ عَلَيْكُمْ کرتے تو بجائے اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ کے اَلسَّامُ عَلَیْکَ کہتے تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ "تجھ کو موت آئے"۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں، انہوں نے سنا تو ان کو سخت غصہ آیا، اور بے اختیار ہو کر بول اٹھیں کہ "کمبختو! تم کو موت آئے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نرمی سے کام لو"، حضرت عائشہؓ نے کہا "آپؐ نے کچھ سنا بھی کہ ان لوگوں نے کیا کہا؟" آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں، لیکن یہ کافی ہے کہ میں نے علیک کہہ دیا (۱)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف مجاملت اور درگذر ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، اکثر معاشرت کی باتوں میں یہود کے ساتھ اتفاق فرماتے اور ان کی مذہبی توقیر قائم رکھنا چاہتے تھے، اہلِ عرب کی عادت تھی کہ بالوں میں مانگ نکالتے تھے، بخلاف اس کے یہودی بالوں کو یوں ہی چھوڑ دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہودیوں ہی کی موافقت کرتے تھے، صحیح بخاری میں ہے:

و كان يحب موافقه اهل الكتاب	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں میں جن
فيمالم يؤمر فيه بشيء، (بخاری کتاب	میں کوئی خاص حکمِ الٰہی نہیں ہوتا تھا، اہل کتاب کی
اللباس باب الفرق (ج ۲ ص ۸۷۷)	موافقت پسند فرماتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے، آپؐ نے بھی حکم دیا کہ لوگ عاشورہ کا روزہ رکھیں (۲)۔ کسی یہودی کا جنازہ

(۱) یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے۔ (۲) بخاری جلد ۱ ص ۵۶۲ باب اتیان الیہود النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین قدم المدینۃ " س "

گذرتا تو آپؐ تعظیماً کھڑے ہو جاتے (۱)۔

ایک دفعہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰ کی فضیلت اس طرح بیان کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہیں، اس پر ایک انصاری کو غصہ آگیا، انہوں نے اس کو تھپڑ مارا، یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، آپؐ نے فرمایا "مجھ کو اور پیغمبروں پر ایسی فضیلت نہ دو (جس سے ان کا نقص لازم آئے) قیامت کے دن لوگ بے ہوش ہو جائیں گے اور سب سے پہلے مجھ کو ہوش آئے گا، اس وقت میں دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں"۔ (۲)

احکامِ الٰہی جو قرآن مجید میں نازل ہو رہے تھے، سر تا پا اہلِ کتاب کے ساتھ مدارات اور معاشرت کی ترغیب میں تھے۔

وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ (مائدہ ۔ ۵: ۵۵)

اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔

عموماً ان کی قدر و منزلت کا خیال دلایا جاتا تھا۔

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ

(بقرہ ۔ ۲: ۴۷)

اے بنی اسرائیل، میری نعمتوں کا خیال کرو جو میں نے تم کو دیں اور یہ کہ میں نے تم کو تمام عالم پر فضیلت دی ہے۔

تبلیغ اسلام کی حیثیت سے جو کچھ اس وقت ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا صرف اس قدر تھا

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ●

(آلِ عمران ۔ ۳: ۶۴)

کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جس کو ہم تم دونوں یکساں مانتے ہیں، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں، اور ہم میں سے کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب نہ بنائے تو اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ اچھا تم گواہ ہو! ہم تو مسلمان ہیں۔

---

(۱) (بخاری جلد اصفحہ ۱۷۵) "س" کتاب الجنائز۔ (۲) بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۹۸ تفسیر سورۂ اعراف۔

ان باتوں میں سے ایک بھی ان کے معتقدات اور مزعومات کے خلاف نہ تھی۔ لیکن ان تمام مہربانیوں اور اظہارِ لطف و مدارات کا جو صلہ تھا یہ تھا کہ انھوں نے ہر طرح سے اسلام کی خانہ براندازی کا عزم کرلیا۔

اسلام کی عظمت اور وقار کم کرنے کے لئے مشرکوں سے کہتے تھے کہ مذہب میں مسلمانوں سے تو تم ہی اچھے ہو۔

وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰؤُلَآءِ	اور کافروں کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں
اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	سے یہ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔
(نسآء۔ ۴: ۵۱)	

مذہب اسلام کی بے اعتباری پھیلانے کے لئے یہاں تک آمادہ ہوئے کہ مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو جائیں، تاکہ لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا، تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اور اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ
اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مسلمانوں پر جو اترا ہے، اس پر صبح کو ایمان لاؤ
وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ	اور شام کو اس سے پھر جاؤ، شاید کہ وہ لوگ
يَرْجِعُوْنَ (آلِ عمران۔ ۳: ۷۲)	(مسلمان) بھی پھر جائیں۔

ان باتوں کے علاوہ اسلام کی بربادی کی ملکی تدبیریں اختیار کیں، وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو جو قوت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انصار کے دو قبیلے "اوس" اور "خزرج" جو باہم لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اسلام نے ان کو باہم متحد کر دیا ہے، ان دونوں کو اگر پھر لڑا دیا جائے تو اسلام خود بخود فنا ہو جائے گا، عرب میں پچھلی کینہ آوریوں کو تازہ کر دینا نہایت آسان کام تھا، ایک دفعہ دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی جلسہ میں بیٹھ کر بات چیت کر رہے تھے، چند یہودیوں نے اس صحبت میں جا کر جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑا، یہ وہ لڑائی تھی جس میں انصار کے یہ دونوں قبیلے آپس میں لڑے تھے، اور اسی لڑائی نے ان کی تمام قوت برباد کر دی تھی، اس لڑائی کے تذکرہ نے دونوں کو پرانے واقعے یاد دلائے، اور دفعتاً عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی، لعن و طعن سے گذر کر تلواریں کھنچ گئیں، حسنِ اتفاق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی، آپؐ نے فوراً

موقع پر پہنچ کر وعظ و پند سے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا، اس پر یہ آیت اتری (۱):

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا	مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے بعض لوگوں
فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	کا کہا مانو گے تو وہ تم کو ایمان لائے بعد پھر
یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ	کافر بنا دیں گے،

(آلِ عمران - ۳ : ۷۸)

منافقین کا ایک گروہ پہلے سے موجود تھا، جو اگرچہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، لیکن درحقیقت اسلام کا سخت دشمن تھا، اس گروہ کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا، یہودیوں نے اس کو نہایت آسانی سے درپردہ ملالیا، اور ان کے ساتھ مل کر سازش شروع کی، اتفاق یہ کہ عبداللہ بن ابی پہلے سے بھی بنی نضیر کا حلیف اور ہم پیمان تھا۔

قریش نے بدر سے پہلے عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا کہ مسلمانوں کو نکال دو، ورنہ ہم آکر تمہارا استیصال کر دیں گے، لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، تو بدر کے بعد انہوں نے یہود کو خط لکھا۔

انکم اھل الحلقة والحصون	تم لوگوں کے پاس اسلحۂ جنگ اور قلعہ جات ہیں، تم ہمارے
وانکم تقاتلن صاحبنا اولنفعلن	حریف (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑو ورنہ ہم تمہارے
کذا او کذا، ولا یحول بیننا وبین	ساتھ یہ یہ کریں گے اور یہ کوئی چیز ہم کو تمہاری عورتوں
خدم نسائکم شیئ (۲)	کے کڑوں تک پہنچنے سے نہ روک سکے گی،

ابوداؤد نے چونکہ بنو نضیر کے ذکر میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس لئے صرف بنو نضیر کا نام لیا ہے، ورنہ قریش کا خط عام یہود کے نام تھا، اور نتیجہ بھی عام تھا، اسی بنا پر محدث حاکم نے بنو نضیر اور قینقاع دونوں کے واقعہ کو ایک ہی واقعہ خیال کیا ہے، غرض اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو گھر سے نکلتے تھے، تو یہودیوں کی وجہ سے جان کا خطرہ رہتا تھا، حضرت طلحہؓ بن براء ایک صحابی تھے، (انہوں نے انتقال کے وقت) وصیت کی کہ اگر میں رات کے وقت مروں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ کرنا، اس لئے کہ یہود کی طرف سے ڈر ہے، ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپؐ پر حادثہ گذر جائے، چنانچہ حافظ ابن حجر نے

(۱) اصابہ فی احوال الصحابہ للحافظ ابن حجر العسقلانی، مطبوعہ مصر جلد ۱ ص ۸۸۔ (۲) سنن ابی داؤد ذکر نضیر (کتاب الخراج والامارہ) "س"

نے اصابہ میں ابوداؤد وغیرہ کی سند سے پورا واقعہ نقل کیا ہے (۱)۔

شوال سنہ ۲ ھ
غزوۂ بنی قینقاع

بدر کی فتح نے یہود کو زیادہ اندیشہ ناک کر دیا، ان کو علانیہ نظر آیا کہ اسلام اب ایک طاقت بنا جاتا ہے، اور چونکہ قبائلِ یہود میں سب سے زیادہ جری اور بہادر قینقاع (۲) تھے، اس لئے سب سے پہلے ان ہی نے اعلانِ جنگ کی جراءت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدہ کیا تھا، سب سے پہلے ان ہی نے اس کی عہد شکنی کی، ابن ہشام و طبری نے ابن اسحاق کی روایت سے عاصم بن قتادہ انصاری کی روایت نقل کی ہے۔

ان بنی قینقاع کانوا اول یھود نقضوا مابینھم وبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحاربوا فیما بین بدر و احد،	بنو قینقاع پہلے یہود تھے، جنھوں نے اس معاہدہ کو جو ان میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا، توڑ ڈالا، اور بدر اور احد کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی،

ابن سعد نے غزوۂ بنو قینقاع کے ذکر میں لکھا ہے۔

لما کانت وقعہ بدر اظھر و االبغی والحسد و نبذوا العھد و المدۃ	واقعہ بدر میں یہودیوں نے شورش اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ دیا۔

(زرقانی جلد ۱ ص ۵۲۹)

ایک اتفاقیہ سبب پیش آگیا، جس نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا، ایک انصاری (کی بیوی) مدینہ کے بازار میں ایک یہودی کی دکان میں (نقاب پوش آئیں) یہودیوں نے ان کی بے حرمتی کی، ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بے تاب ہو گیا، اور اس نے یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے مسلمان کو قتل کر دیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "خدا سے ڈرو، ایسا نہ ہو تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آئے"۔ بولے کہ "ہم قریش نہیں ہیں ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے"۔ چونکہ ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلانِ جنگ ہو گیا تھا، مجبور ہو کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لڑائی کی، وہ قلعہ بند ہوئے، پندرہ دن تک محاصرہ رہا بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کریں گے، ان کو منظور ہوگا، عبداللہ بن ابی

(۱) دیکھو اصابہ ترجمہ طلحہ بن براء۔ (۲) طبقات ابن سعد (ج ۲ قسم اول ص ۱۹) "س"

ان کا حلیف تھا، اس نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کی کہ وہ جلاوطن کر دیئے جائیں (۱)، غرض وہ اذرِعات میں جو شام کے علاقہ میں ہے، جلاوطن کر دیئے گئے، یہ سات سو شخص تھے، جن میں تین سو زرہ پوش تھے، یہ شوال سنہ ۲ھ کا واقعہ ہے۔

قتلِ کعب بن اشرف
ربیع الاول سنہ ۳ھ

یہودیوں میں کعب بن اشرف ایک مشہور شاعر تھا، اس کے باپ اشرف نے جو قبیلۂ طے سے تھا مدینہ میں بنو نضیر کا حلیف ہو کر اس قدر عزت اور اعتبار پیدا کیا کہ ابو رافع بن ابی الحقیق جو یہود کا مقتدا اور تاجر الحجاز جس کا خطاب (۲) تھا، اس کی لڑکی سے شادی کی، کعب (۳) اس کے بطن سے پیدا ہوا، اس دو طرفہ رشتہ داری کی بنا پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا، اور شاعری کی وجہ سے قوم پر اس کا عام اثر تھا، رفتہ رفتہ دولت مندی کی وجہ سے تمام یہودیانِ عرب کا رئیس بن گیا، یہودی علماء اور پیشوایانِ مذہب کی تنخواہیں مقرر کیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے اور علمائے یہود اس سے ماہواریں لینے آئے، تو اس نے ان لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق رائے دریافت کی، اور جب اپنا ہم خیال بنا لیا تب ان کے مقررہ روزینے جاری کئے (۴)۔

اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی، بدر کی لڑائی میں سردارانِ قریش مارے گئے تو اس کو نہایت صدمہ ہوا، تعزیت کے لئے مکہ گیا، کشتگانِ بدر کے پر درد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی، لوگوں کو جمع کر کے نہایت درد سے پڑھتا اور روتا اور رلاتا تھا، ابن ہشام نے ان واقعات کے ساتھ اشعار بھی نقل کئے ہیں، اگرچہ اس قسم کے اشعار اکثر مصنوعی ہیں، تاہم جہاں تک اس زمانہ کی زبان معلوم ہوتی ہے ہم ایک دو شعر نقل کرتے ہیں:

طحنت رحی بدر لمهلک اهله	جنگِ بدر کی چکی نے اہل بدر کو پیس ڈالا،
ولمثل بدر تستهل وتدمع	بدر جیسے واقعات کے لئے رونا پیٹنا چاہیئے۔
کم قد اصیب به من ابیض ماجد	کتنے شریف سپید و بارونق چہرے جن کے
ذی بهجة تأوی الیه الضیع	یہاں اہلِ حاجت پناہ لیتے تھے، مارے گئے۔

(۱) عام ارباب سیر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قتل کر دینا چاہتے تھے، عبداللہ بن ابی کے اصرار سے مجبور ہو گئے۔ لیکن سنن ابی داؤد میں جس طرح یہ واقعہ مذکور ہے، اس سے اس قیاس کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔
(۲) صحیح بخاری باب قتل النائم المشرک۔ (۳) الخمیس صفحہ ۴۶۳۔ (۴) زرقانی ج ۲ ص ۹ بہ حوالہ ابن اسحاق وغیرہ۔

مدینہ میں واپس آیا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہجو میں اشعار کہتا، اور لوگوں کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف برانگیختہ کرنا شروع کیا (۱)۔

عرب میں شاعری کا وہ اثر تھا، جو آج یورپ میں بڑے بڑے ملکی مدبروں کی پر جوش تقریروں اور نامور اخبارات کی تحریروں کا ہوتا ہے، تنہا ایک شاعر قبیلہ کے قبیلہ میں شعر کے اثر سے آگ لگا دیتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں چالیس آدمی لے کر گیا، وہاں ابوسفیان سے ملا اور اس کو بدر کے انتقام پر برانگیختہ کیا، اور ابوسفیان سب کو لے کر حرم میں آیا، سب نے حرم کا پردہ تھام کر معاہدہ کیا کہ بدر کا انتقام لیں گے (۲)۔

اس پر اکتفا نہ کر کے قصد کیا کہ چپکے سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرا دے، علامہ یعقوبی اپنی تاریخ میں بنو نضیر کے واقعہ میں لکھتے ہیں:

کعب بن الاشرف الیہودی الذی ارادان یمکر برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کعب بن اشرف یہودی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکے میں قتل کر دینا چاہا،

اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۳) (ذکر کعب اشرف) میں عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ کعب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت میں بلایا، اور لوگوں کو متعین کر دیا کہ جب آپؐ تشریف لائیں، تو دھوکے سے آپؐ کو ہلاک کر دیں، حافظ ابن حجر نے گو لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں ضعف ہے، لیکن جب قرائن اور دیگر شواہد موجود ہیں، تو یہ ضعف رفع ہو جاتا ہے۔

فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپؐ نے بعض صحابہ سے شکایت کی، اور آپؐ کی مرضی سے حضرت محمد بن مسلمہؓ نے بہ مشورہ رؤسائے (۴) اوس جا کر اس کو ربیع الاول سنہ ۳ھ میں قتل کر دیا، ارباب روایت نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے آپؐ کی خدمت میں یہ بھی عرض

(۱) ابوداؤد میں ہے "و کان کعب بن الاشرف یہجو النبی صلی اللہ علیہ وسلم، و یحرض علیہ کفار قریش (ابوداؤد جلد دوم باب کیف کان اخراج الیہود کتاب الخراج والامارہ)" س "ابن سعد میں ہے، کان رجلا شاعرا یہجو النبی واصحابہ ویحرض علیہ (تفسیر ابن جریر طبری ج ۵ ص ۹، میں ہے۔ ان کعب بن اشرف انطلق الی المشرکین من کفار قریش فاستجاشہم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، وامرھم ان یغزوہ)" س" (۲) خمیس صفحہ ۱، اد غالباً یہ وہی پہلا واقعہ ہے، ابن خمیس نے اس کے متعلق مزید تفصیل بیان کی ہے۔ (۳) (جلد ۷، ص ۲۵۹) "س"۔ (۴) ابن سعد مغازی ص ۲۱۔

کیا تھا کہ "ہم کو کچھ کہنے کی اجازت دی جائے" ارباب سیر نے اس کے معنی یہ لگائے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ باتیں کہنے کی اجازت مانگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی کیوں کہ " الحرب خدعة " یعنی لڑائی میں دھوکا دینا جائز ہے۔ لیکن بخاری کی روایت میں صرف یہ لفظ ہے:

فاذن لی ان اقول، ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم گفتگو کریں

اس سے غلط گوئی کی اجازت کہاں نکلتی ہے؟ (لیکن جو گفتگو ہوئی اس سے کعب اور عموماً یہود کے اخلاق اور دلی خیالات کا پتہ چلتا ہے، حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کہا "ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پناہ دے کر تمام عرب کو اپنا دشمن بنالیا اور ہم سے بار بار صدقہ مانگا جاتا ہے، اب تم ہی سے کچھ رکھ کر قرض لینا ہے"۔ کعب نے کہا "تم خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتا جاؤ گے، اچھا قرض کے لئے اپنی بیویوں کو رہن رکھو"۔ محمد بن مسلمہؓ نے کہا "تمہارے اس حسن و جمال کے سبب سے ہم کو اپنی بیویوں پر وفاداری کا یقین نہیں"۔ اس نے کہا "اچھا اپنے بچوں کو گرو رکھو"۔ انہوں نے کہا "اس سے تو تمام عرب میں ہماری بدنامی ہوگی ہم اپنے ہتھیار گرد رکھیں گے اور تم جانتے ہو آجکل ان کی جیسی ضرورت ہے" (۱)۔

صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں قتل کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ان لوگوں نے دوستانہ طریقہ سے اس کو گھر سے باہر بلایا، پھر بال سونگھنے کے بہانہ سے اس کی چوٹی پکڑلی، اور قتل کر ڈالا (۲)۔ لیکن روایت میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کی اجازت دی تھی، اس وقت تک عرب میں ان طریقوں سے قتل کرنا معیوب بات نہ تھی، آگے چل کر نہایت مفصل طور سے ایک مستقل عنوان میں یہ بحث آئے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح تدریج کے ساتھ عرب کے ان طریقوں کی اصلاح کی۔

غزوہ بنو نضیر
ربیع الاول سنہ ۴ھ

حضرت عمروؓ بن امیہ نے قبیلۂ عامر کے (جو) دو آدمی قتل کر دیئے تھے، اور جن کا خوں بہا اب تک واجب الادا تھا، اور جس کا ایک حصہ معاہدہ کے رو سے یہود بنی نضیر پر واجب الادا

---

(۱) (زرقانی جلد ۲ ص ۱۳ و صحیح بخاری قتل کعب بن اشرف) "س" (۲) صحیح بخاری باب قتل کعب (کتاب المغازی) "س"۔

تھا، اس کے مطالبہ (۱) کے لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے قبول کیا، لیکن درپردہ یہ سازش کی کہ ایک شخص چپکے سے بالاخانہ پر چڑھ کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر پتھر گرادے، اتفاق سے اس وقت آپؐ بالاخانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے تھے، عمرو بن جحاش ایک یہودی اس ارادہ سے کوٹھے پر چڑھا، آپؐ کو اس کے ارادہ کا حال معلوم ہو گیا، اور آپؐ فوراً مدینہ واپس چلے آئے (۲)۔

اوپر گذر چکا ہے کہ قریش نے بنو نضیر کو کہلا بھیجا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کردو، ورنہ ہم خود آکر تمہارا بھی استیصال کر دیں گے، بنو نضیر پہلے سے اسلام کے دشمن تھے، قریش کے پیغام نے ان کو اور زیادہ آمادہ کیا، بنو نضیر نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؐ تینؔ آدمیوں کو لے کر آئیں، ہم بھی اپنے احبار لے کر آئیں گے، آپؐ کا کلام سن کر اگر ہمارے احبار آپؐ کی تصدیق کریں گے تو ہم کو بھی کچھ عذر نہ ہو گا، چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے، آپؐ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے، آپؐ یہودِ بنی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے، اور ان سے تجدیدِ معاہدہ کی درخواست کی، انہوں نے تعمیل کی، بنو نضیر کے لئے یہ نظیر موجود تھی کہ ان کے برادرانِ دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے، لیکن وہ کسی طرح معاہدہ کرنے پر راضی نہ ہوئے (۳)، بالآخر انہوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپؐ تینؔ آدمی لے کر آئیں، ہم بھی تینؔ عالم ساتھ لے کر آتے ہیں، یہ علماء اگر آپؐ پر ایمان لائیں گے، تو ہم بھی لائیں گے، آپؐ نے منظور فرمایا، لیکن راہ میں آپؐ کو ایک صحیح ذریعہ سے

[(۱) بنی نضیر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے متعلق جو گفتگو فرمائی اس کی دوؔ تشریحیں کی گئی ہیں، ایک تشریح تو وہ ہے جس کو مصنف نے اختیار فرمایا ہے، دوسری تشریح یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنی نضیر سے جو گفتگو فرمائی تھی، اس کا ماحصل یہ ہے کہ قبیلۂ عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے، اور ان کے یہاں دیت کا دستور کیا ہے، بنی نضیر اور قبیلۂ عامر کے باہم تعلقات اچھے تھے اس لئے ان سے اس مسئلہ میں گفتگو قرین قیاس بھی ہے۔] (سیرۃ حلبیہ ج ۲ ص ۲۷۰) "س"

(۲) یہ روایت ابن ہشام وغیرہ میں مذکور ہے، زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے جو صحیح ترین مغازی ہے یہ عبارت نقل کی ہے، وکانوا قد دسّوا الی قریش فی قتاله صلی اللّٰه علیه وسلم، فحضوهم علی القتال ودلوهم علی العورة (زرقانی ص ۹۳ ج ۲) یعنی ان لوگوں نے قریش سے درپردہ سازش کر کے ان کو آمادۂ جنگ کیا، اور ان کو مخفی موقع بتائے۔ (۳) یہ تمام تفصیل سنن ابی داؤد (خبر النضیر کتاب الخراج والامارہ "س") میں ہے، تعجب ہے کہ اربابِ سیرت ابوداؤد کی اس روایت سے بالکل بے خبر ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ جب آپؐ تشریف لائیں تو آپؐ کو قتل کر دیں۔(۱)

بنو نضیر کی سرکشی کے مختلف اسباب تھے، وہ نہایت مضبوط قلعوں میں پناہ گزیں تھے، جن کا فتح کرنا آسان نہ تھا، اس کے ساتھ عبداللہ بن ابی نے کہلا بھیجا تھا کہ "تم اطاعت نہ کرنا، بنو قریظہ تمہارا ساتھ دیں گے اور میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کو آؤں گا" قرآن مجید میں ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ

تم نے دیکھا، منافق اپنے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ تم نکلو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے، اور ہم تمہارے باب میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے، اگر تم سے کوئی لڑا تو ہم بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔

(حشر۔۵۹: ۱۱)

لیکن بنو نضیر کے تمام خیالات غلط نکلے، بنو قریظہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا، اور منافق علانیہ اسلام کے مقابلہ میں آ نہیں سکتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ۱۵ دن تک ان کا محاصرہ کیا، قلعہ کے گرد جو ان کے نخلستان تھے، ان کے چند درخت کٹوا دیئے، سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ سب نخلستان نہیں کاٹا گیا، بلکہ صرف لینۃ جو ایک خاص قسم کی کھجور ہے، اور عرب کی عام خوراک نہیں ہے اس کے درخت کٹوا دیئے گئے تھے، قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ○ (حشر۔۵۹: ۵)

تم نے لینۃ کے جو درخت کٹوائے اور جس قدر قائم رہنے دیئے سب خدا کے حکم سے تھا، تاکہ خدا فاسقوں کو رسوا کرے۔

(۱) فتح الباری واقعۂ غزوۂ بنو نضیر جلد ۷ صفحہ ۲۵۵ فتح الباری میں یہ روایت ابن مردویہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی عیاری کا ارادہ کیا تھا بخاری میں ترجمۃ الباب یہ ہے باب حدیث بنی النضیر و مخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیہم فی دیۃ الرجلین وما ارادوا من الغدر برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ممکن ہے کہ درختوں کے جھنڈ سے کمین گاہ کا کام لیا جاتا ہو، اس لئے وہ صاف کرا دیئے گئے کہ محاصرہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو (۱)۔

بالآخر بنو نضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال و اسباب اونٹوں پر لے جا سکیں لے جائیں، اور مدینہ سے باہر نکل جائیں، چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے، ان میں سے معززرؤسا مثلاً سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع، حیی بن اخطب خیبر چلے گئے، وہاں لوگوں نے ان کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا (۲)، اس واقعہ کو اس غرض سے یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ غزوۂ خیبر کی داستان کا دیباچہ ہے۔

بنو نضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے، لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں، عروہ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا، وہ بھی ساتھ ساتھ تھی، اہلِ مدینہ کا بیان ہے کہ اس سروسامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گذری تھی (۳)، ہتھیاروں کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا، اس میں پچاس زرہیں، پچاس خُود، اور تین سو چالیس تلواریں تھیں، ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا، اور یہودی ان کو اتحاد مذہب کی وجہ سے ساتھ لئے جاتے تھے، انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری:

لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (البقرہ - ۲: ۲۵۶) یعنی مذہب میں زبردستی نہیں ہے

ابو داؤد نے کتاب الجهاد "باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام" کے عنوان کے نیچے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

(۱) (مصنف کے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک درخت وغیرہ میدان جنگ میں اسی وقت کاٹے جاتے ہیں جب کہ کاٹے بغیر چارہ کار نہ ہو، محدثین نے امام احمد کا یہ قول اسی واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے، نیز اس موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ اسحاق کا قول ہے کہ اگر دشمن درختوں (کی آڑ) میں ہو تو ان میں آگ لگا دینا سنت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان ائمہ کے نزدیک اس موقع پر درخت کا کاٹنا جنگی ضرورت کا اقتضا تھا، عمدۃ القاری جلد ۸ ص ۱۹۱) "س"۔ (۲) طبری صفحہ ۱۴۵۲۔ (۳) یہ تفصیل طبری میں ہے (ص ۱۴۵۲) "س"

☆☆☆☆☆☆☆

سنہ ۵ ھ

غزوۂ مریسیع، واقعۂ افک و غزوۂ احزاب

قریش اور یہود کی متفقہ سازش نے اب مکہ سے لے کر مدینہ تک آگ لگادی، جس قدر قبائل تھے سب نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، سب سے پہلے انمار اور ثعلبہ نے یہ ارادہ کیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی، ۱۰/ محرم سنہ ۵ ھ کو آپ مدینہ سے چار سو صحابہ کو لے کر نکلے، اور ذات الرقاع تک تشریف لے گئے، لیکن آپ کی آمد سن کر وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے (۱)۔

ربیع الاول سنہ ۵ ھ میں یہ خبر آئی کہ دومۃ الجندل میں کفار کی ایک عظیم الشان فوج جمع ہو رہی ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ سے نکلے، ان کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ گئے۔

غزوہ مریسیع (۲) یا بنی مصطلق

شعبان سنہ ۵ ھ

خزاعۃ ایک قبیلہ تھا جو قریش کا حلیف اور ہم عہد تھا، قریش کو ایک زمانہ میں یہ خیال آیا کہ ہم ابراہیم کی نسل سے ہیں، اس لئے ہم کو اوروں سے ہر باب میں ممتاز ہونا چاہیے، حج کا ایک بڑا رکن عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے، لیکن چونکہ یہ میدان حرم کی حدود سے باہر ہے، قریش نے یہ قاعدہ قرار دیا کہ لوگ عرفات جائیں، لیکن ہم کو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں ٹھہرنا چاہیے، جو حدود حرم کے اندر ہے، اسی قسم کی اور امتیازی باتیں قائم کیں، ان خصائص کی بنا پر اپنا لقب احمس رکھا، لیکن اس قدر فیاضی کی کہ جو لوگ ان پابندیوں کو قبول کر لیتے تھے، ان کو بھی یہ لقب دے دیتے، اور ان سے رشتہ ناتہ کرتے تھے، قبیلہ خزاعہ (۳) کو بھی یہ

---

(۱) ابن سعد غزوۂ ذات الرقاع ص ۴۳ (صحیح بخاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع خندق کے بعد واقع ہوا، صلوٰۃ الخوف سب سے پہلے اسی غزوہ میں ادا کی گئی)۔ (۲) (ابن اسحاق نے جس کی پیروی طبری اور ابن ہشام نے کی ہے اس غزوہ کو سنہ ۶ ھ میں ذکر کیا ہے، موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ سنہ ۵ ھ میں واقع ہوا، امام بخاری نے بھی صحیح میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے، لیکن غلطی سے سنہ ۵ کے بجائے ابن عقبہ کی طرف سنہ ۴ ھ کی نسبت کی ہے، علامہ ابن حجر نے فتح الباری (جلد، ص ۳۳۲) میں بیہقی، حاکم، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کی روایتوں سے سنہ ۵ ھ کو ترجیح دی ہے، ابن سعد نے بھی سنہ ۵ ھ ہی لکھا ہے، تفصیل کے لئے دیکھو فتح الباری)۔ (۳) یہ واقعات ابن ہشام نے تفصیل سے لکھے ہیں، (ص ۶۷، جلد اول)

شرف عطا کیا تھا۔

خزاعہ کا ایک خاندان بنو المصطلق کہلاتا تھا، وہ مقام مریسیع میں جو مدینہ منورہ سے ۹/منزل ہے، آباد تھا، اس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا، اس نے قریش کے اشارہ سے یا خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو مزید تحقیقات کے لئے حضرت زیدؓ بن خصیب کو بھیجا، انہوں نے واپس آکر خبر کی تصدیق کی، آپ نے صحابہؓ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲/شعبان کو فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں، مریسیع میں خبر پہنچی تو حارث کی جمعیت منتشر ہو گئی، اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا، لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے، انہوں نے صف آرائی کی، اور دیر تک جم کر تیر برساتے رہے، مسلمانوں نے دفعتاً ایک ساتھ حملہ کیا تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے (دس ۱۰ آدمی مارے گئے، اور باقی گرفتار ہو گئے، جن کی تعداد تقریباً چھ سو ۶۰۰ تھی، غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں)۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے صحیح بخاری (۱) اور صحیح مسلم (۲) میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے، اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے، ابن سعد (۳) نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے، لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، اس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصولِ حدیث کے رو سے قابلِ حجت نہیں کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے، اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف، نافع نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی نہ تھا، اس لئے یہ روایت اصطلاح محدثین میں منقطع ہے (۴)۔

یہ لڑائی ایک معمولی لڑائی تھی، لیکن اتفاق سے بعض شہرت پذیر واقعات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے اس لڑائی کا خاص عنوان قائم کیا جاتا ہے، اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی فوج میں داخل ہو گئے تھے، یہ بدباطن ہر موقع

(۱) باب العتق۔ (۲) کتاب الجہاد والسیر۔ (۳) طبقات ابن سعد جلد مغازی ص ۳۵ و ۳۶۔ (۴) (معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغازِ سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے، ورنہ متنِ حدیث کے بعد تصریح ہے کہ حدثنی ھذا الحدیث عبداللہ بن عمر و کان فی ذلک الجیش یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہؓ بن عمر سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے، (مسلم کتاب الجہاد و بخاری کتاب العتق) اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں باقی رہتی ہے)۔ (س)

پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے، ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا، انصاری نے عرب کے قدیم طریقہ پر یاللانصار کا نعرہ مارا، (انصار کی جے) مہاجر کے بھی یا معاشر المہاجرین کے نعرہ سے جواب دیا، نعرے سن کر قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا، عبداللہ بن ابی جو۔۔۔۔۔ رئیس المنافقین تھا، اس کو موقع ہاتھ آیا، انصار سے مخاطب ہو کر کہا "تم نے یہ بلا خود مول لی مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں، اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے، تم دست گیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے"۔

یہ واقعہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا، حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، غصہ سے بے تاب ہو گئے، اور عرض کی کہ کسی کو ارشاد ہو اس منافق کی گردن اڑا دے، آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چرچا پسند کرتے ہو کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں (۱)۔

یہ عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن ابی جس درجہ کا منافق اور دشمنِ اسلام تھا، اس کے صاحبزادے کہ ان کا نام بھی عبداللہ تھا، اسی قدر اسلام کے جاں نثار تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپؐ عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، یہ سن کر وہ خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گذار ہوں، لیکن اگر یہ مرضی ہے تو مجھ ہی کو حکم ہو، میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ آپؐ کسی اور کو حکم دیں اور میں غیرت و محبت کے جوش میں آکر قاتل کو قتل کر دوں"۔ آپؐ نے اطمینان دلایا کہ قتل کی بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا (۲)، یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ جب وہ مرا تو کفن کے لئے آپؐ نے خود پیراہن مبارک عنایت فرمایا، جنازہ کی نماز پڑھائی، حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا کہ منافق کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں لیکن دریائے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا۔

حضرت جویریہؓ کا واقعہ

لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہوئے، ان میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جو حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں، ابن اسحاق کی

(۱) دیکھو صحیح بخاری ص ۷۲۸۔ (۲) یہ تمام واقعات نہایت تفصیل سے ابن سعد اور طبری نے لکھے ہیں، اور صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں بھی مذکور ہیں۔

روایت ہے، جو بعض حدیث کی کتابوں میں بھی ہے کہ تمام اسیرانِ جنگ لونڈی غلام بنا کر تقسیم کر دیئے گئے، حضرت جویریہؓ حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصہ میں آئیں، انہوں نے حضرت ثابتؓ سے درخواست کی کہ "مکاتبت کر لو، یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو"۔ حضرت ثابتؓ نے منظور کیا، حضرت جویریہؓ کے پاس روپیہ نہ تھا، چاہا کہ لوگوں سے چندہ مانگ کر یہ رقم ادا کردیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی آئیں، حضرت عائشہؓ بھی وہاں موجود تھیں۔

ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ کی زبانی روایت کی ہے، جو یقیناً ان کی ذاتی رائے ہے کہ چونکہ حضرت جویریہؓ نہایت شیریں ادا تھیں، میں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے دیکھا تو سمجھی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی ان کے حسن و جمال کا وہی اثر ہوگا جو مجھ پر ہوا، غرض وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں۔ (آپؐ نے فرمایا اگر اس سے بہتر برتاؤ تمہارے ساتھ کیا جائے تو قبول کرو گی، انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "تمہاری طرف سے میں روپیہ ادا کردوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں"، حضرت جویریہؓ نے کہا "میں نے منظور (۱) کیا") آپؐ نے تنہا وہ رقم ادا کردی اور ان سے شادی کرلی۔

یہ ابن اسحاق کی روایت ہے، جو ابن ہشام اور ابو داؤد، دونوں میں موجود ہے لیکن دوسرے طریقِ روایت میں اس سے زیادہ واضح بیان مذکور ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہؓ کا باپ (حارث) رئیسِ عرب تھا، حضرت جویریہؓ جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اور کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی، میری شان اس سے بالاتر ہے، آپؐ اس کو آزاد کردیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خود جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے، حارث نے جاکر جویریہؓ سے کہا کہ محمدؐ نے تیری مرضی پر رکھا، دیکھنا مجھ کو رسوا نہ کرنا، انہوں نے کہا "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں"۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کرلی۔

یہ روایت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں، ابن مندہ (۲) سے نقل کر کے لکھا ہے کہ "اس کی سند صحیح ہے"۔ ابن سعد میں بھی یہ روایت مذکور ہے، ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت بھی کی

---

(۱) ابو داؤد کتاب العتاق۔ (۲) یہ ابو قلابہ کی مرسل روایت ہے، ابن مندہ کی روایت دوسرے مفہوم کی اس سے قبل متصلاً مذکور ہے غالباً مصنف کو اشتباہ اسی لئے ہوا۔ (ض)

ہے کہ حضرت جویریہؓ کے والد نے ان کا زرِ فدیہ ادا کیا، اور جب وہ آزاد ہو گئیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا۔

اس نکاح کا اثر

حضرت جویریہؓ سے جب آپؐ نے نکاح کیا تو تمام اسیرانِ جنگ جو اہلِ فوج کے حصہ میں آگئے تھے، دفعتاً رہا کر دیئے گئے، فوج نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کر لی وہ غلام نہیں ہو سکتا (۱)۔

واقعۂ افک

واقعۂ افک یعنی حضرت عائشہؓ پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی، وہ اسی لڑائی سے واپسی میں پیش آیا تھا، احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے، لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ "بالکل افترا ہے"۔ اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

البتہ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ محض جھوٹ اور بیہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے، یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی، لیکن بعض مسلمان بھی دھوکے میں آگئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

آج کل کے عیسائی مورخوں نے بھی قدیم منافقوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوشِ مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آگئی ہے، لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔

یہ تمام لڑائیاں اُس عام جنگ کا پیش خیمہ تھیں جو تمام عرب اور یہود متفقہ قوت سے کرنا چاہتے تھے، اور جس کو جنگِ احزاب کہتے ہیں۔

غزوہ احزاب یعنی تمام عرب کی متحدہ جنگ ذوقعدہ ۵ھ

بنو نضیر (۲) مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے تو انہوں نے ایک نہایت عظیم الشان سازش شروع کی، ان کے روسا میں

---

(۱) سنن ابی داؤد کتاب العتق (باب فی بیع المکاتب اذا فسخت المکاتبۃ) "س"۔ (۲) طبری میں ہے کان الذی جر غزوۃ رسول اللہ الخندق فیما قیل ما کان من اجلاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی النضیر عن دیارھم (ج ۳ ص ۱۴۶۳) مغازی کی سب سے زیادہ معتبر کتاب مغازی موسیٰ بن عقبہ ہے حافظ ابن حجر نے فتح الباری (ج ۷ ص ۳۰۱) غزوۂ احزاب کے ذکر میں اس کی یہ عبارت نقل کی ہے، خرج حی بن اخطب بعد قتل بنی النضیر الی مکۃ یحرض قریشا علی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخرج کنانۃ بن الربیع بن ابی الحقیق یسعی فی بنی غطفان ویحضھم علی قتال (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۱ پر)

سے سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظمہ گئے، اور قریش سے مل کر کہا "اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کر دیا جاسکتا ہے"۔ قریش اس کے لئے ہمیشہ تیار تھے، قریش کو آمادہ کر کے یہ لوگ قبیلۂ غطفان کے پاس گئے، اور ان کو لالچ دیا کہ خیبر کا نصف محاصل ان کو ہمیشہ دیا کریں گے، (اور یہ پہلے سے بھی تیار تھے، قصۂ غزوۂ معونہ میں یاد ہو گا کہ عامر رئیسِ قبیلہ نے اسی غطفان کے حملہ کی دھمکی دی تھی (۱)، اس لئے یہ فوراً تیار ہو گئے) بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، غطفان نے ان کو لکھ بھیجا کہ تم بھی فوجیں لے کر آؤ، قبیلۂ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی، اس تعلق سے انہوں نے بھی ساتھ دیا، بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا، اس بنا پر یہود نے ان کو بھی آمادہ کیا، غرض تمام قبائلِ عرب سے لشکرِ گراں تیار ہو کر مدینہ کی طرف بڑھا، فتح الباری میں تصریح ہے کہ ان کی تعداد (دس ہزار) تھی (۲)۔

یہ لشکر تین مستقل فوجوں (۳) میں تقسیم (تھا) غطفان کی فوجیں (۴) عینیہ بن حصن فزاری کی کمان میں تھیں، جو عرب کا مشہور سردار تھا، بنو اسد طلیحہ کی افسری میں تھے، اور ابو سفیان (بن حرب) سپہ سالارِ کل تھا (۵)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبریں سنیں تو صحابہؓ سے مشورہ کیا، حضرت سلمان فارسیؓ ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقہ سے واقف تھے، انہوں نے رائے دی کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہیں، ایک محفوظ مقام میں لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے، خندق دراصل فارسی کندہ کا معرب ہے، جس کے معنی کھودے گئے کے ہیں، کاف، خ، سے اور ہائے ہوز قاف سے بدل گئی ہے، جس طرح پیادہ سے بیدق ہو گیا ہے۔

تمام لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کئے گئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان لھم نصف تمر خیبر فاجابہ عیینۃ بن حصن بن حذیفۃ ابن بدر الفزاری الی ذلک و کتبوا الی حلفائھم من بنی اسد فاقبل الیھم طلحۃ ابن خویلد فیمن اطاعہ، الخ۔

(۱) صحیح بخاری غزوۃ الرجیع۔ (۲) (طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اوّل صفحہ ۴۷ و فتح الباری جلد، صفحہ ۳۰۱) "س" (۳) (طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم اوّل صفحہ ۴۷) "س"۔ (۴) (افسروں کی یہ تفصیل پورے لشکر کی نہیں ہے بلکہ مصنف نے صرف مشہور قبائل کے فوجی افسروں کا تذکرہ کر دیا ہے، اس سلسلہ میں مورخین نے دوسرے قبائل کے فوجی افسروں کے نام بھی بتائے ہیں چنانچہ بنو سلیم سفیان بن عبد شمس کی افسری میں تھے، قبیلۂ اشجع کا سردار مسعود بن رُخیلہ تھا، بنو مرہ حارث بن عوف کے ماتحت تھے، حارث اور طلیحہ بعد کو مسلمان ہو گئے تھے، زرقانی ج ۲ صفحہ ۱۲۱، طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم اوّل ص ۴۷) "س"

(۵) (طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم اوّل صفحہ ۴۷) "س"

مدینہ میں تین[۳] جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا، جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا، صرف شامی رخ کھلا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام میں خندق کی تیاریاں شروع کیں، یہ ذوقعدہ سنہ ۵ کی ۸/ تاریخ تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود خود قائم کئے، داغ بیل ڈال کر دس[۱۰] دس[۱۰] آدمیوں پر دس[۱۰] دس[۱۰] گز زمین تقسیم کی، خندق کا عمق پانچ گز رکھا گیا، بیس دن میں تین ہزار متبرک ہاتھوں سے انجام پائی۔

یاد ہوگا کہ جب مسجد نبویؐ بن رہی تھی تو سرورِ دوجہاںؐ مزدوروں کی صورت میں تھے، آج بھی وہی عبرت انگیز منظر ہے، جاڑے کی راتیں ہیں، تین تین دن کا فاقہ ہے، مہاجرین اور انصار اپنی پیٹھوں پر مٹی لاد لاد کر پھینکتے ہیں اور جوشِ محبت میں ہم آواز ہو کر کہتے ہیں:

نحن الذی بایعوا محمدا ۔۔۔ علی الجهاد ما بقینا ابدا

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مٹی پھینک رہے ہیں، شکم مبارک پر گرد اٹ گئی ہے، اسی حالت میں یہ رجز زبان پر ہے:

واللہ لولا اللہ ما اهتدینا ۔۔۔ ولا تصدقنا ولا صلینا

فانزلن سکینة علینا ۔۔۔ وثبت الاقدام ان لاقینا

ان الألى قد بغوا علینا ۔۔۔ اذا ارادوا فتنة ابینا

ابینا کا لفظ جب آتا تھا تو آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی، اور مکرر کہتے تھے (۱)، اس کے ساتھ انصار کے حق میں دعا بھی دیتے جاتے تھے، اور یہ موزوں الفاظ زبان پر آتے تھے:

اللهم انه لاخیر الاخیر الآخرة ۔۔۔ فبارک فی الانصار والمهاجرة

پتھر کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک سخت چٹان آ گئی، کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، تین دن کا فاقہ تھا، اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا، آپ نے دستِ مبارک سے پھاوڑا مارا، تو چٹان ایک تودۂ خاک تھی (۲)۔

سلع کی پہاڑی کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی گئی، مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں اور چونکہ بنو قریظہ کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے حضرت سلمہؓ بن اسلم دو سو[۲۰۰]

(۱) صحیح بخاری غزوۂ احزاب۔ (۲) ایضاً۔

آدمیوں کے ساتھ متعین کیے گئے کہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے۔

بنو قریظہ کے یہود اب تک الگ تھے، لیکن بنو نضیر نے ان کے ملا لینے کی کوشش کی، حیئ بن اخطب (حضرت صفیہؓ کا باپ) خود قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا، اس نے ملنے سے انکار کیا، حیئ نے کہا "میں فوجوں کا دریائے بیکراں لایا ہوں، قریش اور تمام عرب امنڈ آیا ہے، اور ایک محمدؐ کے خون کا پیاسا ہے، یہ موقع ہاتھ سے دینے کے قابل نہیں، اب اسلام کا خاتمہ ہے"۔ کعب اب بھی راضی نہ تھا، اس نے کہا میں نے محمدؐ کو ہمیشہ صادق الوعد پایا، ان سے عہد شکنی کرنا خلاف مروت ہے، لیکن حیئ کا جادو رائگاں نہیں جا سکتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال معلوم ہوا تو تحقیق اور اتمام حجت کے لئے سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو بھیجا اور فرمادیا کہ اگر درحقیقت بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو وہاں سے آکر اس خبر کو مبہم لفظوں میں بیان کرنا کہ لوگوں میں بے دلی نہ پھیلنے پائے، دونوں صاحبوں نے بنو قریظہ کو معاہدہ یاد دلایا تو انہوں نے کہا "ہم نہیں جانتے محمدؐ کون ہیں اور معاہدہ کیا چیز ہے"۔

غرض بنو قریظہ نے اس بے شمار فوج میں اور اضافہ کر دیا، قریش، یہود، اور قبائل عرب کی دس ہزار فوجیں تین۳ حصوں میں تقسیم ہو کر مدینہ کے تین۳ طرف اس زور شور سے حملہ آور ہوئیں کہ مدینہ کی زمین دہل گئی۔

اس معرکہ کی تصویر خود اللہ تعالیٰ نے کھینچی ہے:

اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا هُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا	جب کہ دشمن اوپر کی طرف اور نشیب کی طرف سے آپڑے اور جب آنکھیں ڈگنے لگیں، اور کلیجے منھ میں آگئے، اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آگیا، اور وہ بڑے زور کے زلزلے میں ڈال دیے گئے۔

(احزاب۔ ۳۳: ۱۰تا۱۱)

فوج اسلام میں منافقوں کی تعداد بھی شامل تھی جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے، لیکن موسم کی سختی، رسد کی قلت، متواتر فاقے، راتوں کی بے خوابی، بے شمار فوجوں کا ہجوم، ایسے واقعات

تھے، جنھوں نے ان کا پردہ فاش کر دیا، آ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں، ہم کو شہر میں واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے۔

يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا (احزاب۔ ۳۳:۱۳)

کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں، اور وہ کھلے نہیں، بلکہ ان کو بھاگنا مقصود ہے۔

لیکن جاں نثاران اسلام کا طلائے اخلاص اسی کسوٹی پر آزمانے کے قابل تھا۔

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا (احزاب۔ ۳۳:۲۲)

جب مسلمانوں نے قبائل کی فوجیں دیکھیں تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ خدا نے اور اس کے رسولؐ نے کیا تھا، اور خدا اور اس کا رسولؐ دونوں سچے تھے، اور اس بات نے ان کے یقین اور اطاعت کو اور بھی بڑھا دیا۔

قریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ پر تین تین فاقے گذر گئے، ایک دن صحابہؓ نے بے تاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں۔ لیکن جب آپؐ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے (۱)۔ محاصرہ اس قدر شدید اور پُرخطر ہو گیا تھا، کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ کوئی ہے جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے؟ تین دفعہ آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے، لیکن حضرت زبیرؓ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب (۲) دیا۔

محاصرین نے ادھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا، ادھر دوسری سمت اس غرض سے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے اہل و عیال یہیں قلعوں میں پناہ گزیں تھے۔

---

(۱) شمائل ترمذی، عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک میں پتھر باندھتے تھے، جس سے کمر نہیں جھکنے پاتی تھی۔ (۲) صحیح بخاری ذکر غزوہ احزاب (و صحیح مسلم کتاب الفضائل، لیکن ابن ہشام میں اس موقع پر حضرت حذیفہؓ ابن یمان کا نام ہے، اس لئے محدثین میں ان دونوں ناموں کے واقعوں کی تطبیق میں اختلاف ہے، حافظ ابن حجر اور زرقانی نے بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ محاصرین میں سے قریش کی تحقیق حال کے لئے حضرت حذیفہؓ اور بنو قریظہ کی تحقیق خبر کے لئے حضرت زبیرؓ گئے تھے، یہ تفصیل واقدی اور نسائی نے اپنی روایتوں میں کی ہے فتح الباری ج، ص ۳۱۲، زرقانی جلد ۲ ص ۱۳۸۔) "س"

محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، اس لئے دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے مختلف حصوں پر فوجیں تقسیم کر دی تھیں جو محاصرین کے حملوں کا مقابلہ کرتی تھیں، ایک حصہ خود آپؐ کے اہتمام میں تھا۔

محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپؐ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو انصار ہمت ہار جائیں، اس لئے آپؐ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا، کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دے دیا جائے، حضرت سعدؓ بن عبادۃ، اور حضرت سعدؓ بن معاذ کو جو رؤسائے انصار تھے بلا کر مشورہ کیا، دونوں نے عرض کی کہ اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں، لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرأت نہ کر سکا، اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے، یہ استقلال دیکھ کر آپؐ کو اطمینان ہوا، حضرت سعدؓ نے معاہدہ کا کاغذ ہاتھ میں لے کر تمام عبارت مٹادی (۱) اور کہا ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں۔

اب مشرکوں کی طرف سے حملہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل یعنی ابو سفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب، جبیرہ کا ایک ایک دن مقرر ہوا، ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج کو لے کر لڑتا تھا، خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، لیکن خندق کا عرض چونکہ زیادہ نہ تھا اس لئے باہر سے پتھر اور تیر برساتے تھے۔

چونکہ اس طریقہ میں کامیابی نہیں ہوئی، اس لئے قرار پایا کہ اب عام حملہ کیا جائے، تمام فوجیں یکجا ہوئیں، قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے، خندق ایک جگہ سے اتفاقاً کم عریض تھی، یہ موقعہ حملہ کے لئے انتخاب کیا گیا، عرب کے مشہور بہادروں یعنی ضرار، جبیرہ، نوفل، عمرو بن عبدوُد نے خندق کے اس کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا تو اس پار تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدوُد تھا، وہ ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا، جنگ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا، اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا بالوں میں تیل نہ ڈالوں گا، اس وقت اس کی عمر ۹۰ برس کی تھی، تاہم سب سے پہلے وہی آگے بڑھا، اور عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلہ کو کون آتا ہے، حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "میں" لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ یہ عمرو بن عبدوُد ہے، حضرت علیؓ بیٹھ گئے، لیکن عمرو کی آواز کا

---

(۱) طبری (ج ۳) صفحہ ۱۴۷۴۔

اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا، عمرو نے دوبارہ پکارا اور پھر وہی صرف ایک صدا جواب میں تھی، تیسری دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ عمرو ہے، تو حضرت علیؓ نے عرض کی ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے، غرض آپؐ نے اجازت دی، خود دستِ مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا۔

عمرو کا قول تھا کہ "کوئی شخص دنیا میں اگر مجھ سے تین۳ باتوں کی درخواست کرے تو ایک ضرور قبول کروں گا" حضرت علیؓ نے عمرو سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ تیرا قول ہے، پھر حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

حضرت علیؓ	میں درخواست کرتا ہوں کہ تو اسلام لا،
عمرو	یہ نہیں ہو سکتا،
حضرت علیؓ	لڑائی سے واپس چلا جا،
عمرو	میں خاتونانِ قریش کا طعنہ نہیں سن سکتا،
حضرت علیؓ	مجھ سے معرکہ آرا ہو،

عمرو ہنسا، اور کہا مجھ کو امید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست بھی میرے سامنے پیش کی جائے گی، حضرت علیؓ پیادہ تھے، عمرو کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا، گھوڑے سے اتر آیا اور پہلی تلوار گھوڑے کے پاؤں پر ماری کہ کونچیں کٹ گئیں، پھر پوچھا کہ تم کون ہو آپ نے نام بتایا، اس نے کہا میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا آپ نے فرمایا "ہاں لیکن میں چاہتا ہوں" عمرو اب غصہ سے بے تاب تھا، پرتلے سے تلوار نکالی اور آگے بڑھ کر وار کیا، حضرت علیؓ نے سپر پر روکا، لیکن تلوار سپر میں ڈوب کر نکل آئی، اور پیشانی پر لگی، گو زخم کاری نہ تھا تاہم یہ طغرا آپ کی پیشانی پر یادگار رہ گیا، قاموس میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کو ذوالقرنین بھی کہتے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے، ایک عمرو کے ہاتھ کا اور ایک ابن ملجم کا، دشمن کا وار ہو چکا تو حضرت علیؓ نے وار کیا، ان کی تلوار شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی، ساتھ ہی حضرت علیؓ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا، اور فتح کا اعلان ہو گیا، عمرو کے بعد ضرار اور جبیرہ نے حملہ کیا، لیکن جب ذوالفقار کا ہاتھ بڑھا تو پیچھے ہٹنا پڑا، حضرت عمرؓ فاروق نے ضرار کا تعاقب کیا، ضرار نے مڑ کر برچھے کا وار کرنا چاہا، لیکن روک لیا اور کہا عمر! اس احسان کو یاد رکھنا۔

نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گرا، صحابہؓ نے تیر مارنے شروع کئے اس نے کہا مسلمانو!

"میں شریفانہ موت چاہتا ہوں"۔ حضرت علیؓ نے درخواست منظور کی اور خندق میں اتر کر تلوار سے مارا کہ شریفوں کے شایان تھا (۱)۔

حملہ کا یہ دن بہت سخت تھا، تمام دن لڑائی رہی، کفار ہر طرف سے تیر اور پتھروں کا مینھ برسا رہے تھے، اور ایک دم کے لئے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی، یہی دن ہے کہ جس کا ذکر احادیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متصل (۲) چار نمازیں قضا ہوئیں، متصل تیر اندازی اور سنگ باری سے جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا۔

مستورات جس قلعہ میں تھیں بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا، یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے، قلعہ پر حملہ کیا ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا، اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا، حضرت صفیہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی) نے دیکھ لیا، مستورات کی حفاظت کے لئے حضرت حسانؓ (شاعر) متعین کر دیئے گئے تھے، حضرت صفیہؓ نے ان سے کہا کہ اتر کر اس کو قتل کر دو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا، حضرت حسانؓ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا، جس نے ان میں اس قدر جُبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، اس بنا پر اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا کہ میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا، حضرت صفیہؓ نے خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا، حضرت صفیہؓ چلی آئیں، اور حسانؓ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ، حسانؓ نے کہا جانے بھی دیجئے مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، حضرت صفیہؓ نے کہا اچھا جاؤ اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہو جائیں، لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہؓ ہی کو انجام دینا پڑی، یہودیوں کو یقین ہوا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے، اس خیال سے پھر انہوں نے حملہ کی جراءت نہ کی (۳)۔

محاصرہ کو جس قدر طول ہوتا جاتا تھا، محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے، دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا، پھر باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آ گیا، خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں، کھانے کے دیگچے چولھوں پر الٹ الٹ جاتے تھے،

(۱) یہ حالات اگرچہ اجمالاً تمام کتابوں میں ہیں لیکن ہم نے جو تفصیل لکھی ہے ابن سعد اور خمیس سے ماخوذ ہے۔ (۲) اس امر میں محدثین میں سخت اختلاف ہے کہ چار نمازیں قضا ہوئیں یا ایک، اور چار قضا ہوئیں تو ایک ہی دن یا کئی دن، یا کئی دن کی ملا کر، زرقانی میں یہ بحث مفصل ہے۔ (۳) زرقانی بہ حوالہ طبرانی و بزار و ابو یعلی بہ سند۔ (حسن) دیکھو ص ۱۲۹ جلد ۲ و ابن ہشام۔

اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا اسی بنا پر قرآن مجید نے اس بادِ صرصر، عسکرِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اذۡكُرُوۡا	مسلمانو، خدا کے اس احسان کو یاد کرو،
نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَآءَتۡكُمۡ	جب کہ تم پر فوجیں آپڑیں تو ہم نے
جُنُوۡدٌ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا وَّ	ان پر آندھی بھیجی، اور فوجیں بھیجیں
جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا (احزاب۔ ۳۳: ۹)	جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

نعیم بن مسعود اشجعی ایک غطفانی رئیس تھے، قریش اور یہود دونوں ان کو مانتے تھے، وہ اسلام لاچکے تھے، لیکن کفار کو ابھی اس کا علم نہ تھا، انہوں نے قریش اور یہود سے الگ الگ جاکر اس قسم کی باتیں کیں جس سے دونوں میں پھوٹ پڑگئی۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ نعیم نے اس تفرقہ اندازی میں دونوں سے (ایسی باتیں کہیں جن سے دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو جائیں) اور اس بنا پر کہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الحرب خدعۃ کی تعلیم کی تھی، لیکن ابن اسحاق نے روایت کی سند نہیں نقل کی، اور اگر کرتے بھی تو ابن اسحاق کا یہ پایہ نہیں کہ ایسا واقعہ محض ان کی سند سے قبول کرلیا جائے، اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے جمع تھے کہ دونوں فریقوں کا اتحاد بغیر اس کے توڑ دیا جاسکتا تھا کہ کوئی غلط بات بیان کی جائے، ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے کہا کہ قریش تو چار دن کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے، تمہارا اور مسلمانوں کا ہم وطنی کا ساتھ ہے، اس لئے تم کیوں بیچ میں پڑکر ہمیشہ کے لئے لڑائی مول لیتے ہو، اور اگر اس پر آمادہ ہی ہو تو قریش سے کہو کہ کچھ وہ معزز آدمی ضمانت کے طور پر تمہارے ہاں بھیج دیں کہ اگر یہ بغیر لڑائی کا فیصلہ کئے بغیر جانا چاہیں تو تم ان لوگوں کو روک لینا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہود بنی قریظہ اوّل اوّل نقضِ عہد پر راضی نہ تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمدؐ سے معاہدہ کیوں توڑیں، لیکن حیی بن اخطب نے اسی شرط پر ان کو راضی کیا تھا "کہ قریش چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمہارے پاس آجاؤں گا" قریش اس قسم کی ضمانت نہیں منظور کرسکتے تھے، اس لئے جب انہوں نے انکار کیا ہوگا تو دونوں میں خود پھوٹ پڑگئی ہوگی، اس کے لئے ایک صحابی کو دروغ بیانی کی کیا ضرورت تھی (۱)۔

(حاشیہ صفحہ ۲۹۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

بہر حال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت، یہود کی علحدگی یہ تمام اسباب ایسے جمع ہوگئے تھے، کہ قریش کے پائے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے، ابو سفیان نے فوج سے کہا، رسد ختم ہو چکی، موسم کا یہ حال ہے، یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، اب محاصرہ بے کار ہے، یہ کہہ کر طبلِ رحیل بجنے کا حکم دیا، غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے، بنو قریظہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق ۲۰۔ ۲۲ دن تک غبار آلود رہ کر صاف ہو گیا۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ	اور خدا نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہوا
لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَ كَفَى اللّٰهُ	ہٹا دیا کہ ان کو کچھ ہاتھ نہ آیا اور مسلمانوں
الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ (احزاب۔ ۳۳:۲۵)	کو لڑنے کی نوبت نہ آنے دی۔

اس معرکہ میں فوجِ اسلام کا جانی نقصان کم ہوا، لیکن انصار کا سب سے بڑا بازو ٹوٹ گیا، یعنی حضرت سعدؓ بن معاذ جو قبیلۂ اوس کے سردار تھے، زخمی ہوئے اور پھر جاں بر نہ ہو سکے، ان کے زخم کھانے کا واقعہ موثر اور عبرت انگیز ہے۔

حضرت عائشہؓ جس قلعہ میں پناہ گزیں تھیں، حضرت سعدؓ بن معاذ کی ماں بھی وہیں ان کے ساتھ تھیں، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں قلعہ سے نکل کر باہر پھر رہی تھی، عقب سے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی، مڑ کر دیکھا تو سعد ہاتھ میں حربہ لئے جوش کی حالت میں بڑی تیزی سے بڑھے جا رہے ہیں، اور یہ شعر زبان پر ہے:

لبث قلیلا تدرک الھیجا جمل (۱)	لاباٗس بالموت اذا الموت نزل
ذرا ٹھہر جانا کہ لڑائی میں ایک اور شخص پہنچ جائے	وقت جب آگیا تو موت سے کیا ڈر ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۸) مصنف کے اس قیاس کی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے، جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل کے ساتھ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے، اس روایت کے رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں شرکت اسی شرط کے ساتھ کی تھی، کہ قریش ضمانت کے طور پر اپنے کچھ معزز آدمی بنو قریظہ کے سپرد کر دیں گے لیکن انہوں نے اپنی یہ شرط پوری نہیں کی، اور اس لئے ان کے دل میں قریش کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہوئی اور انہوں نے خفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کے ساتھ مصالحت کا پیغام بھیجا، کہ بنو نضیر کو، جو خیبر کو جلاوطن کر دیئے گئے تھے، پھر مدینہ آنے کی اجازت دے دی جائے، نعیم بن مسعود ثقفی جو اسی موقع پر مسلمان ہونے آئے تھے، ایک ایسے آدمی تھے، جو پیٹ کے ہلکے تھے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دانستہ راز کے طور پر بنو قریظہ کے اس مخفی پیغام کا ذکر فرما دیا، انہوں نے جا کر یہ قریش تک پہنچا دیا، اس سے قریش کو بنو قریظہ سے بدگمانی پیدا ہو گئی، اور اس طرح قریش اور بنو قریظہ کے اتفاق کا رشتہ ٹوٹ گیا، دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب المغازی باب غزوۂ خندق والبدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۱۳ مصر) "س" (۱) ابن ہشام و طبری وخمیس۔

حضرت سعدؓ کی ماں نے سنا تو پکاریں بیٹا دوڑ کر جا تو نے دیر لگادی، سعدؓ کی زرہ اس قدر چھوٹی تھی کہ ان کے دونوں ہاتھ باہر تھے، حضرت عائشہؓ نے سعدؓ کی ماں سے کہا کاش سعدؓ کی زرہ لمبی ہوتی۔ اتفاق یہ کہ ابن العرقہ نے تاک کر کھلے ہوئے ہاتھ پر تیر مارا جس سے اکحل کی رگ کٹ گئی، خندق کا معرکہ ہوچکا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے لئے مسجد کے صحن میں ایک خیمہ کھڑا کرایا اور ان کی تیمارداری شروع کی (۱)۔ اس لڑائی میں رفیدہ ایک خاتون شریک تھیں، جو اپنے پاس دوائیں رکھتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، یہ خیمہ انہی کا تھا اور وہ علاج کی نگراں تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دستِ مبارک میں مشقص (۲) لے کر داغا، لیکن پھر ورم کر آیا، دوبارہ داغا لیکن پھر فائدہ نہ ہوا۔ کئی دن کے بعد یعنی بنو قریظہ کی ہلاکت کے بعد زخم کھل گیا، اور انہوں نے وفات پائی۔

بنو قریظہ کا خاتمہ

اوپر گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آغازِ قیام میں یہود کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، اور ان کو جان و مال و مذہب ہر چیز میں امن و آزادی بخشی، لیکن جب قریش نے ان کو تحریض و تہدید کا خط لکھا تو وہ آمادۂ بغاوت ہوگئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے تجدیدِ معاہدہ کرنی چاہی، بنو نضیر نے انکار کیا، اور وہ جلاوطن کر دیئے گئے، لیکن بنو قریظہ نے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا (۳)۔ چنانچہ ان کو امن دے دیا گیا۔ صحیح مسلم میں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

عن ابن عمر ان یهود بنی النضیر و قریظة حاربوا رسول صلی اللہ علیہ وسلم فاجلی رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنی النضیر واقر قریظة ومنّ علیهم (صحیح مسلم ذکر اجلاء الیهود من الحجاز)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ بنو نضیر اور قریظہ کے یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کی تو آپؐ نے بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا اور قریظہ کو رہنے دیا اور ان پر احسان کیا۔

(۱) یہ خمیس کا بیان ہے حافظ ابن حجر نے اصابہ (ذکر رفیدہ میں امام بخاریؒ کی ادب المفرد سے نقل کیا ہے کہ رفیدہ ایک خاتون تھیں جو زخمیوں کا علاج کرتی تھیں حضرت سعدؓ انہی کے پاس علاج کے لئے رکھے گئے تھے، ابن سعد نے رفیدہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا ایک خیمہ مسجد نبویؐ کے پاس تھا، اسی میں وہ بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں، صحیح بخاری میں بھی رفیدہ کے خیمہ اور ان کے جراح خانہ کا ذکر ہے۔ (۲) مسلم باب التداوی (۳) واقدی نے حییؒ بن اخطب کی زبانی بنو قریظہ کے اس معاہدہ کر کے ٹھہر جانے کے واقعہ کو ان کی سازشی چال ظاہر کیا ہے، حیی بن اخطب نے کہا کہ وہ اس لئے ٹھہر گئے ہیں تاکہ موقع پاکر کفار سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر سکیں۔ معازی واقدی ص ۲۰۰۰ کلکتہ) "س"

بنو نضیر جب جلاوطن ہوئے تو ان کے رئیس الاعظم حییؔ بن اخطب، ابو رافع سلام ابن ابی الحقیق خیبر میں جاکر آباد ہوئے اور وہاں ریاستِ عام حاصل کر لی۔ جنگِ احزاب ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی، قبائلِ عرب میں دورہ کر کے تمام ملک میں آگ لگادی، اور قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، اس وقت تک قریظہ معاہدہ پر قائم تھے، لیکن حییؔ بن اخطب نے ان کو بہکا کر توڑ لیا اور ان سے وعدہ کیا کہ خدانخواستہ اگر قریش حملہ سے دست بردار ہو کر چلے گئے، تو میں خیبر چھوڑ کر یہیں آرہوں گا، چنانچہ اس نے یہ عہد وفا کیا۔

قریظہ نے احزاب میں علانیہ (۱) شرکت کی اور شکست کھا کر ہٹ آئے تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن حییؔ بن اخطب کو ساتھ لائے (۲)۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب سے فارغ ہو کر حکم دیا کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں اور قریظہ کی طرف بڑھیں، قریظہ اگر صلح و آشتی سے پیش آتے تو قابلِ اطمینان تصفیہ کے بعد ان کو امن دیا جاتا، لیکن وہ مقابلہ کا فیصلہ کر چکے تھے، فوج سے آگے بڑھ کر جب حضرت علیؓ ان کے قلعوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے علانیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیں (۳)، غرض ان کا محاصرہ کیا گیا اور تقریباً ایک مہینہ محاصرہ رہا، بالآخر انہوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعدؓ بن معاذ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ اور ان کا قبیلہ (اَوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد تھا، عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھ کر تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور کی۔

قرآن مجید میں جب تک کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم توراۃ کے احکام کی پابندی فرماتے تھے، چنانچہ اکثر مسائل مثلاً قبلہ نماز، رجم، قصاص یا مثل وغیرہ وغیرہ میں جب تک خاص وحی نہیں آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توراۃ ہی کی

---

(۱) سر ولیم میور صاحب ارباب سیر کی یہ روایت تسلیم نہیں کرتے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں کوئی عملی حصہ لیا تھا، ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا، لیکن قرآن مجید میں صاف یہ الفاظ ہیں: وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاھَرُوْھُمْ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ، مظاہرہ (امداد) سے بڑھ کر اور کون لفظ درکار ہے (۲) طبری (ج ۳ ص ۱۴۸۷ "س") و ابن ہشام صفحہ ۱۴۶ جلد دوم۔ (۳) (طبری (ج ۳ ص ۱۴۸۵ "س") میں ہے، حتی اذ ادنا من الحصون سمع منہا مقالۃ قبیحۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہم۔

پابندی فرمائی۔ حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا یعنی یہ کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں مال واسباب غنیمت قرار دیا جائے (۱)۔ توراۃ کے مطابق تھا۔ توراۃ کتاب تثنیہ، اصحاح ۲۰۔ آیت ۱۰ میں ہے

"جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے اگر وہ صلح تسلیم کرلیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلادے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مال غنیمت ہوں گی"۔

احادیث میں مذکور ہے کہ سعد نے جب یہ فیصلہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ آسمانی فیصلہ کیا، یہ اسی توراۃ کے حکم کی طرف اشارہ تھا، یہودیوں کو جب یہ حکم سنایا گیا تو جو فقرے ان کی زبان سے نکلے، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسی فیصلہ کو حکمِ الٰہی کے موافق سمجھتے تھے۔

حیئ بن اخطب جو ان تمام فتن کا بانی تھا، مقتل میں لایا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور یہ فقرے کہے:

اما واللّٰہ مالمت نفسی فی عداوتک ولکنہ من یخذل اللّٰہ یخذل۔	ہاں خدا کی قسم مجھ کو اس کا افسوس نہیں کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی، لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص خدا کو چھوڑ دیتا ہے خدا بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

ایھاالناس انہ لا باس بامر اللّٰہ	لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں،

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ،، (باب جواز قتال من نقض العہد و جواز انزال اہل الحصون علی حکم حاکم عدل اہل للحکم "ص") اور نیز بخاری (باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب "ص") میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے، مارگولوس صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سعدؓ بن معاذ کو اس جنگ میں ایک قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا، جس سے وہ بالآخر ہلاک ہوگئے، اس لئے انہوں نے بنو قریظہ کی نسبت ایسا بے رحمانہ فیصلہ کیا لیکن وہ تیر انداز ابن العرقہ قریشی تھا، قریظی نہ تھا، صحیح بخاری و مسلم میں صاف یہ تصریح ہے، ۱۲۔

كتاب وقدر و ملحمة كتبها الله على بنى اسرائيل (۱)	یہ ایک حکمِ الٰہی تھا، یہ لکھا ہوا تھا، ایک سزا تھی جو خدا نے بنو اسرائیل پر لکھی تھی۔

حیئ بن اخطب کی نسبت یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب وہ جلا وطن ہو کر خیبر جارہا تھا تو اس نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کسی کو مدد نہ دے گا (۲)، اس معاہدہ پر اس نے خدا کو ضامن کیا تھا، لیکن احزاب میں اس نے اس معاہدہ کی جس طرح تعمیل کی اس کا حال ابھی گذر چکا۔

بنو قریظہ کے متعلق مخالفینِ اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم و بے رحمی کا اعتراض کیا ہے، لیکن واقعات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا، جس میں ان کے مذہب کو پوری آزادی دی گئی اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

۲۔ بنو قریظہ رتبہ میں بنو نضیر سے کم تھے، یعنی بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کو صرف آدھا خوں بہا دینا پڑتا تھا، بخلاف اس کے بنو قریظہ پورا خوں بہا ادا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا (۳)۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت بنو قریظہ سے تجدیدِ معاہدہ کی۔

۴۔ باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی، اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

۵۔ ازواجِ مطہرات قلعہ میں حفاظت کے لئے بھیج دی گئی تھیں، ان پر حملہ کرنا چاہا،

۶۔ حیئ بن اخطب جو بغاوت کے جرم میں جلاوطن کر دیا گیا تھا، جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کر کے جنگِ احزاب قائم کر دی تھی، اس کو اپنے ساتھ لائے، جو آتشِ جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔

ان حالات کے ساتھ بنو قریظہ کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا تھا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے، کہ عرب میں محالفت کا معاہدہ اخوتِ حقیقی کے برابر تھا،

---

(۱) یہ دونوں عبارتیں ابن ہشام (غزوۂ بنی قریظہ) میں ہیں، طبری میں بھی قریباً یہی الفاظ ہیں۔
(۲) بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۲۲ (یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی، باب بنی قریظہ میں بھی مذکور ہے۔) "س"
(۳) ابوداؤد (ج ۲ کتاب الدیات باب النفس بالنفس) "س"

بنو قریظہ انصار کے حلیف تھے، اور اسی بنا پر تمام انصار (اوس) نے ان کی نہایت الحاح کے ساتھ سفارش کی، حضرت سعدؓ بن معاذ اوس کے سردار تھے، اور دراصل معاہدہ کے وہی ذمہ دار تھے، وہ سخت کشمکش میں تھے، ان کے حلیفوں کی موت و حیات کا مسئلہ تھا، جن کی حمایت پر کل انصار (اوس) مصر تھے، لیکن حضرت سعدؓ بن معاذ اس فیصلہ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

مقتولین کی تعداد اربابِ سیر نے ۶۰۰ سے زائد بیان کی ہے، لیکن صحاح میں ۴۰۰ ہے، ان میں صرف ایک عورت تھی، اور وہ اس قصاص میں ماری گئی تھی کہ اس نے قلعہ پر سے ایک پتھر گرا کر ایک مسلمان (خلاد) (۱) کو قتل کر دیا تھا، اس عورت نے جس جراءت اور دلیری سے جان دی، سنن ابی داؤد میں وہ حسب ذیل (۲) حیرت انگیز طریقہ سے مذکور ہے۔

اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست میں اس کا نام بھی ہے، قتل گاہ میں مجرم آتے اور عدم کو روانہ ہوتے جاتے تھے، ایک ایک کا نام پکارا جا رہا تھا، اور یہ ہوش ربا صدا بار بار اس کے کانوں میں آتی تھی، لیکن وہ بے تکلف حضرت عائشہؓ سے باتیں کرتی جاتی اور بات بات پر ہنستی جاتی تھی، دفعتاً قاتل نے اس کا نام پکارا، وہ بے تکلف اٹھ کھڑی ہوئی، حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہاں؟ بولی میں نے ایک جرم کیا تھا، اس کی سزا اٹھانے جاتی ہوں، خوشی خوشی قتل گاہ میں آئی اور تلوار کے نیچے سر رکھ دیا۔

حضرت عائشہؓ جب اس واقعہ کو بیان کرتی تھیں، تو نہایت حیرت کے لہجہ میں بیان کرتی تھیں۔

ریحانہ کا غلط واقعہ

متعدد اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک یہودی عورت جس کا نام ریحانہ تھا، اس کی نسبت حکم دیا، کہ الگ کر لی جائے اور پھر چند روز کے بعد اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا، چنانچہ جن مورخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لونڈیوں سے بھی متمتع ہوتے تھے، انہوں نے دو مثالیں پیش کی ہیں، ایک یہی ریحانہ اور دوسری ماریہ قبطیہ، عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو صحیح قرار دے کر نہایت ناگوار صورت میں دکھایا ہے، ایک مورخ نہایت طعن آمیز الفاظ میں لکھتا ہے کہ "بانی اسلام جب سات سو ۷۰۰ مقتولین کی لاشوں کے

(۱) (ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ)۔ (۲) ابوداؤد (کتاب الجہاد باب قتل النساء) ص ۹۔

تڑپنے کا تماشا دیکھ چکا تو گھر پر آکر تفریح خاطر کے لئے ....

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے۔

ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں، سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں۔ لیکن واقدی نے بہ تصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نکاح کیا تھا۔ ابن سعد نے واقدی کی جو روایت نقل کی ہے، اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:۔

فاعتقنی وتزوج بی۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح کر لیا۔

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخ مدینہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

وکانت ریحانۃ القرظیۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم تسکنہ	اور ریحانہ قرظیہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ (محترم) تھیں، اس مکان میں رہتی تھیں۔

حافظ ابن مندہ کی کتاب (طبقات الصحابہ) تمام محدثینِ مابعد کا ماخذ ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں (۱):۔

واستسری ریحانۃ من بنی قریظۃ ثم اعتقھا فلحقت باھلھا واحتجبت وھی عند اھلھا	ریحانہ کو گرفتار کیا اور پھر آزاد کر دیا تو وہ اپنے خاندان میں چلی گئیں اور وہیں پردہ نشین ہو کر رہیں۔

حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں:۔

وھذہ فائدۃ جلیلۃ اغفلھا ابن الاثیر،

حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا تھا، اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں۔

ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے اور اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ حرمِ نبویؐ میں آئیں،

---

(۱) دیکھو اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ریحانہؓ (ج ۴ ص ۳۰۹) "س"۔

تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں، کنیز نہ تھیں (۱)۔

حضرت زینبؓ سے نکاح سنہ ۵ھ

اس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ نکاح ایک معمولی بات ہے اور اس کی تفصیل کا موقع ازواجِ مطہرات کا عنوان ہے۔ لیکن اس واقعہ میں ایسے حالات جمع ہو گئے، جنہوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا، عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص و نکتہ چینی (عیاذاً باللہ) کے لئے ان کے نزدیک اور کوئی واقعہ بکار آمد نہیں ہو سکتا۔

ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں، جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے اس کا اصلی مخرج کیا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو جو آپؐ کے آزاد کردہ غلام تھے، متبنّٰی بنا لیا تھا، جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچے تو آپؐ نے ان کی شادی حضرت زینبؓ سے کرنی چاہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھیری بہن تھیں، (ان کی ماں امیمہ، عبدالمطلب کی بیٹی تھیں)، لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے، اس لئے حضرت زینبؓ کو یہ نسبت گوارا نہ تھی۔

و کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اراد ان یزوجھا زید بن حارثۃ مولاہ فکرھت ذلک (۲)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنے غلام زید سے کر دینا چاہا، تو انہوں نے ناپسند کیا۔

---

(۱) (حضرت ریحانہؓ کے متعلق کتبِ سیر میں تین قسم کی روایتیں ہیں، ایک یہ کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں، یہ روایت ابن مندہ کی ہے مگر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت نہیں، دوسری قسم کی روایت یہ ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے مثل دیگر امہات المومنین کے رکھنا چاہا مگر انہوں نے اس کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کر کے باندی بن کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا قبول کیا، یہ روایت ابن اسحاق کی ہے، تیسری قسم کی روایت یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مختار بنا دیا، تو انہوں نے اسلام قبول کیا تو آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا، یہ روایت واقدی کی ہے، ابن سعد نے واقدی سے مختلف سلسلوں سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور واقدی نے اسی کو اثبت کہا ہے، دیکھئے، کتاب البدایہ ابن کثیر ج ۵ ص ۳۰۵ اور امام زہری نے بھی زوجیت ہی کی تائید کی ہے، بہ حوالۂ سابق، تفصیل کے لئے دیکھئے اصابہ ذکر ریحانہ) "س" (۲) فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب، بہ حوالہ ابن ابی حاتم۔

لیکن بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیلِ ارشاد کے لحاظ سے راضی ہو گئیں، قریباً ایک سال تک حضرت زیدؓ کے نکاح میں رہیں، لیکن دونوں میں ہمیشہ شکر رنجی رہتی تھی، یہاں تک کہ زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر شکایت کی، اور ان کو طلاق دینا چاہا۔

جاء زید بن حارثة فقال یا رسول اللّٰہ ان زینب اشتد علی لسانھا وانا ارید ان اطلقھا (۱)

زید، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ زینبؓ مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار ان کو سمجھاتے تھے کہ طلاق نہ دیں، قرآن مجید میں ہے:

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ
(احزاب۔ ۳۳:۳۷)

اور جب کہ تم اس شخص سے جس پر خدا نے اور تم نے احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو نکاح میں لئے رہو، اور خدا سے خوف کرو۔

لیکن کسی طرح صحبت برآر نہ ہو سکے، اور آخر حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی، حضرت زینبؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بہن تھیں، اور آپؐ ہی کی تربیت میں پلی تھیں، آپؐ کے فرمانے سے انہوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا، جو ان کے نزدیک ان کے خلاف شان تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو مساوات اسلامی قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں آزاد و غلام کی کوئی تمیز نہ تھی، بہر حال جب وہ مطلقہ ہو گئیں، تو آپؐ نے ان کی دلجوئی کے لئے خود ان سے نکاح کر لینا چاہا، لیکن عرب میں اس وقت تک متبنیٰؓ اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا، اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپؐ تامل فرماتے تھے، لیکن چونکہ یہ محض جاہلیت کی رسم تھی اور اس کا مٹانا مقصود تھا، اس لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ
(احزاب۔ ۳۳:۳۷)

اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جس کو خدا ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو، حالانکہ ڈرنا خدا سے چاہیئے،

---

(۱) فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب، بہ حوالۂ روایت عبدالرزاق از معمر از قتادہ۔

غرض آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیا اور جاہلیت کی ایک قدیم رسم کہ متبنّٰی اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے، مٹ گئی، اس پر منافقوں اور بدگویوں نے بہت طعنے دیئے، لیکن امرِ حق کے اجراء میں مطاعن کا آماجگاہ بننا لازمی ہے۔

واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی، مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے گو سرتاپا کذب و افترا ہے، لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے رنگ آمیزی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے، زید نہ تھے، حضرت زینبؓ کپڑے پہن رہی تھیں، اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ لیا، اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے:

سبحان اللہ العظیم سبحان اللہ مصرف القلوب (۱)	پاک ہے خدا ے برتر، پاک ہے وہ خدا جو دلوں کو پھیر دیتا ہے۔

حضرت زیدؓ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ زینبؓ اگر آپؐ کو پسند آ گئی ہوں تو میں ان کو طلاق دے دوں۔

میں نے یہ بیہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کر کے نقل کی ہے، "نقلِ کفر کفر نہ باشد" یہی روایت ہے جو عیسائی مورخوں کا مایۂ استناد ہے، لیکن ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصولِ فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے، مورخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے، جو مشہور کذّاب اور دروغ گو ہے، اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسی قسم کی بیہودہ روایتیں نقل کی ہیں، لیکن محدثین نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے، حافظ ابن حجر سخت روایت پرست ہیں، تاہم فتح الباری (سورۂ احزاب کی تفسیر) میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے لکھتے ہیں:

وورددت آثار اخری اخرجھا ابن ابی حاتم و الطبری و نقلھا	اور اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے۔

---

(۱) تاریخ طبری آغاز واقعات سنہ ۵ ہجری۔

كثير من المفسرين لا ينبغي التشاغل بها

اور اکثر مفسرین نے ان کو نقل کر دیا ہے، ان روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہیے،

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

ذكر ابن ابی حاتم و ابن جرير ههنا أثاراً عن بعض السلف رضی الله عنهم احببنا ان نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها و قد روى الامام احمد ههنا ايضا من رواية حمّاد بن زيد عن ثابت عن انس رضی الله عنه فيه غرابة تركنا سياقه ايضا

ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض اسلاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں جن کو ہم اس لئے نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غلط ہیں اور امام احمد نے بھی اس واقعہ کے متعلق انسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے۔ جو غریب ہے۔ ہم نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت منافقوں کا بہت زور تھا، حضرت عائشہؓ پر لوگوں نے جو تہمت لگائی وہ بھی اسی سال کا واقعہ ہے، منافقین ان خبروں کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتی تھیں، یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کی تہمت میں خود چند مسلمان بھی آلودہ ہوگئے، جن کو شریعت کے موافق قذف کی سزا دی گئی، یہی روایتیں ہیں جو بچی کھچی غیر محتاط کتابوں میں باقی رہ گئیں، لیکن وہ محدثین جن کا معیار تحقیق بلند ہے، اور عدالت روایت کے حاکمانِ مجاز ہیں، مثلاً امام بخاریؒ امام مسلمؒ وغیرہ، ان کے ہاں ان روایتوں کا ذکر تک نہیں آتا۔

واقعاتِ متفرقہ ۵ھ

اس سال کی تاریخ مذہبی میں سب سے اہم واقعات عورتوں کے متعلق متعدد اصلاحی احکام کا نزول ہے، اب تک مسلمان عورتیں عام جاہلانہ طریق سے چلتی پھرتی تھیں، اور اسی قسم کے لباس و زیور پہنتی تھیں، اب حکم ہوا کہ شریف عورتیں گھر سے نکلیں تو ایک بڑی چادر اوڑھ کر گھونگھٹ نکال لیا کریں، جس سے منھ بھی چھپ جائے، آنچل سینہ پر ڈال کر چلیں، پاؤں جھٹک جھٹک کر نہ چلیں، پردہ کی اوٹ سے بولیں، تصنع اور بناؤ کی بولی نہ بولیں، ازواجِ مطہراتؓ کے لئے غیر مردوں کے

سامنے آنا قطعاً ممنوع ہوا۔

منہ بولے لڑکے کی بیوی سے جاہلیت میں بیاہ ناجائز تھا۔اس رسم کی اصلاح بھی اسی سال ہوئی۔زنا کی سزا سو کوڑے بھی اسی سال نازل ہوئی۔عفیف عورتوں پر الزام لگانا جاہلیت کا ایک معمولی فعل تھا۔اور ان کمزوروں کے پاس اس حملہ کے روکنے کے لئے کوئی قانونی سپر نہ تھی۔اس سال "حدِ قذف" نازل ہوئی۔جس کے رو سے بغیر شہادت کے تنہا اتہام جرم قرار دیا گیا۔ بصورت عدم وجودِ شہادت لعان کا طریقہ بتایا گیا۔یعنی زن و شو دونوں اپنی سچائی اور فریقِ ثانی کی دروغ گوئی کا بحلف اظہار کریں۔اور اس کے بعد ان میں تفرقہ کر دیا جائے (۱)۔

عرب میں ایک قسم کی طلاق جاری تھی۔جس کو ظہار کہتے ہیں۔اس سال اس قسم کی طلاق غیر مؤثر قرار دی گئی۔اور اس کے لئے کفارہ مقرر کیا گیا۔

پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمم کی مشروعیت بھی اسی سال کا حکم ہے۔بروایت صحیحہ نمازِ خوف کا حکم قرآن مجید میں اسی سال نازل ہوا جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی)۔

---

(۱) بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۰۰ و سیرت گازرونی قلمی۔ابو داؤد جلد ۲ صفحہ ۲۱۲۔نیز فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۱۰۶ دیکھنا چاہیئے یہ تمام احکام سورۂ نور میں بہ تقریب واقعۂ افک سنہ ۵ھ میں نازل ہوئے۔

☆☆☆☆☆

سنہ ۶

صلح حدیبیہ و بیعت رضوان

ذوقعدہ سنہ ۶ ھ

مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں، گاؤں بھی اسی کوئیں کے نام سے مشہور ہو گیا، چونکہ معاہدۂ صلح یہیں لکھا گیا، اس لئے اس واقعہ کو صلحِ حدیبیہ کہتے ہیں۔

تاریخِ اسلام میں یہ واقعہ نہایت اہم یعنی اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ ہے، اور اسی بنا پر باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک صلح کا معاہدہ تھا، اور صلح بھی بظاہر مغلوبانہ تھی، تاہم خدا نے قرآن مجید میں اس کو فتح کا لقب دیا ہے۔

کعبہ اسلام کا اصلی مرکز تھا، اسلام کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے قائم کی تھی، اور یہ لقب اسلام بھی ان ہی کی ایجاد ہے:

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (حج۔ ۲۲: ۸) ابراہیم ہی ہے جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شریعت ملی وہ کوئی نئی شریعت نہ تھی؛ بلکہ وہی ابراہیمی شریعت تھی:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (حج۔ ۲۲: ۸) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

زمانہ کے امتداد سے گو ان ہی کی اولاد بت پرست بن گئی تھی، تاہم کعبہ جو ابراہیمی یادگار تھا، عرب کا قبلہ گاہ عام تھا، تمام عرب اس کو اپنا مشترک ورثۂ آبائی سمجھتا تھا، نہ صرف وہ لوگ جو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے تھے، بلکہ وہ بھی جو قحطانی تھے، اور جن کا سلسلۂ نسب اس خاندان سے الگ تھا، عرب کے قبائل سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے، اور یہی غارت گریاں ان کی بقائے زندگانی کا ذریعہ تھیں، کیونکہ ان کی معاش بھی اسی پر منحصر تھی، تاہم

چار مہینے تک جو اشہرِ حرم کہلاتے تھے، تمام لڑائیاں بند ہوجاتی تھیں، قبائلِ عرب دور دور سے سفر کرکے آتے اور اس قبلہ گاہ عام میں عبادت اور عقیدت کے رسوم بجالاتے تھے، وہ قبائل جن میں سے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتا تھا، اب یک جا جمع نظر آتے تھے، اور شیر وشکر ہوکر ملتے تھے، گویا بھائی بھائی ہیں، مسلمان بہ جبر مکہ سے نکالے گئے تھے، لیکن یہ خیال ان کے دل سے نہیں گیا تھا، اور نہ جاسکتا تھا کہ کعبہ پر ان کا بھی کم از کم اسی قدر حق ہے، جس قدر اور قبائل کا ہے، اس کے ساتھ مکہ سے مسلمانوں کو گوناگوں تعلقات تھے، وہ ان کا قدیم اور محبوب وطن تھا، مکہ کی یاد ایک پھانس تھی، جو ہر وقت ان کے کلیجے میں کھٹکتی رہتی تھی، حضرت بلالؓ مکہ میں اس قدر ستائے گئے تھے، تاہم ان کو جب مکہ یاد آتا، تو روتے تھے، اور پکار کر یہ اشعار (۱) پڑھتے تھے:

الالیت شعری ھل ابیتن لیلة	آہ! کیا پھر کبھی وہ دن آسکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی
بواد وحولی اذخر وجلیل	میں ایک رات بسر کروں اور میرے پاس اذخر اور
وھل اردن یوما میاہ مجنة	جلیل ہوں اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ میں مجنة کے
وھل یبدون لی شامة و طفیل	چشموں پر اتروں اور شامہ و طفیل مجھ کو دکھائی دیں۔

اکثر مہاجرین جان بچاکر نکل آئے تھے، لیکن خاندان اور بال بچے وہیں رہ گئے تھے۔

اسلام کے فرائض چہار گانہ میں حج کعبہ ایک رکنِ اعظم ہے، غرض مختلف اسباب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا، اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو، عمرہ (۲) کا احرام باندھا، اور قربانی کے اونٹ ساتھ لئے، یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے، صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے، اس میں بھی یہ شرط ہے، کہ نیام میں بند ہو۔

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے، ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہم رکاب ہوئے، مقامِ ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہوگئیں، یعنی قربانی کے اونٹ ساتھ تھے، ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگادیئے گئے۔

---

(۱) یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی مذکور ہیں (باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ المدینۃ) "س" (۲) وساق معہ الھدی واحرم بالعمرۃ لیامن الناس من حزبہ (ابن ہشام)

احتیاط کے لئے قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے، جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا اس نے آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمدؐ مکہ میں کبھی نہیں آسکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور شور سے مقابلہ کی تیاری کی، قبائلِ متحدہ کے پاس پیغام بھیجا وہ جمعیتِ عظیم لے کر آئے، مکہ سے باہر بلدح ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں، خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے، دو سو ۲۰۰ سوار لے کر جن میں ابو جہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے، جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے، اور مقامِ غمیم تک آگئے ہیں، اس لئے بکتراکر داہنی طرف سے چلو، فوج اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد کے گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی، وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے، اور قریش کو خبر کی کہ لشکرِ اسلام غمیم تک آگیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) آگے بڑھے، اور حدیبیہ میں پہنچ کر مقام کیا، یہاں پانی کی قلت تھی، ایک کنواں تھا، وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا، لیکن اعجازِ نبویؐ سے اس میں اس قدر پانی آگیا کہ سب سیراب ہوگئے۔

قبیلۂ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا، لیکن اسلام کے حلیف اور رازدار تھے، قریش اور عام کفار جو منصوبے اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے، وہ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے، اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقاء تھے، (فتحِ مکہ میں اسلام لائے)، ان کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تشریف لانا معلوم ہوا، تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آرہا ہے، وہ آپؐ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ قریش سے جا کر کہدو کہ "ہم عمرہ (۱) کی غرض سے آئے ہیں، لڑنا مقصود نہیں، جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے، اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے، ان کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک مدت معین کے لئے معاہدۂ

---

(۱) عمرہ گویا ایک چھوٹا سا حج ہے، جس میں حج کی اکثر رسمیں ادا کی جاتی ہیں، (یعنی اس میں حرم کے باہر میقات سے احرام باندھ کر صرف صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے اور بال منڈوائے یا کتروائے جاتے ہیں) "س"۔

صلح کر لیں، اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں، اس پر بھی اگر وہ راضی نہیں تو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے"۔ بدیل نے جا کر قریش سے کہا کہ "میں محمدؐ کے پاس سے پیغام لے کر آیا ہوں اجازت دو تو کہوں"۔ چند شریر بول اٹھے کہ ہم کو محمد کے پیغام سننے کی ضرورت نہیں، لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی، بدیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرطیں پیش کیں، عروہ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا "کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں" بولے ہاں، عروہ نے کہا میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں، سب نے کہا نہیں، عروہ نے کہا "اچھا تو مجھ کو اجازت دو کہ میں خود جا کر معاملہ طے کروں، محمدؐ نے معقول شرطیں پیش کی ہیں"۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، قریش کا پیغام سنایا، اور کہا محمدؐ فرض کرو کہ تم نے قریش کا استیصال کر دیا تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو اس کے سوا اگر لڑائی کا رخ بدلا تو تمہارے ساتھ جو یہ بھیڑ ہے گرد کی طرح اڑ جائے گی، حضرت ابو بکرؓ کو اس بدگمانی پر اس قدر غصہ آیا کہ گالی دے کر کہا کہ کیا ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ عروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ابو بکرؓ، عروہ نے کہا میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا لیکن ان کا ایک احسان میری گردن پر ہے، جس کا بدلا ابھی تک میں ادا نہیں کر سکا۔

عروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے تکلفانہ طریقہ سے گفتگو کر رہا تھا، اور جیسا کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ بات کرتے کرتے مخاطب کی داڑھی پکڑ لیتے ہیں، وہ ریش مبارک پر بار بار ہاتھ ڈالتا تھا، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ جو ہتھیار لگائے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پشت پر کھڑے تھے، اس جراءت کو گوارا نہ کر سکے، عروہ سے کہا "اپنا ہاتھ ہٹا لے ورنہ یہ ہاتھ بڑھ کر واپس نہ جا سکے گا"۔ عروہ نے حضرت مغیرہؓ کو پہچانا اور کہا "او دغا باز! کیا میں تیری دغا بازی کے معاملہ میں تیرا کام نہیں کر رہا ہوں"۔ (حضرت مغیرہؓ نے چند آدمی قتل کر دیئے تھے، جن کا خوں بہا عروہ نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا)۔

عروہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے اس کے دل پر عجب اثر کیا، قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے

دربار دیکھے ہیں، یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے، کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا، وہ وضو کرتے ہیں تو پانی جو گرتا ہے، اس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے، بلغم یا تھوک گرتا ہے، تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرہ اور ہاتھوں میں مل لیتے ہیں (۱)۔

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خِراش بن امیہؓ کو قریش کے پاس بھیجا، لیکن قریش نے ان کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا تھا، مار ڈالا اور خود ان پر بھی یہی گذرنے والی تھی، لیکن قبائلِ متحدہ کے لوگوں نے بچالیا، اور وہ کسی طرح جان بچا کر چلے آئے۔

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو، لیکن یہ لوگ گرفتار کر لئے گئے، گو یہ سخت شرارت تھی، لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامنِ عفو اس سے زیادہ وسیع تھا، آپؐ نے سب کو چھوڑ دیا، اور معافی دے دی، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے (۲)۔

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ	اور وہی خدا ہے جس نے مکہ میں ان لوگوں کا
وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ	ہاتھ تم سے اور تمہارا ہاتھ ان سے روک دیا،
بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ	بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا۔
(فتح۔ ۴۸: ۲۴)	

بیعتِ رضوان

بالآخر آپؐ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کو انتخاب کیا، لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں، اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے، آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا، وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا، قریش نے ان کو نظر بند کر لیا، لیکن عام طور پر خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے، یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے، یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی

(۱) بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد والمصالحہ مع اہل الحرب وکتابۃ الشروط مع الناس بالقول، جلد ۲ صفحہ ۳۸۹)

"س" (۲) ان آیتوں کی شانِ نزول میں سخت اختلاف ہے، لیکن زیادہ معتبر یہی روایت ہے

تمام صحابہؓ نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے، ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دستِ مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا، یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔ سورۂ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا	خدا مسلمانوں سے راضی تھا جب کہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا، تو خدا نے ان پر تسلّی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی

(فتح۔ ۴۸: ۱۸)

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا، وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے، چنانچہ لوگوں نے ان کو "خطیبِ قریش" (۱) کا خطاب دیا تھا، قریش نے ان سے کہہ دیا صلح صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں۔

سہیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دیر تک صلح کے شرائط پر گفتگو رہی؛ بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلم بند کریں، حضرت علیؓ نے عنوان پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا۔

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتدا میں "باسمک اللّٰھم" لکھتے تھے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم سے وہ آشنا نہ تھے، اس بنا پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا، آگے کا فقرہ تھا ھٰذا ما قاضٰی علیہ محمد رسول اللّٰہ "یعنی وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم کیا" سہیل نے کہا "اگر ہم آپؐ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا، آپؐ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "گو تم تکذیب کرتے ہو لیکن خدا کی قسم میں خدا کا پیغمبر ہوں"۔ یہ کہہ کر آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم

(۱) زرقانی جلد ۲ ص ۲۲۳ "س"

دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو، حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرمان گذار ہو سکتا تھا، لیکن عالمِ محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں، جہاں فرماں بری سے انکار کرنا پڑتا ہے، حضرت علیؓ نے کہا میں ہرگز آپؐ کا نام نہ مٹاؤں گا، آپؐ نے فرمایا اچھا مجھ کو دکھاؤ میرا نام کہاں ہے، حضرت علیؓ نے اُس جگہ پر انگلی رکھ دی، آپؐ نے "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دیا (۱)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا نہیں آتا تھا، اسی بنا پر آپ کو اُمّی کہتے ہیں، یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے، لکھا ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر ابنِ عبداللہ لکھ دیا، بخاری میں چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے اس لئے ایک معرکۃ الآرا مباحثہ بن گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روز مرہ جب نظر سے گذرتا رہتا ہے، تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام سے حرف آشنا ہو جاتا ہے، اس سے اُمیّت میں فرق نہیں آتا، بے شبہ اُمّی ہونا آپؐ کا فخر ہے، اور خود قرآن مجید میں یہ وصف، شرف و عزت کے موقع پر استعمال ہوتا ہے،

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ، (اعراف - ۷: ۱۵۷)

شرائط صلح یہ تھے:

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں،

۲۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین۳ دن قیام کر کے چلے جائیں،

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جلبان (تھیلا وغیرہ) میں،

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں، ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں، اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں،

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے، لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے (۲) تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا،

۶۔ قبائلِ عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک

---

(۱) صحیح بخاری کی اس روایت میں حضرت علیؓ کا نام اور ان کی گفتگو مذکور نہیں، یہ تصریح بخاری کی اُس روایت میں ہے، جو کہ کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء میں مذکور ہے، صحیح مسلم میں بھی یہ واقعہ منقول ہے۔ (۲) یہ تمام شرائط کتبِ سیر کے علاوہ صحیح مسلم (صلح الحدیبیہ) میں بھی ہیں۔

ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں، اتفاق یہ کہ عین اس وقت جب کہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا، سہیل کے صاحبزادے (حضرت ابو جندلؓ) جو اسلام لا چکے تھے، اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا، اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے، اور سب کے سامنے گر پڑے، سہیل نے کہا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے، اس (ابو جندل) کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو"۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "ابھی معاہدہ قلم بند نہیں ہو چکا" سہیل نے کہا "تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا ان کو یہیں رہنے دو، سہیل نے نامنظور کیا، آپؐ نے چند دفعہ اصرار کیا، لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ ہوا، مجبوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرنا پڑا، ابو جندلؓ کو کافروں نے اس قدر مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے، مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا، برادرانِ اسلام! کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں، کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو۔ تمام مسلمان تڑپ اٹھے، حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آئے، اور کہا یا رسول اللہؐ! کیا آپؐ پیغمبرِ برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا "ہاں ہوں"، حضرت عمرؓ نے کہا کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں ہم حق پر ہیں، حضرت عمرؓ نے کہا تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں، آپؐ نے فرمایا "میں خدا کا پیغمبر ہوں، اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا، خدا میری مدد کرے گا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے"۔ حضرت عمرؓ اٹھ کر حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی، حضرت ابو بکرؓ نے کہا وہ پیغمبرِ خدا ہیں، جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں (۱)۔

حضرت عمرؓ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں ان سے سرزد ہوئیں تمام عمر سخت رنج رہا، اور اس کے کفارہ کے لئے انہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی، غلام آزاد کئے۔ بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے، لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ تمام باتیں گنائی ہیں۔

---

(۱) (صحیح بخاری کتاب الشروط) ص "

اس حالت کا گوارا کرنا گو صحابہؓ کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا، ایک طرف (ظاہر میں) اسلام کی توہین ہے، حضرت ابو جندلؓ بیڑیاں پہنے چودہ سو جاں نثاران اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں، سب کے دل جوش سے لبریز ہیں، اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذرا ایما ہو جائے تو تلوار فیصلہ۔قاطع کے لئے موجود ہے، دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں، اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو جندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

یا ابا جندل اصبر واحتسب فان اللہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا و مخرجا انا عقدنا بیننا و بین القوم صلحا و انا لا نغدر بھم (ابن ہشام)	ابو جندل، صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لئے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا، صلح اب ہو چکی، اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔

غرض حضرت ابو جندلؓ کو اسی طرح پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں، لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے، کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا، یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے (۱)، تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے، اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی، انہوں نے کہا آپؐ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں، آپ نے باہر آکر خود قربانی کی اور بال منڈوائے، اب جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا۔

صلح کے بعد تین دن تک آپؐ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا، پھر روانہ ہوئے، تو راہ میں یہ سورہ اتری:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (فتح۔ ۴۸: ۱)	ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی،

تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے، خدا نے اس کو فتح کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے، انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ

(۱) کتاب الشروط ص ۳۸۰

کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ "ہاں" صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو تسکین ہو گئی اور مطمئن ہو گئے (۱)۔ نتائج مابعد نے اس رازِ سربستہ کی عقدہ کشائی کی۔

اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے، اب صلح کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہوئی، خاندان اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے، اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے، باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آتا رہتا تھا، اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسنِ عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا، جو مسلمان مکہ جاتے تھے، ان کی صورتیں یہی مناظر پیش کرتی تھیں، اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچتے آتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ اس معاہدۂ صلح سے لے کر فتحِ مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے، حضرت خالد (فاتحِ شام) اور حضرت عمروؓ بن عاص (فاتحِ مصر) کا اسلام بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

معاہدۂ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے چلا آئے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائے گا، اس میں صرف مرد داخل تھے، عورتیں نہ تھیں، عورتوں کے متعلق خاص یہ آیت اتری:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ۝

(ممتحنہ - ۶۰: ۱۰)

مسلمانو! جب تمہارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو، خدا ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے، اب اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں، تو ان کو کافروں کے ہاں واپس نہ بھیجو، نہ وہ عورتیں کافروں کے قابل ہیں، اور نہ کافر ان عورتوں کے قابل ہیں، اور ان عورتوں پر ان لوگوں نے جو خرچ کیا ہو وہ تم ان کو دے دو اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو، بشرطیکہ ان کے مہر ادا کر دو، اور کافرہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو۔

(۱) صلح حدیبیہ کے واقعات صحیح بخاری میں نہایت تفصیل سے مذکور ہیں، لیکن اصل موقع یعنی غزوات کے ذکر میں نہیں، بلکہ کتاب الشروط میں، اس بنا پر اربابِ سیر کی نگاہ سے یہ واقعات رہ گئے، غزوات میں جستہ جستہ واقعات ہیں، ہم نے ان کو بھی لیا ہے، باقی جزئیات صحیح مسلم اور ابن ہشام سے ماخوذ ہیں۔

جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے، چونکہ کفار ان کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، اس لئے وہ بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے تھے، سب سے پہلے حضرت عتبہؓ بن اسید (ابو بصیر) بھاگ کر مدینہ آئے، قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخص بھیجے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتبہؓ سے فرمایا کہ واپس جاؤ، عتبہؓ نے عرض کی کہ کیا آپؐ مجھ کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ مجھ کو کفر پر مجبور کریں، آپؐ نے ارشاد فرمایا "خدا اس کی کوئی تدبیر نکالے گا"۔ حضرت عتبہؓ مجبوراً دو کافروں کی حراست میں واپس گئے، لیکن مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر انہوں نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، دوسرا شخص جو بچ رہا، اس نے مدینہ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، ساتھ ہی ابو بصیر بھی پہنچے، اور عرض کی کہ آپؐ نے عہد کے موافق اپنی طرف سے مجھ کو واپس کر دیا، اب آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں، یہ کہہ کر مدینہ سے چلے گئے، اور مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے ذومروۃ کے پاس ہے، رہنا اختیار کیا، مکہ کے بے کس اور ستم رسیدہ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ جان بچانے کا ایک ٹھکانا پیدا ہو گیا ہے، تو چوری چھپے بھاگ بھاگ کر یہاں آنے لگے، چند روز کے بعد اچھی خاصی جمعیت ہو گئی، اور اب ان لوگوں نے اتنی قوت حاصل کر لی، کہ قریش کا کاروانِ تجارت جو شام کو جایا کرتا تھا، اس کو روک لیتے تھے، ان حملوں میں جو مالِ غنیمت مل جاتا تھا وہ ان کی معاش کا سہارا تھا۔

قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ بھیجا کہ معاہدہ کی اس شرط سے ہم باز آتے ہیں، اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے، ہم اس سے تعرض نہ کریں گے، آپؐ نے آوارہ وطن مسلمانوں کو لکھ بھیجا کہ یہاں چلے آؤ، چنانچہ ابو جندلؓ اور ان کے ساتھی مدینہ میں آکر آباد ہو گئے، اور کاروانِ قریش کا راستہ (۱) بدستور کھل گیا۔

مستورات میں سے حضرت اُمِ کلثومؓ جو رئیسِ مکہ (عقبہ بن ابی معیط) کی صاحبزادی تھیں، اور مسلمان ہو چکی تھیں، مدینہ ہجرت کر کے آئیں، لیکن ان کے ساتھ ان کے دونوں بھائی عمارہ اور ولید بھی آئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کو واپس دے دیجئے، آپؐ نے منظور نہیں فرمایا، صحابہؓ میں سے جن لوگوں کی ازواج مکہ میں رہ گئی تھیں اور اب تک کافرہ تھیں، صحابہؓ نے ان کو طلاق دے دی۔

---

(۱) یہ تفصیل اکتفاء کلاعی سے خمیس نے نقل کی ہے

☆☆☆☆☆

سلاطین کو اسلام کی دعوت

(آخر) سنہ ۶ھ (یا شروع سنہ ۷ھ)

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ (نحل۔۱۶:۱۲۵)

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن تمام صحابہؓ کو جمع کیا، اور خطبہ دیا، "ایہا الناس! خدا نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، دیکھو حوارئینِ عیسیٰ کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغامِ حق ادا کرو"۔ اس کے بعد آپؐ نے) قیصر روم، شہنشاہ عجم، عزیزِ مصر، اور رؤسائے عرب کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے، جو لوگ خطوط لے کر گئے، اور جن کے نام لے کر گئے، ان کی تفصیل یہ ہے (۱)۔

(حضرت) دحیہؓ کلبی،	قیصرِ روم،
(حضرت) عبداللہؓ بن حذافہ سہمی،	خسرو پرویز کجکلاہِ ایران،
(حضرت) حاطبؓ بن (ابی) بلتعہ	عزیزِ مصر،
(حضرت) عمروؓ بن امیہ،	نجاشی بادشاہِ حبش،
(حضرت) سلیطؓ بن عمر بن عبد شمس،	رؤسائے یمامہ
(حضرت) شجاع بن وہب الاسدی،	رئیس حدود شام، حارث غسانی،

ایرانیوں نے چند برس پہلے بلادِ شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت "غُلِبَتِ الرُّوْمُ" میں ہے، ہرقل نے اس کے انتقام کے لئے بڑے سرو سامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے ان کو سخت شکست دی تھی، اس کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے وہ حمص سے بیت المقدس آیا تھا، اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا، زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھاتے جاتے تھے (۲)۔

---

(۱) طبری (جلد ۳ صفحہ ۱۵۵۹) "س" اور ابن ہشام (باب خروج رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) الی الملوک) "س" (۲) ہرقل کا پورا واقعہ فتح الباری (ج اول ص ۳۱) "س" شرح صحیح بخاری سے لیا گیا ہے، اصل صحیح بخاری (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۳ پر ملاحظہ ہو)

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیر حکومت رہا کرتا تھا، وہ غسانی خاندان تھا، اور اس کا پایۂ تخت بُصریٰ تھا، جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے، اس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسانی تھا، دحیہ کلبی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک یہیں بُصریٰ میں حارث غسانی کو لاکر دیا، اس نے قیصر کے پاس بیت المقدس میں بھیج دیا، قیصر کو خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ، اتفاق یہ کہ ابوسفیان تجارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے، قیصر کے آدمی ان کو غزہ سے جاکر لائے۔

قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا، خود تاج شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا، تخت کے چاروں طرف بطارقہ، قسیس، اور رہبان کی صفیں قائم کیں، اہلِ عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا تم میں سے اس مدعیِ نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا "میں" پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

قیصر	مدعیِ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟
ابوسفیان	شریف ہے،
قیصر	اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعوی کیا تھا؟
ابوسفیان	نہیں،
قیصر	اس خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟
ابوسفیان	نہیں،
قیصر	جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے، وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحب اثر
ابوسفیان	کمزور لوگ ہیں،
قیصر	اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟
ابوسفیان	بڑھتے جاتے ہیں،
قیصر	کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟
ابوسفیان:	نہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۲) (باب کیف کان بدء الوحی و کتاب الجہاد باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الاسلام والنبوۃ میں مکمل واقعہ ہے، زاید تفصیلیں حافظ ابن حجر نے اور کتابوں سے بڑھائی ہیں۔

قیصر	وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے ؟
ابوسفیان	ابھی تک تو نہیں کی، لیکن اب جو نیا معاہدۂ صلح ہے، اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں ؟
قیصر	تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی ؟
ابوسفیان	ہاں،
قیصر	نتیجۂ جنگ کیا رہا ؟
ابوسفیان	کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔
قیصر	وہ کیا سکھاتا ہے ؟
ابوسفیان	کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاک دامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے کہا کہ " تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں، تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے، تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے، تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے، تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے، تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے، تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا، مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، میں اگر وہاں جاسکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا"۔

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خط پڑھا جائے (۱)۔

---

(۱) یہ پوری گفتگو صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے، ابتدائے کتاب میں بھی اور باب الجہاد میں بھی۔

فرمانِ رسالت کے یہ الفاظ تھے :

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم • من محمد عبداللّٰہ و رسولہ الی ھرقل عظیم الروم سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ، اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتک اللّٰہ اجرک مرتین فان تولیت فان علیک اثم الاریسیین ویٰۤاَھۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَ لَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡھَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ • (آل عمران۔ ۳ : ۶۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ محمد کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے، یہ خط ہرقل کے نام ہے، جو روم کا رئیسِ اعظم ہے، اس کو سلامتی ہو، جو ہدایت کا پیرو ہے، اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں، اسلام لا، تو سلامت رہے گا، خدا تجھ کو دگنا اجر دے گا، اور اگر تو نے نہ مانا، تو اہلِ ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا، اے اہلِ کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ، جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں، اور ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے، اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں،

قیصر نے ابو سفیان سے جو گفتگو کی تھی، اس سے بطارقہ اور اہلِ دربار سخت برہم ہو چکے تھے، نامۂ مبارک کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے، یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہلِ عرب کو دربار سے اٹھا دیا، اور گو اس کے دل میں نورِ اسلام آچکا تھا، لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی (۱)۔

---

(۱) مسند ابن حنبل صفحہ ۴، جلد ۴ میں ہے کہ حضرت دحیہؓ کے ساتھ قیصر نے اپنا ایک سفیر خط کا جواب دے کر خدمت نبویؐ میں بھیجا تھا اور سفیر کو نبوت کے چند سوالات بتا دیئے تھے، اس نے سوالات پوچھے، آپؐ نے جوابات دیئے، اور آخر بغیر اسلام لائے وہ واپس گیا، لیکن یہ حدیث صحیح نہیں، اس میں ہے کہ قیصر کا خط پڑھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو بلایا اور انہوں نے پڑھ کر سنایا، حالانکہ وہ اس وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے

(جامع کے نزدیک حسب تحقیق ابن حجر فتح الباری ج ۸ ص ۹۰ و زرقانی ج ۳ ص ۸۸ و ۸۹، یہ واقعہ دوسرا ہے، اور اس کے بعد کا ہے اور خود اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ تبوک کا واقعہ ہے اور غزوۂ تبوک فتحِ مکہ کے بعد رجب سنہ ۹ھ میں پیش آیا ہے، اور حضرت معاویہؓ اس سے ایک یا دو سال پہلے حدیبیہ یا فتحِ مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے، مگر تبوک میں حضرت معاویہؓ کی شرکت کہیں مذکور نہیں، یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب الاموال ابو عبید القاسم بن سلام ص ۲۵۵ مصر میں بھی موجود ہے) س۔

خسرو پرویز (شہنشاہِ ایران) کے نام جو نامۂ مبارک حضرت عبداللہؓ بن حذافہ لے گئے تھے، یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس سلام علی من اتبع الھدیٰ وآمن باللہ ورسولہ وشھد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ الی الناس کافۃ لینذر من کان حیا اسلم تسلم فان ابیت فعلیک اثم المجوس،	خدائے رحمن ورحیم کے نام سے، محمد پیغمبر کی طرف سے کسریٰ (رئیسِ فارس) کے نام، سلام ہے، اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور پیغمبرِ خدا پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ خدا نے مجھ کو تمام دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے، تو اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا، ورنہ مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

خسرو پرویز بڑی شوکت و شان کا بادشاہ تھا، اس کی سلطنت میں دربار کو جو عظمت و جلال حاصل ہوا کبھی نہیں ہوا تھا، عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے، ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا، نامۂ مبارک میں پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام تھا، خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا، اور بولا کہ "میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے" پھر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا، لیکن چند روز کے بعد خود سلطنتِ عجم کے پرزے اڑ گئے۔

نظامی نے شیریں خسرو میں یہ داستان مفصل لکھی ہے، اور اسلامی جوش سے لکھی ہے، ہم اس کے چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

دران دوران کہ گیتی ام او بود (۱)	زمشرق تا بہ مغرب نامِ او بود
رسولِ ما بہ حجت ہاے قاہر	نبوت در جہان می کرد ظاہر
گہے باسنگِ خارا راز می گفت	گہے ریگش حکایت بازمی گفت
خلائق راز دعوت جام درداد	بہ ہر کشور صلاے عام در داد
بفرمود از عطا عطرے سرشتند	بہ نامِ ہر یکے، سطرے نوشتند
چو از نامِ نجاشی باز پرداخت	زمہرِ نامِ خسرو نامہ ساخت

(۱) اس سے خسرو مراد ہے۔

چو قاصد عرضہ کرد آن نامۂ نو	بجوشید از غضب اندامِ خسرو
ز تیزی گشت ہر مویش سنانی	زگرمی ہر رگش آتش فشانی
سوادے دید روشن ہیبت انگیز	نوشتہ از محمدؐ سوے پرویز
چو عنوان گاہِ عالم تاب را دید	تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید
غرورِ بادشاہی بردش از راہ	کہ گستاخی کہ یارد؟ با چو من شاہ
کرا زہرہ کہ با این احترام	نویسد نامِ خود بالاے نام
رخ از گرمیِ چو آتش گاہ خود کرد	بخود اندیشۂ بد کرد، و بدکرد
درید آن نامۂ گردن شکن را	نہ نامہ بلکہ نامِ خویشتن را
فرستادہ چو دید آن خشم ناکی	بہ رجعت پاے خود را کرد خاکی
آزان آتش کہ آن دود تہی داشت	چراغِ آگہان (۱) را آگہی داشت
زگرمی آن چراغِ گردن افراز	دعا را داد چون پروانہ پرواز
قلم راز ان دعا کسریٰ در افتاد	کلاہ از تارک کسریٰ در افتاد
زہے شاہنشہے کز بیم و امید	قلم را ندہ برا فریدون جمشید،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنرِ یمن کو جس کا نام باذان تھا، فرمان بھیجا کہ کسی شخص کو حجاز بھیجو کہ اس مدعیِ نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے۔ باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرہ تھا، مدینہ منورہ روانہ کیا۔ ان دونوں نے بارگاہ رسالت میں آکر عرض کی کہ شاہنشاہ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے۔ اگر تعمیلِ حکم نہ کرو گے تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کر دے گا۔ آپؐ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور کہہ دینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی (۲) یہ لوگ پیغام پہنچا کر یمن میں آئے تو خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے خسرو پرویز کو قتل کر ڈالا۔

نجاشی (بادشاہِ حبش) کو آپؐ نے دعوتِ اسلام کا جو خط بھیجا تھا، اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے سچے پیغمبر ہیں"۔

(۱) آگہان یعنی اربابِ علم چراغِ آگہان سے "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" مراد ہیں۔ "آگہی داشت" یعنی خبر کی۔
(۲) طبری (جلد ۳) صفحہ ۱۵۷۲۔

حضرت جعفرؓ طیار جو ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے، یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام کی۔ ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں عرضِ نیاز کے لئے بھیجا، لیکن جہاز سمندر میں ڈوب گیا۔ اور یہ سفارت ہلاک ہو گئی (۱)۔

عام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے سنہ ۹ ھ میں وفات پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف رکھتے تھے، اور یہ خبر سن کر آپؐ نے غائبانہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھائی، لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح مسلم میں تصریح کی ہے کہ جس نجاشی کی نماز جنازہ آپؐ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا (لیکن ابن قیمؒ نے اربابِ سیر کی روایت کی تائید کی ہے اور مسلم کی روایت کے اس ٹکڑے کو راوی کا وہم بتایا ہے) (۲)۔

جو لوگ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے، ان میں حضرت امِ حبیبہؓ (حضرت امیر معاویہؓ کی بہن) بھی تھیں، ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو لکھ بھیجا کہ امِ حبیبہ کو شادی کا پیغام سنا دو، اور میرے پاس بھیج دو۔ نجاشی نے خالدؓ بن سعید بن العاص کو مقرر کیا، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایجاب و قبول ادا کیا، نجاشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مہر ادا کیا، جس کی تعداد چار سو اشرفیاں تھیں، نکاح کے بعد حضرت امِ حبیبہؓ جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں، اور مدینہ کے بندر گاہ میں اتریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خیبر میں تشریف رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نجاشی کے حالات حضرت امِ حبیبہؓ سے پوچھا کرتے تھے (۳)۔

عزیزِ مصر (مقوقس) کو آپؐ نے جو خط لکھا تھا، اس کے جواب میں اس نے عربی زبان میں یہ خط لکھا۔

لمحمد بن عبداللہ من المقوقس	محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس رئیسِ قبط کی طرف سے
عظیم القبط سلام علیک اما	سلام علیک کے بعد، میں نے آپ کا خط پڑھا، اور اس
بعد فقد قرأت کتابک و فهمت ما	کا مضمون اور مطلب سمجھا، مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ
ذکرت فیه وما تدعوا الیه وقد	ایک پیغمبرؐ آنے والے ہیں، لیکن میں یہ سمجھا تھا

(۱) طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۶۹۔ (۲) (زاد المعاد) ''س''۔ (۳) تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۷۰ ''س''۔

علمت ان نبیا بقی و کنت اظن ان	کہ وہ شام میں ظہور کریں گے میں نے آپؐ
یخرج من الشام وقد اکرمت سولک	کے قاصد کی عزت کی، اور دو لڑکیاں (۱)
وبعثته الیک بجاریتین لهما مکان	بھیجتا ہوں جن کی قبطیوں میں (مصر کی قوم)
من القبط عظیم و کسوة واهدیت	بہت عزت کی جاتی ہے اور میں آپؐ کے
الیک بغلة لترکبها والسلام علیک	لئے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھیجتا ہوں۔

با ایں ہمہ عزیزِ مصر اسلام نہیں لایا۔ دو لڑکیاں جو بھیجی تھیں، ان میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں، جو حرمِ نبویؐ میں داخل ہوئیں، اور دوسری سیرین تھیں۔ جو حضرت حسانؓ کے ملک میں آئیں، خچر کا نام دلدل تھا۔ جس کا ذکر اکثر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے۔ جنگِ حنین میں آپؐ اسی پر سوار تھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت حاطبؓ بن بلتعہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس کے پاس خط دے کر بھیجا تھا۔ ان کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمتِ نبویؐ میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں۔ اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ یہ خاتونیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا۔ نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپؐ کے حرم میں آئیں۔

(رؤسائے عرب کو جو خط لکھے گئے تھے، ان کے بھی جواب مختلف آئے، ہوذہ بن علی رئیسِ یمامہ نے لکھا، تم جو باتیں کہتے ہو وہ نہایت اچھی ہیں، اگر حکومت میں کچھ میرا بھی حصہ ہو تو میں تمہاری اقتداء کے لئے تیار ہوں، اسلام ہوسِ ملک کے لئے نہیں آیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا "زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو میں نہ دوں گا"۔

حارث غسانی جو حدودِ شام کا رئیس تھا، اور رومیوں کے ماتحت اطراف کے عربوں میں حکومت کرتا تھا، خط پڑھ کر برہم ہوا اور فوج کو تیاری کا حکم دیا، مسلمان اس جرم کی پاداش میں ہر وقت اس کے حملہ کے منتظر رہتے تھے، اور آخر موتہ اور تبوک وغیرہ کی لڑائیاں (۲) پیش آئیں)۔

---

(۱) ہم نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے۔ عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں، اور لونڈی کو بھی، اور باب سیرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں، لیکن مقوقس نے، جو لفظ ان کی نسبت لکھا ہے۔ یعنی کہ "مصریوں میں، بڑی عزت ہے" یہ لونڈیوں کی شان میں استعمال نہیں کئے جا سکتے (۲) (اور جن رؤسائے قبائل اور امرائے عرب کو دعوتی خطوط لکھے گئے تھے، ان کی تفصیل دوسری جلد کے تبلیغی واقعات میں آئے گی) "س"

واقعاتِ متفرقہ حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص کا اسلام

(حدیبیہ کی صلح کو خدا نے فتح کہا ہے، لیکن اجسام کی نہیں، قلوب کی، اسلام کو اپنی اشاعت کے لئے امن درکار تھا، اور وہ اس صلح سے حاصل ہو گیا، اس صلح کو خود دشمن بھی فتح سمجھتے تھے، قریش اور مسلمانوں میں اب تک جو معرکے ہوئے ان میں قریش کی صف میں ہر جگہ فوجی حیثیت سے خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے، زمانۂ جاہلیت میں رسالہ کی افسری ان ہی کے سپرد تھی، اُحد میں قریش کے اکھڑے ہوئے پاؤں ان ہی کی کوشش سے سنبھلے تھے، حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش کا طلایہ ان ہی کی زیرِ افسری نظر آیا تھا، لیکن قریش کا یہ سپہ سالارِ اعظم بھی آخر اسلام کے حملۂ کاری سے بچ نہ سکا۔

صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالدؓ نے مکہ سے نکل کر مدینہ کا رخ کیا، راستہ میں حضرت عمروؓ بن العاص ملے، پوچھا کدھر کا قصد ہے؟ بولے اسلام لانے جاتا ہوں، آخر کب تک؟ حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا میرا بھی یہی ارادہ ہے، دونوں صاحب ایک ساتھ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے (۱)، اور اب وہ جوہر جو اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا، اسلام کی محبت میں صرف ہونے لگا۔

فتحِ مکہ میں حضرت خالدؓ جب ایک مسلمان دستہ کے افسر بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گذرے تو آپؐ نے پوچھا کون ہے؟ لوگوں نے کہا خالدؓ ہیں، آپؐ نے فرمایا "خدا کی تلوار ہے" (۲)۔

غزوۂ موتہ میں جب حضرت جعفرؓ، زیدؓ بن حارثہ، اور عبداللہؓ بن رواحہ کے بعد حضرت خالدؓ نے علم اپنے ہاتھ میں لیا تو مسلمان خطرہ سے باہر تھے۔

عہد خلافت میں ایک (خالدؓ) نے شام کا ملک قیصر سے چھین لیا، اور دوسرا (عمروؓ بن العاص) مصر کا فاتح ہوا)۔

---

(۱) اصابہ ابن حجر بہ روایت ابن اسحاق (ج اول ص ۳۱۳) س ۸ھ۔ (۲) ترمذی، مناقب۔

سنہ ۷ھ

خیبر

آخر سنہ ۶ھ یا اوائل سنہ ۷ھ

خیبر غالباً عبرانی لفظ ہے، جس کے معنی قلعہ کے ہیں، یہ مقام مدینہ منورہ سے آٹھ منزل پر ہے، یورپین سیاحوں میں ڈاوٹی کئی مہینہ تک یہاں ۱۸۷۷ء میں مقیم رہا، اس نے مدینہ سے اس مقام کا فاصلہ ۲۰۰ میل لکھا ہے (۱) وہ نخلستان جس کے کنارہ پر خیبر ہے، نہایت زرخیز ہے، یہاں یہود نے نہایت مضبوط متعدد قلعے بنائے تھے، جن میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں۔

عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا، مدینہ سے جب رؤسائے بنونضیر جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے، تو انھوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پر برانگیختہ کر دیا، جس کا پہلا مظہر احزاب کا معرکہ تھا، ان رؤساء میں سے حیئ بن اخطب جنگِ قریظہ میں قتل ہوا، جس کے بعد ابو رافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا، یہ بہت بڑا تاجر اور صاحبِ اثر تھا، قبیلۂ غطفان جو عرب کا بہت بڑا صاحبِ اثر قبیلہ تھا، ان کی آبادی خیبر سے متصل تھی، اور ہمیشہ سے یہودِ خیبر کے حلیف اور ہم عہد تھے (۲)، سنہ ۶ھ میں سلام نے خود جا کر قبیلہ غطفان اور ان کے آس پاس کے قبیلوں کو اسلام کے مقابلہ کے لئے آمادہ کیا، یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج لے کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں (۳) کیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں معلوم ہوئیں تو آپؐ کے ایماء سے (رمضان سنہ ۶ھ میں حضرت عبداللہؓ بن عتیک ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ سے اپنے قلعہ خیبر میں سوتا ہوا مارا گیا) سلام کے بعد یہودیوں نے اُسیر بن رزام کو مسندِ ریاست پر بیٹھایا، اس نے قبائلِ یہود کو جمع کر کے

---

(۱) مارگولوس صفحہ ۳۵۶۔ (۲) ابن خلدون جلد ۲ ذکر قبائلِ عرب (و تاریخِ خمیس جلد ۲ ص ۴۴ باب غزوۂ خیبر) "س"۔

(۳) ابن سعد ص ۶۶۔ اصلی الفاظ یہ ہیں:۔

کان ابو رافع بن ابی الحقیق قد اجلب فی غطفان و من حوله من مشرکی العرب و جعل لهم الحفل العظیم لحرب رسول اللّٰہ

(ابو رافع نے غطفان اور آس پاس کے مشرکینِ عرب کو جنگ پر آمادہ کیا تھا اور ایک بہت بڑی بھیڑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جمع کی۔)

(صحیح بخاری باب قتل ابی رافع میں ہے و کان ابو رافع یوذی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و یعین علیہ یعنی ابو رافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچایا کرتا تھا، اور آپؐ کے دشمنوں کو آپؐ کے مقابلہ میں مدد دیا کرتا تھا، اس امداد و اعانت کی تفصیل بہ روایت عروہ فتح الباری (جلد ۷ ص ۳۶۳) "س" میں مفصل مذکور ہے۔

تقریر کی، اور کہا کہ "میرے پیشرووں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں جو تدبیریں اختیار کیں وہ غلط تھیں، صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دارالریاست پر حملہ کیا جائے، اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا" (۱)۔ اس غرض سے اُسیر نے غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کیا، اور ایک فوج گراں تیار کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے اس افواہ پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا کہ خود خیبر جاکر اصل واقعہ کی تحقیق کریں، چنانچہ وہ چند آدمیوں کو لے کر خیبر گئے، اور چھپ کر خود اُسیر کی زبانی اس کے مشورے اور تدبیریں سنیں، یہ حالات آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیے، آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو ۳۰ آدمی دے کر خیبر کو روانہ کیا، ان لوگوں نے اُسیر سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ تم اگر حاضر ہو جاؤ تو خیبر کی حکومت تم کو دے دی جائے، چنانچہ وہ ۳۰ آدمی لے کر خیبر سے نکلا، اور احتیاط کی بنا پر یہ مخلوط قافلہ اس طرح چلا کہ دو دو شخص ہم رکاب چلتے تھے، جن میں ایک یہودی دوسرا مسلمان ہوتا تھا، قرقرہ پہنچ کر اُسیر کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی، اس نے ہاتھ بڑھا کر حضرت عبداللہؓ بن انیس کی تلوار چھیننی چاہی، انہوں نے کہا او دشمنِ خدا! بدعہدی کرنی چاہتا ہے (۲)، یہ کہہ کر سواری بڑھائی، اور جب اُسیر زد پر آگیا تو تلوار ماری کہ اس کی ران کٹ گئی، وہ گھوڑے سے گرا، گرتے گرتے اس نے حضرت عبداللہؓ کو زخمی کیا، اب مسلمان پیش دستی کرکے یہود پر ٹوٹ پڑے، نتیجۂ جنگ یہ تھا کہ یہود میں ایک کے سوا کوئی نہیں بچا، یہ اخیر سنہ ۶ یا محرم سنہ ۷، کا واقعہ ہے۔

خیبر اب اسلام کا سب سے بڑا حریف اور اسلام کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھا، ان لوگوں نے مکہ جاکر قریش کے ذریعہ سے تمام عرب میں بغاوت کی ایک عالمگیر جنبش پیدا کردی، جس نے واقعۂ احزاب میں مرکزِ اسلام (مدینہ منورہ) کو متزلزل کردیا تھا، یہ کوشش اگرچہ ناکام رہی، لیکن جو دست و بازو کام کر رہے تھے اب بھی موجود تھے۔

جن لوگوں نے جنگِ احزاب برپا کرائی تھی، ان میں زیادہ بااثر ابن ابی الحقیق کا خاندان تھا، جو قبیلۂ بنی نضیر سے تھا، اور مدینہ سے جلاوطن ہوکر آیا تھا، اس نے خیبر کے مشہور قلعہ قموص

---

(۱) (زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۱۹۶ مصر) "س" (۲) یہ تمام واقعہ طبقات ابن سعد سے منقول ہے، بہت سی کتابوں میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن انیس نے خود ابتدا کی، اور اُسیر بن رزام کو قتل کر ڈالا لیکن صحیح واقعہ وہی ہے، جو ابن سعد سے منقول ہے اور وہی اس معرکہ کی وجہ ہوسکتا ہے ۱۲۔

پر قبضہ کیا تھا۔ سلام بن ابی الحقیق جس کا ذکر ابھی اوپر گذر چکا ہے، اسی خاندان کا رئیس تھا، اس کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق خاندان کی ریاست پر ممتاز ہوا۔

خیبر کے یہود ادھر تو غطفان سے اسلام کے مقابلہ کے لئے سازش کر رہے تھے، ادھر مدینہ کے منافقین ان کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے اور ان کو ہمت دلاتے تھے کہ مسلمان تم سے سربر نہیں ہو سکتے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چاہا کہ ان لوگوں سے معاہدہ ہو جائے۔ اس بنا پر آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا تھا، لیکن ادھر تو یہود خود سخت دل، اور ایک بدگمان قوم تھی۔ ادھر منافقین ان کو ابھارتے تھے، اسی زمانہ میں رأس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے اہلِ خیبر کے پاس کہلا بھیجا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن تم ان سے نہ ڈرنا، ان کی ہستی کیا ہے۔ مٹھی بھر آدمی ہیں جن کے پاس ہتھیار تک نہیں، یہود نے یہ سن کر کنانہ اور ہودہ بن قیس کو غطفان کے پاس بھیجا کہ ہمارے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرو، تو ہم نخلستان کی نصف پیداوار تم کو دیں گے (ایک روایت میں ہے کہ) غطفان نے اس کو منظور کیا (۱)۔

غطفان کا ایک قوت ور قبیلہ بنو فزارہ تھا، ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ خیبر والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، تو وہ خود خیبر میں آئے کہ ہم تمہارے شریک ہو کر لڑیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا تو آپؐ نے بنو فزارہ کو خط لکھا کہ تم خیبر والوں کی مدد سے باز آؤ، خیبر فتح ہو جائے گا تو تم کو بھی حصہ دیا جائے گا، لیکن بنو فزارہ نے انکار کیا (۲)۔

ذی قرد محرم سنہ ۷ھ

غطفان کی شرکت جنگ کا دیباچہ یہ تھا کہ ذی قرد کی چراگاہ پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنیوں کا چراگاہ تھا، (اس قبیلہ کے چند آدمیوں نے بہ سرداری عبدالرحمن بن عیینہ) چھاپا مارا، اور ۲۰ اونٹنیاں

(۱) تاریخ خمیس (ج ۲ ص ۴۳) عام روایتوں میں گو یہ ہے کہ غطفان نے مسلمانوں کے خوف سے اس کو منظور نہیں کیا، تاہم یہ ظاہر ہے کہ ان کی اس ناظرف داری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا) "س" (۲) یہ واقعہ معجم البلدان لفظ جنفاء کے ذیل میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بالفاظہا نقل کیا ہے، اصل الفاظ یہ ہیں:۔

روی موسیٰ بن عقبۃ عن ابن شھاب قال کانت بنو فزارۃ ممن قدم علی اھل خیبر لیعینوھم۔ فراسلھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا یعینوھم وسالھم ان یخرجوا عنھم، " الخ
جلد ۳ ص ۱۵۲ (مصر)

پکڑ کر لے گئے، حضرت ابوذرؓ کے صاحبزادے کو جو اونٹنیوں کی حفاظت پر متعین تھے، قتل کر دیا، اور ان کی بیوی کو گرفتار کر کے لے گئے (مسلمانوں نے جب تعاقب کیا تو وہ درہ میں گھس گئے وہاں) عیینہ بن حصن جو قبائلِ غطفان کا سپہ سالار تھا، (ان کی امداد کو موجود تھا) مسلمانوں میں حضرت سلمہؓ بن الاکوع ایک مشہور قدر انداز صحابی تھے، سب سے پہلے ان کو اس غارت گری کی خبر معلوم ہوئی، انہوں نے واصباحاہ کا نعرہ مارا اور دوڑ کر حملہ آوروں کو جالیا، وہ اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے، سلمہؓ نے تیر برسانے شروع کئے، حملہ آور بھاگ نکلے، انہوں نے تعاقب کیا، اور لڑ بھڑ کر تمام اونٹنیاں چھڑا لائے، دربارِ نبوت میں آکر عرض کی کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ کر آیا ہوں اگر سو آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کر لاتا ہوں، آپؐ نے رحمتِ عام کے لحاظ سے فرمایا (۱):

ملکت فاسجح — قابو پاؤ تو عفو سے کام لو۔

اس واقعہ کے تین دن (۲) بعد خیبر کی جنگ پیش آئی۔

خیبر کا آغاز اور غزوات کی بہ نسبت ایک امتیاز خاص رکھتا ہے، اور اگرچہ اربابِ سیر کی نظر اس نکتہ پر نہیں پڑی، کہ اس امتیاز کے اسباب کیا تھے؟ تاہم واقعہ کی حیثیت سے امتیازی امور ان کی زبان سے بھی بلاقصد نکل گئے ہیں، سب سے مقدم یہ کہ جب آپؐ نے خیبر کا قصد کیا تو اعلانِ عام کر دیا کہ

لا یخرجن معنا الا راغب فی الجہاد (ابن سعد) — ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ آئیں جو طالبِ جہاد ہوں،

اب تک جو لڑائیاں وقوع میں آئیں محض دفاعی تھیں، یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے، اور طرزِ حکومت کی بنیاد قائم ہوئی، اسلام کا اصلی مقصد تبلیغِ دعوت ہے، اب اگر

---

(۱) یہ واقعہ بخاری و مسلم میں بھی مذکور ہے، لیکن زیادہ تفصیل ابن سعد و ابن اسحاق سے لی گئی ہے۔ (۲) اربابِ سیر نے متفقاً اس واقعہ کو خیبر کے واقعہ سے ایک سال ماقبل بیان کیا ہے، لیکن (طبری نے بہ روایت سلمہ جو اس غزوہ کے ہیرو تھے اور نیز) امام بخاریؒ نے صاف تصریح کی ہے کہ خیبر سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے، حافظ ابن حجر نے اربابِ سیر کا بیان لکھ کر لکھا ہے:

فعلی ھذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوۃ ذی قرد اصح مما ذکرہ اھل السیر — تو اس بنا پر جو کچھ صحیح بخاری میں غزوۂ ذی قرد کے متعلق مذکور ہے وہ اربابِ سیر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔

حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ عیینہ بن حصن نے ذو قرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا، عام اربابِ سیر جس کا ذکر کرتے ہیں، وہ پہلا حملہ تھا، اور یہ بالکل قرینِ قیاس ہے (فتح الباری جلد، صفحہ ۳۵۲ باب غزوۂ ذی قرد) (۳) عام اربابِ سیر کو غزوۂ خیبر (بلکہ تمام غزوات) کے متعلق چونکہ کسی سبب کی تلاش و جستجو نہیں، اس لئے ان کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ واقعات کا تسلسل اور غزوات کے اسباب کیا ہیں، لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

کوئی قوم اس دعوت کی سدِ راہ نہ ہو تو اسلام کو نہ تو اس سے جنگ ہے، نہ اس کے رعایا بنانے کی ضرورت ہے، صرف معاہدۂ صلح کافی ہے، جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں، لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کو مدافعت کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے، اور اس کو اپنے زیرِ اثر رکھنا پڑتا ہے، خیبر اس قاعدہ کے موافق اسلام کا پہلا مفتوحہ ملک تھا۔

غزوات کے خاتمہ کے بعد یہ بحث بہ تفصیل آئے گی کہ ایک مدت تک لوگ (۱) جہاد کو عرب کے قدیم طریقہ کے موافق معاش کا ذریعہ سمجھتے رہے، اس لڑائی (خیبر) تک بھی یہ غلط فہمی رہی۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا، اور اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس لڑائی میں صرف وہ لوگ شریک ہوں جن کا مقصد محض جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔

غرض آپؐ غطفان اور یہود کے حملہ کی مدافعت کے لئے مدینہ سے محرم سنہ ۷ھ (۲) میں حضرت سباع بن عرفطہ غفاریؓ کو مدینہ کا افسر مقرر کر کے مدینہ سے روانہ ہوئے، ازواج مطہراتؓ میں سے حضرت ام سلمہؓ ساتھ تھیں، فوج کی تعداد ۱۶۰۰ تھی، جن میں ۲۰۰ سوار، اور باقی پیدل تھے، اس وقت تک لڑائیوں میں علم کا رواج نہ تھا، چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہوتی تھیں، یہ پہلا مرتبہ تھا کہ آپؐ نے تین علم تیار کرائے، دو حضرت حبابؓ بن منذر، اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو عنایت ہوئے اور خاص علمِ نبویؐ جس کا پھریرا حضرت عائشہؓ کی چادر سے تیار ہوا تھا، جناب امیرؓ کو مرحمت ہوا، فوج جب روانہ ہوئی تو حضرت عامر بن الاکوع (جو مشہور شاعر تھے، یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے:

اللھم لو لا انت ما اھتدینا	اے خدا اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے
و لا تصدقنا و لا صلینا	نہ خیرات کرتے، نہ نماز پڑھتے،

(۱) یہاں ملوگ - سے مراد منافقین ہیں، یہ لوگ غزوات میں محض غنیمت کے لالچ میں شریک ہوتے تھے، جہاں سخت مقابلہ پیش آنے اور مالِ غنیمت کے نہ ملنے کا گمان ہوتا وہاں غزوات کی شرکت سے کتراتے تھے چنانچہ ان ہی وجوہ سے وہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے اور اس پر سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی ناراضی ظاہر فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ آئندہ غنیمت والے غزوہ میں بھی وہ شریک نہ کئے جائیں، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اعلان فرما دیا کہ اس غزوہ میں کہ وہی شرکت کا ار... کریں جن کی غرض محض جہاد و اعلائے کلمۃ اللہ ہو، دنیاوی مال و متاع نہ ہو (زرقانی و ابن سعد باب غزوۂ خیبر) "س" (۲) (ابن سعد جزو مغازی ص ۷۷ میں جمادی الاولیٰ سنہ ۷ھ ہے، جو بہ تحقیق مذکورہ بالا صحیح نہیں) "س"

فاغفر فداء لک ما اتقینا	ہم تجھ پر فدا ہوں، ہم جو احکام نہیں بجالائے ان
والقین سکینۃ علینا	کو معاف کر دے اور ہم پر تسلی نازل کر، ہم
انا اذا صیح بنا اتینا	جب فریاد میں پکارے جاتے ہیں تو پہنچ
وثبت الاقدام ان لاقینا	جاتے ہیں اور جب مڈبھیڑ ہو تو ہم کو ثابت
وبالصیاح عولوا علینا	قدم رکھ، لوگوں نے پکار کر ہم سے استغاثہ چاہا ہے،

یہ اشعار صحیح (مسلم و) بخاری میں نقل کئے ہیں، مسند ابن حنبل میں بعض اشعار (۱) زیادہ ہیں (پہلے دو مصرعے کسی قدر اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم (خیبر) میں بھی ہیں۔

ان الذین قد بغوا علینا	جن لوگوں نے ہم پر دست درازی کی ہے، جب وہ
اذا ارادوا فتنۃ ابینا	کوئی فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان سے دبتے
ونحن عن فضلک ما استغنینا	نہیں اور اے خدا ہم تیری عنایت سے بے نیاز نہیں،

راہ میں ایک میدان آیا، صحابہؓ نے تکبیر کے نعرے بلند کئے، چونکہ تعلیم و تلقین کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا، اور بات بات میں نکات شریعت کی تعلیم ہوتی رہتی تھی، ارشاد ہوا کہ آہستہ، کیوں کہ کسی بہرے اور دور از نظر کو نہیں پکار رہے ہو، تم جس کو پکارتے ہو، وہ تمہارے پاس ہی ہے (۲)۔

اس غزوہ میں چند خاتونین بھی اپنی خواہش سے فوج کے ساتھ ہو لی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ان کو بلا بھیجا، اور غضب کے لہجہ میں فرمایا "تم کس کے ساتھ آئیں، اور کس کے حکم سے آئیں"۔ بولیں کہ "یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس لئے آئے ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گے، اور اس کام میں مدد دیں گے، ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوائیں بھی ہیں، اس کے علاوہ ہم تیر اٹھا کر لائیں گے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم کیا تو ان کا بھی حصہ لگایا، لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زرو جواہر نہ تھے، مال و اسباب نہ تھا، درہم و دینار نہ تھے، بلکہ صرف کچھ کھجوریں تھیں، تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا، اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا تھا۔

یہ واقعہ ابوداؤد (باب فی المرأۃ والعبد یحذمان من الغنیمۃ) میں مذکور ہے، حدیث اور

---

(۱) ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ تعدی اور ظلم کی ابتداء دشمنوں کی طرف سے تھی، اشعار کے بعض بعض الفاظ میں روایت کا اختلاف ہے (۲) صحیح بخاری غزوۂ خیبر۔

سیرت کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر غزوات میں مستورات ساتھ رہتی تھیں، جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی، اور پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں، جنگِ اُحد میں حضرت عائشہؓ کا مشک میں پانی بھر بھر کر لانا اور زخمیوں کو پلانا اوپر گذر چکا ہے، لیکن یہ امر کہ عورتیں میدانِ جنگ سے تیر اٹھا اٹھا کر بھی لاتی، اور مجاہدین کو دیتی تھیں صرف ابو داؤد نے ذکر کیا ہے، لیکن سندِ صحیح متصل سے ذکر کیا ہے، اس لئے شک کی گنجائش نہیں، یوں بھی عرب کی مستورات سے کم سے کم یہی توقع کی جا سکتی ہے۔

چونکہ معلوم تھا کہ غطفان اہلِ خیبر کی مدد کو آئیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامِ رجیع میں فوجیں اتاریں جو غطفان اور خیبر کے بیچ میں ہے، اسبابِ باربرداری، خیمہ و خرگاہ اور مستورات یہاں چھوڑ دی گئیں (۱)، اور فوجیں خیبر کی طرف بڑھیں، غطفان یہ سن کر کہ اسلامی فوجیں خیبر کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہتھیار سج کر نکلے، لیکن آگے بڑھ کر جب ان کو معلوم ہوا کہ خود ان کا گھر خطرہ میں ہے تو واپس چلے گئے (۲)۔

خیبر میں چھ قلعے تھے، سلالم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق، مربطہ اور جیسا کہ یعقوبی نے تصریح کی ہے، ان میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے، ان سب میں قموص نہایت مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا، مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا، اسی قلعہ کا رئیس تھا (۳)، ابن ابی الحقیق کا خاندان جس نے مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی یہیں رہتا تھا۔

لشکرِ اسلام جب خیبر کے قریب یعنی مقامِ صہبا میں پہنچا تو نمازِ عصر کا وقت آ چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ٹھہر کر نمازِ عصر ادا کی، پھر کھانا طلب فرمایا، رسد کا ذخیرہ صرف ستو تھا، وہی آپؐ نے بھی پانی میں گھول کر نوش فرمایا (۴)، رات ہوتے ہوتے فوجِ اسلام خیبر کے سواد میں پہنچ گئی، عمارتیں نظر آئیں تو آپؐ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ، پھر خدا کا نام لے کر یہ دعا مانگی:

---

(۱) یہ تفصیل معجم البلدان (ج ۴ ص ۲۲۹) ذکرِ رجیع میں ہے۔ (۲) طبری ج ۳ ص ۱۵۷۵۔ اصل عبارت یہ ہے، فبلغنی ان غطفان لما سمعت بمنزلِ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خیبر جمعوا لہ ثم خرجوا لیظاھروا یہود علیہ اذا ساروا الخ ۔ (۳) تاریخ یعقوبی (جلد ۲ ص ۵۶)۔ (۴) صحیح بخاری۔

انا نسئلک خیر هذه القریة	اے خدا! ہم تجھ سے اس گاؤں کی اور گاؤں
وخیر اهلها وخیر ما فیها	والوں کی اور گاؤں کی چیزوں کی بھلائی چاہتے
ونعوذبک من شرها وشر	ہیں اور ان سب کی برائیوں سے پناہ
اهلها وشر مافیها (ابن ہشام)	مانگتے ہیں۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ آپؐ کا معمول عام تھا، یعنی جب کسی مقام میں داخل ہوتے تھے، تو پہلے دعا مانگ لیتے تھے، چونکہ سنتِ نبویؐ یہ تھی کہ رات کو کسی مقام (۱) پر حملہ نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے رات یہیں بسر کی، صبح کو خیبر میں داخلہ ہوا، یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام میں پہنچا دیا، رسد اور غلہ قلعۂ ناعم میں یک جا کیا، اور فوجیں قلعۂ نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں، سلام بن مشکم نضری بیمار تھا، تاہم اس نے سب سے زیادہ حصہ لیا، اور خود قلعۂ نطاۃ میں آکر فوج میں شرکت کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود جنگ نہ تھا، لیکن جب یہود نے بڑے سر و سامان کے ساتھ جنگ کی تیاری کی، تو آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے وعظ فرمایا، اور جہاد کی ترغیب دی، تاریخ خمیس میں اس موقع پر لکھا ہے:

ولما تیقن النبی صلی اللہ علیہ وسلم	اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین
ان الیهود تحارب، وعظ اصحابه	ہو گیا، کہ یہود لڑنے پر آمادہ ہیں تو آپؐ نے
ونصحهم وحرضهم علی الجهاد	صحابہؓ کو نصیحت کی، اور جہاد کی ترغیب دی،

سب سے پہلے قلعۂ ناعم پر فوجیں بڑھیں، حضرت محمودؓ بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا، اور دیر تک لڑتے رہے، لیکن چونکہ سخت گرمی تھی، تھک کر دم لینے کے لئے قلعہ کی دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے، کنانہ بن الربیع نے قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ ان کے سر پر گرایا جس کے صدمہ سے وفات پائی، لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا (۲)۔

ناعم کے بعد اور قلعے بآسانی فتح ہوتے گئے۔ لیکن قلعۂ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا، اس مہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو بھیجا، لیکن دونوں ناکام واپس آئے،

---

(۱) صحیح بخاری میں اصل عبارت یہ ہے:۔ اذا اتی قوما بلیل لم یغز بهم حتی یصبح باب غزوۃ خیبر، (۲) ابن ہشام نے دو موقعوں پر اس واقعہ کا الگ ٹکڑا لکھا ہے، یہ تفصیل خمیس سے لی گئی ہے۔

طبری میں روایت ہے کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے، تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہ جم سکے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی کی، لیکن فوج نے ان کی نسبت خود یہی شکایت کی۔

اس روایت کو طبری نے جس سلسلہ سند سے نقل کیا ہے اس کے راوی عوف ہیں ان کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے، لیکن بندار جب ان کی روایت بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ "وہ رافضی اور شیطان تھا"۔ یہ لفظ بہت سخت ہے، لیکن ان کی شیعیت سب کو تسلیم ہے اور گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمرؓ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے، شیعہ کی زبان سے اس روایت کا رتبہ کیا رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں، جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، لیکن محدثین کو اس بات میں شبہہ ہے کہ ان کی جو روایتیں باپ کے سلسلہ سے منقول ہیں صحیح بھی ہیں یا نہیں۔

تاہم اس قدر ضرور صحیح ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہؓ بھیجے گئے تھے، لیکن فتح کا قرعہ کسی اور کی قسمت میں تھا، جب مہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "کل میں اس شخص کو علم دوں گا، جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا، اور جو خدا اور خدا کے رسول کو چاہتا ہے، اور خدا اور خدا کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں" (۱)۔ یہ رات نہایت امید اور انتظار کی رات تھی، صحابہؓ نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی کہ دیکھئے یہ تاجِ فرکس کے ہاتھ آتا ہے، حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت اور سرداری کی تمنا نہیں کی، لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائلِ علی میں مذکور ہے، ان کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں ان کی خودداری بھی قائم نہ رہ سکی۔

صبح کو دفعتاً یہ آواز کانوں میں آئی کہ علیؓ کہاں ہیں؟ یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی، کیوں کہ جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا، اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں، غرض حسبِ طلب وہ حاضر ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن لگایا، اور دعا فرمائی، جب ان کو علم عنایت ہوا تو انھوں نے عرض کی کہ "کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنا لیں"۔ ارشاد ہوا کہ "بہ نرمی ان پر اسلام کو پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری

---

(۱) یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں۔

ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے"۔ (۱)

لیکن یہود اسلام یا صلح کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا باہر نکلا:

قد علمت خیبر انی مرحب	خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، دلیر
شاکی السلاح بطل مجرب	ہوں، تجربہ کار ہوں، سلاح پوش ہوں،

مرحب کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اس کے اوپر سنگی خود تھا، قدیم زمانہ میں گول پتھر بیچ سے خالی کر لیتے تھے، یہی خود کہلاتا تھا۔

مرحب کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ رجز پڑھا:

انا الذی سمتنی امی حیدرہ	میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا،
کلیث غابات کریہ المنظرہ	میں شیرِ نیستاں کی طرح مہیب و بد منظر ہوں،

مرحب بڑے طمطراق سے آیا، لیکن حضرت علیؓ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی، اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی (۲) پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا، اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں، معالم التنزیل میں ہے، کہ "حضرت علیؓ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر رد کا، لیکن ذوالفقار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی، مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی، آپ نے قلعہ کا در جو سر تا پا پارۂ سنگ تھا، اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا، اس واقعہ کے بعد ابو رافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا تو جگہ سے بھی نہ ہل سکا"۔ یہ روایتیں ابن اسحاق اور حاکم نے روایت کی ہیں؛ لیکن بازاری قصے ہیں، علامہ سخاوی نے مقاصدِ حسنہ میں تصریح کی ہے کہ

کلھا واھیة	سب لغو روایتیں ہیں،

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فروخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر

---

(۱) یہ واقعہ بہ تفصیلِ مذکور صحیح بخاری میں منقول ہے۔ (۲) طبری ص ۱۵۰۹ (یہ اشعار اور مختصر واقعات صحیح مسلم غزوۂ خیبر میں بھی ہیں)

کے لکھا ہے، کہ "یہ روایت منکر ہے"۔ ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے اور دوسرے میں اس مشترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں، جن کو امام بخاریؒ اور ابوداؤد اور دار قطنی قابل اعتبار نہیں سمجھتے (۱)۔

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہؓ نے مارا تھا، مسند ابن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے، لیکن صحیح مسلم (اور حاکم ج ۲ ص ۳۹) میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے، اور یہی اصح الروایات ہے۔

غرض یہ قلعہ (قموص) ۲۰ دن کے محاصرہ کے بعد فتح ہو گیا، ان معرکوں میں ۹۳ یہود مارے گئے، جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر، عامر زیادہ مشہور ہیں، صحابہؓ میں سے ۱۵ بزرگوں نے شہادت حاصل کی جن کے نام ابن سعد نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا، لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضہ میں رہنے دی جائے، ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کریں گے، یہ درخواست منظور ہوئی، بٹائی کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجتے تھے، وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے تھے کہ اس میں سے جو حصہ چاہو لے لو، یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ "زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں"۔ (۲) خیبر کی زمین تمام مجاہدین پر جو اس جنگ میں شریک تھے، تقسیم کر دی گئی، اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خمس بھی تھا۔

عام روایت ہے کہ مال غنیمت میں سے خمس کے علاوہ ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص طور پر کر لیا جاتا تھا، جس کو "صفی" کہتے ہیں، اس بنا پر حضرت صفیہؓ (زوجۂ کنانہ ابن الربیع) کو آپؐ نے لے لیا اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔

حضرت صفیہؓ کے واقعہ کی تحقیق

حضرت صفیہؓ کی نسبت بعض کتب حدیث و سیر میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ان کو دحیہ کلبیؓ کو دیا تھا، پھر کسی نے ان کے حسن کی تعریف کی تو ان سے مانگ لیا اور اس

(۱) میزان الاعتدال ترجمہ بریدہ بن سفیان۔ (۲) فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۷) فتح خیبر و طبری ۱۵۸۹ (اصل روایت ابوداؤد باب المساقات میں موجود ہے)

کے معاوضہ میں ان کو سات لونڈیاں دیں، مخالفین نے اس روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے، اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کا یہ واقعہ حضرت انسؓ سے منقول ہے، لیکن خود حضرت انسؓ سے متعدد روایتیں ہیں، اور وہ باہم مختلف ہیں، بخاری کی جو روایت غزوۂ خیبر کے ذکر میں ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ جب قلعۂ خیبر فتح ہوا تو لوگوں نے آپؐ کے سامنے حضرت صفیہؓ کے حسن کا ذکر کیا، آپؐ نے ان کو اپنے لئے لے لیا، اصلی الفاظ یہ ہیں:

فلمّا فتح الله عليه الحصن	(جب خدا نے قلعہ فتح کرا دیا تو لوگوں نے
ذكر له جمال صفية بنت حيي	آپؐ سے صفیہ بنت حیی کے حسن و جمال
بن اخطب وقد قتل زوجها	کی تعریف کی، اس کا شوہر اس جنگ میں
وكانت عروسا فاصطفاها	مارا گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
النبي صلى الله عليه وسلم لنفسه	نے اس کو اپنے لئے پسند کر لیا،)

لیکن بخاری کتاب الصلوٰۃ (باب ما یذکر فی الفخذ) (صحیح مسلم (۱) باب فضل عتق الامۃ) میں خود حضرت انسؓ کی یہی روایت اس طریقہ سے منقول ہے کہ جب لڑائی کے بعد قیدی جمع کئے گئے تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی ان میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو، آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ خود جا کر کوئی لونڈی لے لو، انہوں نے حضرت صفیہؓ کو انتخاب کیا، لیکن لوگوں کو اعتراض ہوا، ایک شخص نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

يانبي الله اعطيت دحية صفية	اے پیغمبرِ خدا! آپؐ نے صفیہؓ کو دحیہ کے حوالہ کیا
بنت حيي سيدة قريظة والنضير	وہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ ہے، اور آپؐ کے سوا اور
لاتصلح الالك،	کوئی اس کے لائق نہیں۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا، ابوداؤد (۲) میں یہ دونوں روایتیں ہیں، اور دونوں حضرت انسؓ سے مروی ہیں، ابو داؤد کی شرح میں مازری

---

(۱) صحیح مسلم جلد ا ص ۵۴۶ باب فضل عتق الامۃ ثم التزوج بہا)۔ (۲) (ابو داؤد باب ماجاء فی سہم الصفی)۔

(مشہور محدث) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کو اس لئے حضرت دحیہؓ سے لے کران سے عقد کیا کہ:

لمافیه من انتهاکهامع مرتبتها وکونها بنت سید هم،	چونکہ وہ عالی رتبہ اور رئیسِ یہود کی صاحبزادی تھیں، اس لئے ان کا کسی اور کے پاس جانا ان کی توہین تھی۔

حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کے قریب قریب لکھا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلۂ نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کئے جا چکے تھے، اس حالت میں ان کے پاسِ خاطر، حفظ مراتب اور رفعِ غم کے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے عقد میں لے لیں، وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خاندانی عزت کے لحاظ سے ان کو آزاد کر دیا، اور پھر نکاح پڑھایا، (بلکہ مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں، یا آپؐ کے نکاح میں آنا قبول کریں، انہوں نے دوسری صورت پسند کی، یعنی یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آجائیں) (۱)، حسنِ خلق، رحم، اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی، اس قسم کے طرز عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے۔

غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت جویریہؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور اس سلوک کا جو اثر ہوا وہ اوپر گذر چکا ہے۔

فتح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز خیبر میں قیام کیا، اگرچہ یہود کو کامل امن و امان دیا گیا، اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کی گئی، تاہم ان کا طرزِ عمل مفسدانہ اور باغیانہ رہا، پہلا دیباچہ یہ تھا کہ ایک دن زینب نے جو سلاّم بن مشکم کی بیوی اور مرحب کی بھاوج تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صحابہؓ کے ساتھ دعوت کی، آپؐ نے فرطِ کرم سے قبول

---

(۱) مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۳۸ مصر) "س"۔

فرمایا، زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپؐ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا، لیکن حضرت بشرؓ ابن براء نے پیٹ بھر کر کھایا اور زہر کے اثر سے بالآخر ہلاک ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کو بلا کر پوچھا، اس نے جرم کا اقبال کیا، یہود نے کہا "ہم نے اس لئے زہر دیا کہ اگر آپؐ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا، اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپؐ کے ہاتھ سے نجات مل جائے گی"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے، اس بنا پر آپؐ نے زینب سے تعرض نہیں فرمایا، لیکن جب ۲ دو تین ۳ دن کے بعد حضرت بشرؓ زہر کے اثر سے انتقال کر گئے تو وہ قصاص میں قتل کر دی گئی۔

ایک دفعہ صحابہؓ میں سے حضرت عبداللہؓ بن سہیل اور حضرت محیصہؓ قحط سالی کے زمانہ میں خیبر گئے، یہود نے حضرت عبداللہؓ کو دھوکے سے قتل کر کے ایک نہر میں ڈال دیا، حضرت محیصہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر واقعہ بیان کیا، آپؐ نے فرمایا کہ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا؟ عرض کیا کہ حضور وہ تو پچاس ۵۰ مسلمانوں کو قتل کر کے بھی جھوٹی قسم کھا لیں گے، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہیں کیا اور بیت المال سے مقتول کا خوں بہا دلا دیا۔

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں یہود نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو سوتے میں کوٹھے پر سے گرا دیا کہ ان کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا، اس طرح ہمیشہ فساد انگیزیاں کرتے رہتے تھے، مجبور ہو کر حضرت عمرؓ نے ان کو شام کے اضلاع میں جلاوطن کر دیا (۱)، (یہ جملۂ معترضہ سلسلۂ کلام میں آ گیا تھا)۔

خیبر کے واقعات میں اربابِ سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے، یعنی یہ کہ اول آپؐ نے یہود کو اس شرط پر امنِ عام دیا تھا، کہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے، لیکن جب کنانہ بن الربیع نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپؐ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے، یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی (۲)، بالآخر آپؐ نے

(۱) فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۸) اور صحیح بخاری مطبوعہ مصطفائی جلد اول ص ۳۰۰ (باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک

(۲) یہ پوری تفصیل تاریخ طبری میں مذکور ہے، ابن ہشام میں بھی اس کے قریب قریب ہے۔

کنانہ کو قتل کرادیا، اور تمام یہودی لونڈی غلام بنالئے گئے (۱)۔

اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کر دیا گیا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ خزانہ بتانے سے انکار کرتا تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمودؓ بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، طبری میں تصریح ہے:

ثم دفعه رسول الله الی محمد بن مسلمة فضرب عنقه باخیه محمود بن مسلمة (صفحہ ۱۵۸۲)

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کنانہ کو محمدؓ ابن مسلمہ کے حوالہ کیا، انہوں نے اپنے بھائی محمودؓ ابن مسلمہ کے قصاص میں اس کو قتل کر دیا،

باقی روایت کا یہ حال ہے کہ یہ روایت طبری اور ابن ہشام دونوں نے ابن اسحاق سے روایت کی ہے، لیکن ابن اسحاق نے اوپر کے کسی راوی کا نام نہیں بتایا، محدثین نے رجال کی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ ابن اسحاق یہودیوں سے مغازیِ نبویؐ کے واقعات روایت کرتے تھے، اس روایت کو بھی ان ہی روایتوں میں سمجھنا چاہیئے، اور یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق ان راویوں کا نام نہیں لیتے۔

کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لئے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے، رحمۃ اللعالمین کی شان اس سے بہت ارفع ہے۔

وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکوں کے لئے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے؟

اصل واقعہ اس قدر تھا کہ کنانہ بن ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف بیانی نہ کرے گا (۲) (بلکہ ایک روایت میں ہے کہ) اس نے یہ بھی منظور کیا تھا کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہو گا (۳)۔

کنانہ نے بدعہدی کی اور جو امن اس کو دیا گیا تھا، ٹوٹ گیا، کنانہ نے محمودؓ بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، اب اس کے قصاص میں وہ قتل کر دیا گیا جیسا کہ ابھی ہم نے طبری کی روایت سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا واقعات اضافہ ہو گئے۔

---

(۱) فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۴)۔ (۲) ابوداؤد باب حکمِ ارضِ خیبر۔ (۳) طبقات ابن سعد غزوۂ خیبر ص ۸۱ سطر ۲۴۔

(۱) قتل کا واقعہ کنانہ کے ساتھ خاص تھا، خزانہ کے چھپانے کا وہی مجرم تھا، محمود بن مسلمہ کو اسی نے قتل کیا تھا، اس لئے وہی قتل بھی کیا جا سکتا تھا، اضافہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبدالرحمن سے جو روایت متصل نقل کی ہے، اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے، یعنی دونوں قتل کئے گئے۔

فضرب اعناقهما وسبئی اهلیهما، (۱)	تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو قتل کرا دیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا،

(۲) یہاں تک بھی خیریت تھی، لیکن ابن سعد نے عفان بن مسلم سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی ہے، یعنی دونوں بھائیوں کے ساتھ تمام یہودی گرفتار اور لونڈی غلام بنالئے گئے۔

فلمّا وجد المال الذی غیبوه فی مسک الجمل سبئی نساء هم (۲)	توجب وہ خزانہ مل گیا، جس کو انہوں نے اونٹ کی کھال میں چھپا رکھا تھا تو ان کی عورتیں گرفتار کیں اور لونڈیاں بنالیں۔

لیکن جب یہ روایتیں محدثانہ اصولِ تنقید سے جانچی جاتی ہیں، تو چھلکے اترتے جاتے ہیں اور اصل حقیقت رہ جاتی ہے، یہود کا قتل اور زن و بچہ کا گرفتار ہونا ایک طرف، خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ کنانہ کا بھائی تک قتل نہیں کیا گیا، اور حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت تک موجود تھا۔

صحیح بخاری میں ہے:

فلمّا اجمع عمر علی ذلک اتاه احدبنی ابی الحقیق فقال یا امیر المؤمنین اتخرجنا وقد اقرنا محمد و عاملنا علی الاموال (۳)	پھر جب حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ کر لیا تو ابوالحقیق کا ایک بیٹا ان کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنین آپ ہم کو نکالتے ہیں، حالانکہ ہم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے رہنے دیا تھا اور خراج پر معاملہ کیا تھا،

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ یہ وہی کنانہ بن ابی الحقیق کا بھائی تھا۔

---

(۱) طبقات ابن سعد غزوۂ خیبر صفحہ ۸۱ سطر ۲۰۔ (۲) طبقات ابن سعد غزوۂ خیبر صفحہ ۸۰۔ (۳) صحیح بخاری جلد اول مطبع مصطفائی ص ۳۰۷، باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک۔

حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں عام روایتوں کی وسعت کو گھٹا کر اس حد تک پہنچایا کہ:

ولم یقتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد الصلح الا ابنی ابی الحقیق (ذکر غزوۂ خیبر)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے بعد ابی الحقیق کے دونوں بیٹوں کے سوا اور کسی کو قتل نہیں کیا۔

لیکن حافظ موصوف کو اگر صحیح بخاری کی عبارتِ مذکورۂ بالا پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ تعداد اور بھی گھٹ جاتی۔

ابو داؤد میں جہاں ارضِ خیبر کا عنوان باندھا ہے صرف ابن ابی الحقیق کا قتل کیا جانا لکھا ہے۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ابو داؤد نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعیۃ (حیی بن اخطب کے چچا) سے پوچھا تھا کہ وہ خزانہ کیا ہوا؟ اس نے کہا لڑائیوں میں صرف ہو گیا، باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف کنانہ کے قتل کا حکم دیا، یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ کنانہ کا قتل محمودؓ بن مسلمہ کے قصاص میں ہوا تھا، ورنہ اگر خزانہ کے چھپانے کا جرم قتل کا سبب ہوتا تو اس جرم کے مجرم اور بھی تھے۔

مورخین نے پہلی غلطی یہ کی کہ کنانہ کے قتل کا سبب اخفاے خزانہ سمجھے اور چونکہ اس جرم میں اور لوگ بھی شریک تھے، اس لئے یہ تعمیم خود بخود پیدا ہو گئی کہ کنانہ کا تمام خاندان قتل کر دیا گیا۔

ایک اور نکتہ

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ خیبر کا واقعہ محرم میں پیش آیا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس ارادہ سے مدینہ سے نکلے تو محرم کی اخیر تاریخیں تھیں، محرم میں لڑائی شرعاً ممنوع ہے، اس لئے محدثین اور فقہا میں اس کی توجیہ کے متعلق اختلاف پیدا ہوا، بہت سے فقہاء کا یہ مذہب ہے کہ اوائل میں البتہ ان مہینوں میں لڑائی شرعاً ممنوع تھی، لیکن پھر وہ حکم منسوخ ہو گیا، علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ حرمت کا پہلا حکم جو نازل ہوا تھا وہ اس آیت کے رو سے تھا:

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ (بقرہ۔ ۲: ۲۱۷)	کہہ دو کہ اس مہینہ میں لڑنا بڑا گناہ ہے، اور خدا کی راہ سے روکنا ہے۔

پھر سورۂ مائدہ میں یہ آیت اتری:

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ (مائدہ ۵:۲۵)	مسلمانو! خدا کی حد بندیوں کی اور ماہ حرام کی بے حرمتی نہ کرو۔

یہ پچھلی آیت پہلی آیت کے آٹھ برس بعد نازل ہوئی، اس وسیع زمانہ تک تو حرمت کا حکم باقی رہا، اب وہ کون سی آیت یا حدیث ہے جس سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

ولیس فی کتاب اللّٰہ و لا سنۃ رسولہ ناسخ لحکمھا	اور خدا کی کتاب اور حدیث میں ان آیتوں کے حکم کا کوئی ناسخ نہیں۔

مجوزین نے یہ استدلال کیا ہے کہ فتح حرم، طائف کا محاصرہ، بیعت رضوان، یہ سب ماہِ حرام میں ہوئے تھے، اس لئے اگر ماہِ حرام میں لڑائی جائز نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کیوں کر جائز رکھتے، حافظ ابن القیمؒ نے جواب دیا ہے، کہ ماہِ حرام میں ابتداءً جنگ کرنا حرام ہے، لیکن اگر دشمن کا مدافعہ مقصود ہے تو بالاتفاق جائز ہے، وہ سب واقعات دفاعی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش دستی نہیں کی تھی، بلکہ دفاع کیا گیا تھا، بیعت رضوان اس لئے لی گئی تھی کہ یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ کفار نے حضرت عثمانؓ کو (جو سفیر ہو کر گئے تھے) قتل کر دیا، طائف کا محاصرہ کوئی مستقل جنگ نہ تھی، بلکہ غزوۂ حنین کا بقیہ تھا، جس میں خود کفار ہر طرف سے جمع ہو کر حملہ آور ہوئے تھے، فتحِ حرم کا واقعہ حدیبیہ کی شکست کا نتیجہ تھا، جس کی ابتداء قریش نے کی تھی (۱)۔

حافظ ابن القیمؒ نے نہایت صحیح جواب دیا، لیکن خاص خیبر کے معاملہ میں وہ اس گرہ کو نہ کھول سکے اور بحث نامنفصل رہ گئی، حافظ ابن القیمؒ کے استاد علامۂ ابن تیمیہؒ کو بھی اس موقع پر اشتباہ ہوا، انہوں نے الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر لڑائیاں کیں، سب دفاعی تھیں، صرف بدر اور خیبر اس سے مستثنیٰ ہیں، لیکن اگر علامۂ موصوف زیادہ استقصا کرتے تو ثابت ہوتا کہ بدر اور خیبر بھی مستثنیٰ نہیں، بدر کا بیان اوپر گذر چکا ہے، خیبر کے ماسبق واقعات کو ترتیب دے کر دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ یہود اور غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

تقسیمِ زمین

خیبر کی زمین دو برابر حصوں میں تقسیم کی گئی، نصف بیت المال، مہمانی، اور

(۱) زاد المعاد ذکر غزوۂ خیبر

سفارت وغیرہ کے مصارف کے لئے خاص کر لیا گیا، باقی نصف مجاہدین پر جو اس غزوہ میں شریک تھے، مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا، کل فوج کی تعداد چودہ سو (۱۴۰۰) تھی، دو سو (۲۰۰) سوار تھے، سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لئے پیدل سے ڈو گنا ملتا تھا، اس بنا پر یہ تعداد اٹھارہ سو (۱۸۰۰) کے برابر تھی، اس حساب سے کل جائداد کے اٹھارہ سو[۱۸۰۰] حصے کئے گئے، اور ہر مجاہد کے حصہ میں ایک حصہ آیا، جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا:

ولرسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی عام
مثل سہم واحدھم (۱)	لوگوں کی طرح ایک حصہ تھا،

ملکی حالت اور احکامِ فقہی

خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوتا ہے، اسلام کے حقیقی دشمن صرف ڈو تھے، مشرکین اور یہود، عیسائی اگرچہ عرب میں موجود تھے، لیکن وہ کچھ زور اور اثر نہیں رکھتے تھے، مشرکین اور یہود اگرچہ مذہباً باہم مختلف تھے، لیکن سیاسی اسباب کی بنا پر ان میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا، مدینہ کے یہود عموماً انصار کے حلیف تھے، اسی طرح خیبر کے یہود غطفان کے حلیف تھے، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کے لئے مکہ اور مدینہ کے مشرکین اور منافقین سب مل کر کنفسٍ واحدہ ہو گئے، خیبر کی فتح کے بعد یہود کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور مشرکین کا ایک بازو جاتا رہا۔

اب تک اسلام چاروں طرف سے نرغہ کی حالت میں تھا، اس بنا پر بجز عقائد اور ضروری عبادت کے شریعت کے اور احکام کی تاسیس و تعلیم کا موقع نہ تھا، شریعت کے احکام جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے حالات کے اقتضا سے بتدریج آئے ہیں، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی، خیبر کی فتح سے اِدھر تو یہود کی فتنہ انگیزیوں سے نجات ملی، اُدھر حدیبیہ کی صلح سے مشرکین کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہوا، اس بنا پر اب مسلمان جدید فقہی احکام کی تعمیل کے قابل ہو چکے تھے۔

اربابِ سیر نے غزوۂ خیبر کے تذکرہ میں عموماً ذکر ہے کہ اس موقع پر متعدد جدید فقہی احکام نازل (۲) ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تبلیغ کی، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) فتوح البلدان بلاذری، ذکر غزوۂ خیبر (ابو داؤد حکم ارض خیبر میں ہے، النبی صلی اللہ علیہ وسلم معہم لہ سہم کسہم احدھم) "س" (۲) یہاں نزول سے وحی متلو یعنی قرآن مراد نہیں ہے۔

(۱) پنجہ دار پرند حرام ہو گئے۔

(۲) درندہ جانور حرام کر دیئے گئے۔

(۳) گدھا اور خچر حرام کر دیا گیا۔

(۴) اب تک معمول تھا کہ لونڈیوں سے فوراً تمتع جائز سمجھا جاتا تھا، اب استبراء کی قید ہو گئی یعنی اگر وہ حاملہ ہے تو وضعِ حمل تک، ورنہ ایک مہینہ تک تمتع جائز نہیں،

(۵) چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا حرام ہوا،

(۶) بعض روایتوں میں ہے کہ متعہ بھی اسی غزوہ میں حرام ہوا،

وادی القریٰ اور فدک

تیماء اور خیبر کے درمیان ایک وادی ہے جس میں بہت سی بستیاں آباد ہیں، اس کو وادی القریٰ کہتے ہیں، قدیم زمانہ میں عاد و ثمود یہاں آباد تھے، یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عاد و ثمود کے آثارات اب بھی باقی ہیں، اسلام سے پہلے ان بستیوں میں یہود آکر آباد ہوئے اور زراعت اور آب رسانی کو بہت ترقی دی اور اب یہ یہود کا مخصوص مرکز بن گیا تھا (۱)۔

خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی القریٰ کا رخ کیا، لیکن لڑنا مقصود نہ تھا، مگر یہود پہلے سے تیار تھے، انہوں نے فوراً تیر اندازی شروع کر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محمل آپؐ کے غلام (حضرت مدعمؓ) اتار رہے تھے کہ ایک تیر آیا اور وہ جاں بحق ہوئے، عام مورخین نے یہود کی تیاری کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن امام بیہقی نے صاف تصریح کی ہے:

وقد استقبلتنا یهود بالرمی	یہود ہمارے مقابلہ کو تیر چلاتے ہوئے نکلے
ولم نکن علیٰ تعبیة (۲)	اور ہم تیار نہ تھے۔

بہرحال جنگ شروع ہو گئی، لیکن تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہود نے سپر ڈال دی، اور خیبر کے شرائط کے موافق صلح ہو گئی۔

ادائے عمرہ

صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آکر عمرہ ادا کریں گے، اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے،

(۱) معجم البلدان لفظ قریٰ (جلد ۸، ص ۴۰۳) "س" (۲) زرقانی بر موطا بحوالہ بیہقی باب الجہاد ذکر غلول (صفحہ ۲۱۳) "س"

اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال عمرہ ادا کرنا چاہا، اور اعلان کرا دیا کہ جو لوگ واقعۂ حدیبیہ میں شریک تھے، ان میں سے کوئی رہ نہ جائے، چنانچہ بجز ان لوگوں کے جو اس اثناء میں مر چکے تھے، سب نے یہ سعادت حاصل کی۔

معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان مکہ میں آئیں تو ہتھیار ساتھ نہ لائیں، اس لئے اسلحۂ جنگ بطن یاجج میں جو مکہ سے آٹھ میل ادھر ہے، چھوڑ دیئے گئے اور دو سو (۲۰۰) سواروں کا ایک دستہ اسلحہ کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لبیک کہتے ہوئے حرم کی طرف بڑھے، حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے آگے آگے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے (۱):

خلوا بني الكفار عن سبيله	کافرو! سامنے سے ہٹ جاؤ،
اليوم نضربكم على تنزيله	آج جو تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے،
ضربا يزيل الهام عن مقيله	وہ وار جو سر کو خواب گاہ سر سے الگ کر دے،
ويذهل الخليل عن خليله	اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے،

صحابہؓ کا جمِ غفیر ساتھ تھا، اور برسوں کی دیرینہ تمنا اور فرضِ مذہبی بڑے جوش کے ساتھ ادا کر رہا تھا، اہلِ مکہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب و ہوا نے کمزور کر دیا ہے، اس بنا پر آپؐ نے حکم دیا کہ لوگ طواف کے تین۳ پہلے پھیروں میں اکڑتے ہوئے چلیں، عربی زبان میں اس کو "رمل" کہتے ہیں، چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے۔

اہلِ مکہ نے اگرچہ چار ناچار عمرہ کی اجازت دے دی تھی، تاہم ان کی آنکھیں اس منظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھیں، رؤسائے قریش نے عموماً شہر خالی کر دیا اور پہاڑوں پر چلے گئے۔ تین۳ دن کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا "محمدؐ سے کہہ دو کہ شرط پوری ہو چکی اب مکہ سے نکل جائیں"۔ حضرت علیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، آپؐ اسی وقت روانہ ہو گئے، چلتے وقت حضرت حمزہؓ کی صغیر السن صاحبزادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس "چچا چچا" (۲) کہتی دوڑی آئیں، حضرت علیؓ نے ہاتھوں میں

---

(۱) یہ اشعار اور یہ واقعہ ترمذی نے شمائل میں نقل کیا ہے۔ (۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رشتہ میں ان کے بھائی تھے، لیکن انہوں نے تعظیماً کہا (یا اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت حمزہؓ دونوں رضاعی بھائی تھے)

اٹھالیا، لیکن حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) اور زیدؓ بن حارثہ نے اپنے دعوے پیش کئے، حضرت جعفرؓ کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، زیدؓ کہتے تھے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے، اس رشتہ سے یہ میری بھتیجی ہے، حضرت علیؓ کو دعویٰ تھا کہ میری ہمشیرہ بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے دعوے مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو اسماءؓ کی گود میں دیا، وہ امامہ کی خالہ تھیں، پھر فرمایا کہ "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے" (۱)

---

(۱) اس واقعہ کا بڑا حصہ صحیح بخاری سے ماخوذ ہے، بعض زائد تفصیلیں زرقانی سے لی گئی ہیں، جو کتب حدیث کے حوالہ سے زرقانی نے نقل کی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

غزوۂ موتہ ۸ھ

جمادی الاولیٰ ۸ھ

موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے، جو بلقاء سے اس طرف ہے، عرب میں جو مشرقی تلواریں مشہور ہیں، وہیں بنتی تھیں (۱)، کثیر مشہور شاعر کہتا ہے:

صوارم یجلوھا بموتہ صیقل (وہ تلواریں جن کو موتہ میں صیقل گر جلا دیتا ہے۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہِ بصریٰ یا قیصرِ روم کے نام ایک خط لکھا تھا، عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب رؤسا حکمراں تھے، ان میں ایک شرحبیل بن عمرو بھی تھا، جو اسی علاقہ بلقاء کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا، یہ عربی خاندان ایک مدت سے عیسائی تھا اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمراں تھا، یہ خط حارثؓ بن عمیر لے کر گئے تھے، شرحبیل نے ان کو قتل کر دیا، اس کے قصاص کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی، زید بن حارثہؓ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، سپہ سالاری ملی، اور ارشاد ہوا کہ اگر ان کو دولت شہادت نصیب ہو تو جعفر طیار اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ فوج کے سردار ہوں (۲)، حضرت زیدؓ غلام تھے، گو آزاد ہو چکے تھے، حضرت جعفرؓ طیار حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقربِ خاص تھے، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے، اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفرؓ و حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے ہوتے حضرت زیدؓ کو افسر کرنا کس بنا پر ہے، چنانچہ لوگوں میں چرچے ہوئے (۳)، لیکن اسلام جس مساوات عام کے قائم کرنے کے لئے آیا تھا، اس کے لئے اسی قسم کا ایثار درکار تھا، حضرت اسامہؓ کی مہم میں جس میں تمام مہاجرین کو شرکت کا حکم ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو فوج کا افسر مقرر کیا تھا، اس وقت بھی لوگوں میں چرچے ہوئے،

---

(۱) معجم البلدان لفظ موتہ (ج ۸ ص ۱۹۰) (۲) صحیح بخاری غزوۂ موتہ۔ (۳) (فتح الباری جلد، ص ۳۹۳) "س"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ " تم لوگوں نے ان کے باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا، حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے "۔ چنانچہ صحیح بخاری (بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامۃ بن زید فی مرضہ الذی توفی فیہ۔ باب المغازی) میں یہ تفصیل یہ واقعہ منقول ہے۔

گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی، لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغ اسلام تھا، ارشاد ہوا کہ پہلے ان کو دعوتِ اسلام دی جائے (۱)، اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو جنگ کی ضرورت نہیں، یہ بھی حکم ہوا کہ اظہارِ ہمدردی کے لئے اس مقام پر جانا جہاں حارثؓ بن عمیر نے ادائے فرض میں جان دی ہے، ثنیۃ الوداع تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فوج کی مشایعت کے لئے تشریف لے گئے، صحابہؓ نے پکار کر دعا کی کہ خدا سلامت اور کامیاب لائے۔

فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرجبیل کو خبر دی، جس نے مقابلہ کے لئے کم و بیش ایک لاکھ فوج تیار کی، ادھر خود قیصرِ روم (ہرقل) قبائلِ عرب کی بے شمار فوج لے کر مآب میں خیمہ زن ہوا، جو بلقاء کے اضلاع میں ہے، حضرت زیدؓ نے یہ حالات سن کر چاہا کہ ان واقعات سے دربارِ رسالت کو اطلاع دی جائے اور حکم کا انتظار کیا جائے، لیکن حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے کہا، ہمارا اصل مقصد فتح نہیں بلکہ دولتِ شہادت (۲) ہے، جو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے، غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا، حضرت زیدؓ برچھیاں کھا کر شہید ہوئے، ان کے بعد حضرت جعفرؓ نے علم ہاتھ میں لیا، گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں، پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہو کر گر پڑے، حضرت عبداللہؓ بن عمر کا بیان ہے کہ میں نے ان کی لاش دیکھی تھی، تلواروں اور برچھیوں (۳) کے نوے ۹۰ زخم تھے، لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے، پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا، حضرت جعفرؓ کے بعد عبداللہؓ بن رواحہ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئے، اب حضرت خالدؓ سردار بنے، اور نہایت بہادری سے لڑے، صحیح بخاری میں ہے کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں (۴)، لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا کیا

---

(۱) طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۹۳) "س" (۲) (ابن ہشام غزوۂ موتہ) "س" (۳) صحیح بخاری۔ (۴) (صحیح بخاری غزوۂ موتہ) "س"

مقابلہ تھا، بڑی کامیابی یہی تھی کہ فوجوں کو دشمن کی زد سے بچا لائے۔ جب یہ شکست خوردہ (۱) فوج مدینہ کے قریب پہنچی اور اہلِ شہر انکی مشایعت کو نکلے تو لوگ غمخواری کے بجائے ان کے چہروں پر خاک پھینکتے تھے کہ او فرارِیو! تم خدا کی راہ سے بھاگ آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا، حضرت جعفرؓ سے آپؐ کو خاص محبت تھی، ان کی شہادت کا نہایت قلق تھا، آپؐ مسجد میں جاکر غمزدہ بیٹھے، اسی حالت میں ایک شخص نے آکر کہا کہ جعفر کی مستورات رو رہی ہیں اور ماتم کر رہی ہیں، آپؐ نے منع کرا بھیجا، وہ گئے اور واپس آکر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں، آپؐ نے دوبارہ بھیجا، وہ پھر گئے، اور واپس آکر عرض کی کہ ہم لوگوں کی نہیں چلتی، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "تو ان کے منہ میں خاک بھر دو"۔ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے صحیح بخاری میں منقول ہے، صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس شخص سے کہا کہ خدا کی قسم! تم یہ نہ کروگے (منہ میں خاک ڈالنا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے نجات نہ ملے گی۔

---

(۱) مصنف نے یہاں ابن اسحاق کی روایت پر اعتماد کر کے اس فوج کو شکست خوردہ لکھا ہے، اور ان کی واپسی پر ان سب کو بلا امتیاز فراری ہونے کا مستحق ظاہر کیا ہے، لیکن جیسا کہ صحیح بخاری غزوۂ موتہ میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازروے وحی فرمایا کہ پھر اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد سیف اللہ نے مسلمانوں کے علم کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا، (فتح اللّٰہ علیہم) ارباب سیر اور اہل روایت اور شراحِ حدیث اس غلبہ یا فتح کی تشریح میں مختلف ہیں، ایک فریق کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پوری فتح حاصل ہوئی، دوسرے کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور فتح یہ ہے کہ مسلمان اس قلت تعداد اور کفار اپنی کثرت کے باوجود تھک کر غیر منفصل جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کے مقابلہ سے ہٹ آئے، تیسرا فریق یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو فتح کفار کے ایک خاص دستہ کے مقابلہ میں حاصل ہوئی، اور اس سے مالِ غنیمت بھی حاصل کیا، چوتھا بیان یہ ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کی قیادت میں اتنے بڑے لشکر کے حملوں کو روک دیا، اور بہ سلامت پیچھے ہٹ آئے، اس مقام پر فتح الباری، روض الانف، سہیلی اور البدایہ ابن کثیر ملاحظہ کرنا چاہیے، اسی طرح مسلمانوں کی جس فوج کو اپنے اوپر فراری ہونے کا گمان تھا یا مسلمانوں نے ان کو فراری کہا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی کہ نہیں تم فراری نہیں بلکہ پھر دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو، اس کی مخاطب پوری اسلامی فوج نہیں بلکہ ان کی فوج کا ایک خاص دستہ تھا جو جلدی کر کے پہلے مدینہ چلا آیا تھا، تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری و روض الانف سہیلی و البدایہ ابن کثیر باب غزوۂ موتہ) "س"۔

فتحِ مکہ

رمضان ۸ سنہ مطابق جنوری ۶۳۰ سنہء

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (فتح: ۴۸-۱)

جانشینِ ابراہیم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کا سب سے مقدم فرض، توحیدِ خالص کا احیاء اور حرمِ کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا، لیکن قریش کے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفت عام نے پورے اکیس ۲۱ برس تک اس فرض کو روک رکھا، صلحِ حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لئے امن و امان قائم ہوگیا، اور دلدادگانِ حرم ایک دفعہ یادگارِ ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے، لیکن معاہدۂ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا، حلم و عفو و تحمل کی حد ہو چکی، اب وقت آگیا کہ آفتابِ حق حجاب ہائے حائل کو چاک کر کے باہر نکل آئے۔

صلحِ حدیبیہ کی بنا پر قبائلِ عرب میں خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہو گئے تھے، اور ان کے حریف بنو بکر نے قریش سے محالفت کا معاہدہ کر لیا تھا، ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں، اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور اب تک رکی رہیں، کیوں کہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا، صلحِ حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا، تو بنو بکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آگیا، دفعتاً وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور رؤسائے قریش نے علانیہ ان کو مدد دی، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں (۱) بدل کر بنو بکر کے ساتھ تلواریں چلائیں، خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی، بنو بکر رک گئے کہ حرم کا احترام ضرور ہے، لیکن ان کے رئیسِ اعظم نوفل نے کہا یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکتا، غرض عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے، کہ دفعتاً یہ صدا بلند ہوئی:

لاھم انی ناشد محمدا　　　　اے خدا! میں محمدؐ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا۔

---

(۱) طبری صفحہ ۱۶۲۰ (ج ۳) (ابن سعد جزء مغازی ص ۹۰، میں کچھ اور نام بھی ہیں) "س"

حلف ابینا وابیه الاتلدا	جو ہمارے اور ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے،
فانصر رسول اللہ نصر اعتدا	اے پیغمبر خدا! ہماری اعانت کر اور خدا کے
وادع عباد اللہ یاتوا مددا	بندوں کو بلا، سب اعانت کے لئے حاضر ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ۴۰ ناقہ سوار (۱) جن کا پیش رو عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات سنے تو آپ کو سخت رنج ہوا، تاہم آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین ۳ شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے۔

(۱) مقتولوں کا خوں بہا دیا جائے۔

(۲) قریش، بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمر نے قریش کی زبان سے کہا کہ "صرف تیسری شرط منظور ہے" (۲) لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی، انہوں نے ابو سفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرا لائیں، ابو سفیان نے مدینہ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی، بارگاہ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا، ابو سفیان نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا، لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا، ہر طرف سے مجبور ہو کر جناب فاطمہؓ زہرا کے پاس آیا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ پانچ ۵ برس کے بچے تھے، ابو سفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا "اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا"۔ جناب سیدہؓ نے فرمایا "بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل" بالآخر ابو سفیان نے حضرت علیؓ کے ایما سے مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا کہ "میں نے معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کر دی" (۳)۔

ابو سفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں، نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں، احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

(۱) (طبقات ابن سعد، جزء مغازی ص ۹۷) ۳۰ س۔ (۲) زرقانی (ج ۲ ص ۳۳۶) نے یہ واقعہ مغازی ابن عائذ سے نقل کیا ہے، تعجب ہے کہ اور مورخین اور ارباب سیر ایسے ضروری واقعہ کو قلم انداز کر گئے۔ (۳) (زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۳۷)

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک معزز صحابی تھے، انہوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی، حضرت علیؓ (اور حضرت زبیرؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت ابو مرثدؓ غنوی) کو بھیجا (۱) کہ قاصد سے خط چھین لائیں، خط آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام لوگوں کو حاطب کے افشائے راز پر حیرت ہوئی، حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے، اور عرض کی کہ "حکم ہو تو ان کی گردن اڑا دوں"؟ لیکن جبینِ رحمت پر شکن نہ تھی، ارشاد ہوا، عمر! تم کو کیا معلوم ہے کہ خدا نے اہلِ بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے مواخذہ نہیں ہے۔

حضرت حاطبؓ کے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں تھے، اور ان کا کوئی حامی نہ تھا، اس لئے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔

غرض ۱۰ / رمضان سنہ ۸ھ کو کوکبۂ نبویؐ نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا، دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں، قبائلِ عرب راہ میں آکر ملتے جاتے تھے، مرالظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا، اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں، یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک میل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی، جس سے تمام صحرا وادیِ ایمن بن گیا، فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی، تحقیق کے لئے انہوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) ابو سفیان اور بُدیل بن ورقاء کو بھیجا، خیمۂ نبویؐ کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا، اس نے ابو سفیان کو دیکھ لیا (۲)، حضرت عمرؓ جذبۂ انتقام کو ضبط نہ کر سکے، تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہ رسالت میں آکر عرض کی کہ کفر کے استیصال کا وقت آگیا، لیکن حضرت عباسؓ نے جان بخشی کی درخواست کی، حضرت عمرؓ نے دوبارہ عرض کیا، حضرت عباسؓ نے کہا "عمرؓ! اگر یہ شخص تمہارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر

---

(۱) (زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۳۹) "س" (۲) اصل واقعہ صحیح بخاری میں کافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے، لیکن مزید تفصیل اور جزئیات حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن عائذ وغیرہ سے نقل کئے ہیں، میں نے ان کو بھی لے لیا ہے، بعض واقعات طبری سے ماخوذ ہیں۔

سخت دلی نہ کرتے"۔ حضرت عمرؓ نے کہا آپ یہ نہ فرمائیں، آپ جس دن اسلام لائے تھے، مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی، خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی (۱)۔

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعوے دار تھی، اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائلِ عرب کا اشتعال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز، اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی، لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبویؐ) تھی، اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ "خوف کا مقام نہیں"۔

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا، لیکن طبری وغیرہ میں اس اجمال کی تفصیل میں حسبِ ذیل مکالمہ لکھا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) — کیوں ابوسفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟

ابوسفیان — کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) — کیا اس میں کچھ شک ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں؟

ابوسفیان — اس میں تو ذرا شبہہ ہے۔

بہر حال ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا، لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے، چنانچہ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں، کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا، قبائلِ عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں، سب سے پہلے غِفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ (سعد بن) ہُذیم، سُلیم، ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے، ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو ہو جاتے تھے، سب

---

(۱) (طبری ج ۳ ص ۱۶۳۲) "س"

کے بعد انصار کا قبیلہ اس سر و سامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ابو سفیان نے متحیر ہو کر پوچھا یہ کون لشکر ہے؟ حضرت عباسؓ نے نام بتایا۔ دفعتاً سردارِ فوج حضرت سعد بن عبادہؓ ہاتھ میں علم لئے ہوئے برابر سے گذرے اور ابو سفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے:

الیوم یوم الملحمة	آج گھمسان کا دن ہے۔ آج کعبہ
الیوم تستحل الکعبة (۱)	حلال کر دیا جائے گا۔

سب سے اخیر کو کتیبۂ نبویؐ نمایاں ہوا۔ جس کے پرتو سے سطحِ خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا۔ حضرت زبیرؓ بن العوام علم بردار تھے۔ ابو سفیان کی نظر جمالِ مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ "حضورؐ نے سنا؟ عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے"؟ ارشاد ہوا کہ "عبادہ نے غلط کہا۔ آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے" یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم عبادہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے۔

مکہ پہنچ کر آپؐ نے حکم دیا کہ علمِ نبویؐ مقامِ حجون پر نصب کیا جائے۔ حضرت خالدؓ کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں (۲)۔

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا، یا ابو سفیان کے ہاں پناہ لے گا، یا دروازہ بند کر لے گا۔ (یا خانۂ کعبہ میں داخل ہو جائے گا) اس کو امن دیا جائے گا۔ تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالدؓ کی فوج پر تیر برسائے، چنانچہ تین صاحب یعنی حضرت کرزؓ ابن جابر فہری اور حضرت حبیشؓ بن اشعر اور حضرت مسلمہؓ (۳) بن المیلا نے شہادت پائی، حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر حملہ کیا۔ یہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو حضرت خالدؓ سے بازپرس کی۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتدا مخالفین نے کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی"۔

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضورؐ قیام کہاں فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں؟ شریعت میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ ابو طالب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحبزادے عقیل

---

(۱) یہ خاص صحیح بخاری کی روایت ہے۔ (۲) (مصنف نے یہاں حضرت عروہؓ کی روایت لی ہے۔ جو گو صحیح بخاری میں ہے مگر مرسل ہے۔ صحیح و مرفوع روایات جو صحیح بخاری میں ہیں۔ ان کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ حضرت خالدؓ مکہ کے زیرین حصہ سے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بالائی حصہ سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ فتح الباری ج ۸ ص ۸) س" (۳) ان کی شہادت کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے۔

اس وقت کافر تھے، اس لئے وہی وارث ہوئے، انہوں نے یہ مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اس میں اتروں"؟ (۱) اس لئے مقام خیف میں ٹھہروں گا"۔ جہاں قریش نے (ہمارے خلاف کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا)۔

خدا کی شان، حرم محترم جو خلیلِ بت شکن کی یادگار تھا اس کے آغوش میں ۳۶۰ بت جاگزیں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (جَآءَ الْحَقُّ	حق آگیا اور باطل مٹ گیا،
وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ) اِنَّ	اور باطل مٹنے ہی کی
الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل۔ ۱۷: ۸۱) (۲)	چیز تھی۔

عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے، جن کو قریش خدا مانتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیئے جائیں (۳)، حضرت عمرؓ نے اندر جا کر جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹا دیں، حرم ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپؐ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے، کنجی طلب کی، اور دروازہ کھلوایا، آپؐ حضرت بلالؓ اور طلحہؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی، بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز نہیں ادا کی۔

خطبۂ فتح شہنشاہی اسلام کا یہ پہلا دربار عام تھا، خطبۂ سلطنت یعنی بارگاہ احدیت کی تقریر خلافت الٰہی کے منصب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی جس کا خطاب صرف اہلِ مکہ سے نہیں، بلکہ تمام عالم سے تھا۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ — ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے، اس کا کوئی

---

(۱) (صحیح بخاری فتح مکہ میں حضرت اسامہ بن زید سے جو روایت ہے، اس میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے یہ ارشاد فتح مکہ کے موقع پر کیا لیکن اس میں خیف کے قیام کا ذکر نہیں، لیکن جو روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے، اس میں یہ تصریح ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا اور اس میں خیف کی تصریح ہے، ابن حجر نے یہ تطبیق کی ہے کہ ممکن ہے کہ دونوں موقعوں پر لوگوں کے سوال پر یہ ارشاد فرمایا ہو فتح الباری ج ۸ ص ۱۳ و جلد ۲ ص ۳۶۰) "س" (۲) اس موقع پر اس پوری آیت پاک کے پڑھنے کا ذکر ابن سعد فتح مکہ میں ہے، صحیح بخاری فتح مکہ میں الفاظ آئے ہیں جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ (سبا: ۴۹) یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور اب باطل پھر نہ آئے گا) "س" (۳) صحیح بخاری فتح مکہ

صدق وعده ونصر عبده هزم الاحزاب وحده الا كل ماثرة اودم او مال يدعىٰ فهو تحت قدمي هاتين الا سدانة البيت وسقاية الحجاج .... يامعشر قريش ان الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلية وتعظمها با لأ باء، الناس من آدم وآدم من تراب

.... شریک نہیں ہے، اس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا، ہاں تمام مفاخر، تمام انتقامات، تمام خوں بہائے قدیم سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں، اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا، تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں، اور آدم مٹی سے بنے ہیں،

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی جس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

(حجرات ۔ ۴۹ : ۱۳) (ابن ہشام مختصراً)

لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ، لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو، خدا دانا اور واقف کار ہے،

إِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ

(بخاری)

خدا نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی۔

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوتِ اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لئے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی۔

خطبہ کے اصولی مطالب

عرب میں دستور تھا، کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پا جاتا تھا، یعنی اگر اس وقت قاتل نہ ہاتھ آسکا تو خاندانی دفتر میں مقتول کا نام لکھ جاتا اور سیکڑوں برس گذرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا، قاتل اگر مر چکا ہے تو اس کے خاندان یا قبیلہ کے آدمی

کو قتل کرتے تھے، اسی طرح خوں بہا کا مطالبہ بھی ابا عن جد چلا آتا تھا۔ یہ خون کا انتقام عرب میں سب سے بڑے فخر کی بات تھی۔ اس طرح اور بہت سی لغو باتیں مفاخرِ قومی میں داخل ہو گئی تھیں۔ اسلام ان سب کے مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اور اس بنا پر آپؐ نے (اس طریق) انتقام، اور خوں بہا اور نیز اور تمام غلط مفاخر کی نسبت فرمایا کہ "میں نے ان کو پاؤں سے کچل دیا"۔

عرب اور تمام دنیا میں نسل اور قوم و خاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم میں فرقِ مراتب قائم کئے گئے تھے، جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں قائم کیں، اور شودر کو وہ درجہ دیا جو جانوروں کا درجہ ہے، اور اس کے ساتھ یہ بندش کر دی کہ وہ کبھی اپنے رتبہ سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔

اسلام کا سب سے بڑا احسان، جو اس نے تمام دنیا پر کیا، مساواتِ عام کا قائم کرنا تھا، یعنی عرب و عجم، شریف و رذیل، شاہ و گدا سب برابر ہیں، ہر شخص ترقی کر کے ہر انتہائی درجہ پر پہنچ سکتا ہے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیت پڑھی، اور پھر توضیح فرمائی کہ "تم سب اولادِ آدم ہو، اور آدم مٹی سے بنے تھے"۔

خطبہ کے بعد آپؐ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکرِ قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا "تم کو کچھ معلوم ہے؟ میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟"۔

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے کہ:

اخ کریم وابن اخ کریم   تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے،

ارشاد ہوا:۔

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ اذهبوا فانتم الطلقاء تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

کفارِ مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا، اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے۔ لیکن آپؐ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دست بردار ہو جائیں۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے بامِ کعبہ پر چڑھ کر اذان دی، وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے، ان کی آتشِ غیرت پھر مشتعل تھی، عتاب بن اسید نے کہا "خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اٹھا لیا" (۱)۔ ایک سردارِ قریش نے کہا "اب جینا بے کار ہے" (۲)۔

مقامِ صفا میں آپؐ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے، آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ ان سے ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا، پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دستِ مبارک ڈبو کر نکال (۳) لیتے تھے، آپؐ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں، اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

ان مستورات میں ہند بھی آئی، یہ وہی ہند ہے، جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں تھی، حضرت حمزہؓ کو اسی نے قتل کرایا تھا، اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی، وہ نقاب پہن کر آئی، شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں، لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے، بیعت کے وقت اس نے (نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے) باتیں کیں جو حسبِ ذیل ہیں (۴)۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا،
ہند	یہ اقرار آپؐ نے مردوں سے تو نہیں لیا، لیکن بہر حال ہم کو منظور ہے،
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	چوری نہ کرنا،

(۱) ابن ہشام (حضرت عتاب بعد کو مسلمان ہوئے) س۔ (۲) اصابہ تذکرۂ عتاب بن اسید (ج ۲ ص ۴۵۱) س۔
(۳) (طبری جلد ۳ ص ۱۶۴۲) س۔ (۴) (طبری جلد ۳ ص ۱۶۴۳ مختصراً) س۔

ہند: میں اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں، معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم): اولاد کو قتل نہ کرنا۔

ہند: ربیناھم صغارا وقتلتھم کبارا فانت وھم اعلم ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا بڑے ہوئے تو جنگِ (۱) بدر میں آپؐ نے ان کو مار ڈالا، اب آپؐ اور وہ باہم سمجھ لیں۔

رؤسائے عرب میں دس شخص تھے جو قریش کے سرتاج تھے، ان میں صفوان بن امیہ جدہ بھاگ گئے، عمیر بن وہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ رئیسِ عرب مکہ سے جلاوطن ہوا جاتا ہے، آپؐ نے علامتِ امان کے طور پر اپنا عمامہ عنایت کیا، عمیر جدہ پہنچ کر ان کو واپس لائے، حنین کے معرکہ تک یہ اسلام نہیں لائے (۲)۔ (بعد کو مسلمان ہوگئے)۔

عبد اللہ بن زبعریٰ عرب کے مشہور شاعر جو (پہلے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجویں کہا کرتے تھے۔ اور قرآن مجید پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، نجران بھاگ گئے، لیکن پھر آکر اسلام لائے (۳)۔

ابو جہل کے بیٹے عکرمہ یمن چلے گئے، لیکن ان کی حرم (ام حکیمؓ) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امان لی اور جاکر یمن سے لائیں (۴)، یہ واقعہ ابو جہل سے کہنے کے قابل نہیں کہ اس کا جگر بند کفر کی گود سے نکل کر اسلام کے آغوش میں آگیا اور اب ہم اس کو حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں۔

اشتہاریانِ قتل

ارباب سیر کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گو اہلِ مکہ کو امن عطا کیا تھا، تاہم

(۱) جنگ بدر میں ہند کے لڑکے کافروں کے ساتھ شریک ہوکر لڑے تھے، اور لڑکر مارے گئے تھے۔ (۲) طبری (ج ۳ ص ۱۶۴۵ "س" واصابہ ذکرِ صفوان بن امیہ (ج ۲ ص ۱۸۷) "س" (۳) (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۷) "س" (۴) (طبری ج ۳ ص ۱۶۴۶) "س"

دس۱۰ شخصوں (۱) کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں۔ ان میں سے بعض مثلاً عبداللہ ابن خطل، مقیس بن صبابہ خونی مجرم تھے اور قصاص میں قتل کئے گئے۔ لیکن متعدد ایسے تھے کہ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں ستایا کرتے تھے، یا آپؐ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک عورت اس جرم پر قتل کی گئی کہ وہ آپؐ کے ہجویہ اشعار گایا کرتی تھی۔

لیکن محدثانہ تنقید کی رو سے یہ بیان صحیح نہیں۔ اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا، کفار قریش میں سے (بجز دو چار کے) کون تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں؟ بایں ہمہ انہی لوگوں کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ انتم الطلقاء۔ جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے، وہ تو نسبتاً کم درجہ کے مجرم تھے، حضرت عائشہؓ صدیقہ کی یہ روایت صحاحِ ستہ میں موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ خیبر میں جس یہودی عورت نے آپؐ کو زہر دیا اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہوگا، ارشاد ہوا کہ نہیں۔ خیبر کے کفرستان میں ایک یہودیہ زہر دے کر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے جاں بر ہو سکتی ہے، تو حرم میں اس سے کم درجہ کے مجرم عفوِ نبویؐ سے کیوں کر محروم رہ سکتے ہیں۔

---

(۱) (حافظ مغلطائی نے پندرہ۱۵ نام مختلف حوالوں سے جمع کئے ہیں، جو خود محدثین کے نزدیک غیر محتاطانہ ہیں، عام ارباب سیرت نے دس۱۰ شخصوں کے نام لئے ہیں، ابن اسحاق نے آٹھ۸ نام گنائے ہیں، ابو داؤد اور دار قطنی کی روایت میں صرف چھ۶ ہیں، بخاری میں صرف ابن خطل کا واقعہ مذکور ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ تحقیق کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی قدر تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔

عام روایت کے رو سے جن دس۱۰ شخصوں کی سزائے موت کا اعلان کیا گیا تھا، ان کا حال یہ ہے کہ وہ شدید مجرم تھے، تاہم سات اشخاص خلوص سے ایمان لائے اور ان کو معافی دے دی گئی، صرف چار۴ شخص قتل ہوئے، تین۳ مرد اور ایک عورت، عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، حویرث بن نقید اور ابن خطل کی لونڈی قریبہ، ابن خطل اور ابن صبابہ دونوں خونی مجرم تھے، ابن خطل نے، جو اسلام لاچکا تھا، اپنے ایک مسلمان خادم کو قتل کر کے مرتد ہو گیا تھا، مقیس بن صبابہ کا واقعہ یہ ہے کہ اس کا ایک بھائی ایک انصاری کے ہاتھ سے غلطی سے مارا گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت ادا کرا دی تھی، تاہم مقیس منافقانہ اسلام لایا اور غدر سے اس انصاری کو قتل کر دیا، اور حویرث نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو۲ صاحبزادیوں کے ساتھ جب وہ ہجرت کر رہی تھیں شرارت کی تھی، اور ان دونوں کو اونٹوں سے گرا دینا چاہتا تھا، حضرت علی بن ابی طالب نے اس کو قتل کر دیا۔

قریبہ، جو ابن خطل کی لونڈی تھی، مکہ کی ایک مغنیہ تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھی) (دیکھو زرقانی اور ابن ہشام ذکر فتح مکہ)

اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بالکل ناقابلِ اعتبار رہ جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں صرف ابن خطل کا قتل مذکور ہے (۱) اور یہ عموماً مسلّم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا، مقیس کا قتل بھی شرعی قصاص تھا۔ باقی جن لوگوں کی نسبت حکمِ قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا کرتے تھے۔ وہ روایتیں صرف ابنِ اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں، یعنی اصولِ حدیث کی رو سے وہ روایت منقطع ہے، جو قابلِ اعتبار نہیں، ابنِ اسحاق کا فی نفسہ جو درجہ ہے، وہ ہم کتاب کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں۔

سب سے زیادہ معتبر روایت جو اس بارہ میں پیش کی جاسکتی ہے وہ ابو داؤد کی روایت ہے (۲)، جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ چار شخصوں کو کہیں امن نہیں دیا جاسکتا، لیکن ابو داؤد نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند جیسی چاہئیے مجھ کو نہیں ملی (۳)، پھر اس کے بعد ابن خطل کی روایت نقل کی ہے۔

---

(۱) (بخاری فتح مکہ) "س" (۲) ابو داؤد باب قتل الاسیر۔ (۳) (ابو داؤد نے باب قتل الاسیر میں اس معنی کی تین۳ روایتیں درج کی ہیں، پہلی وہ روایت ہے جس کا ذکر مصنف نے اخیر میں کیا ہے، یہ روایت احمد بن المفضل، اسباط بن نصر، سدی کبیر، مصعب بن سعد اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے، اس میں چار مرد اور دو۲ عورتوں کے قتل کا حکم مذکور ہے، جن میں سے ایک ابن ابی سرح ہے جس کو حضرت عثمانؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے بغیر آپ کی خدمت میں لاکر پیش کیا، اور اس کو کچھ دیر کے تامل کے بعد پناہ دی اور وہ مسلمان ہوا، اس روایت میں احمد بن مفضل اور اسباط بن نصر اور سدی کبیر تینوں پر علمائے رجال نے جرحیں کی ہیں، اور خصوصاً اسباط بن نصر پر اور زیادہ جرحیں ہیں، یہ روایت اسی سلسلہ سے نسائی نے باب قتل المرتد میں اور حاکم نے مستدرک کتاب المغازی میں اس کو نقل کیا ہے، اس سلسلہ کے یہ تینوں راوی شیعہ ہیں اور حاکم نے مستدرک میں اس پہلو سے اپنا اظہار خیال کر دیا ہے، ابو داؤد کی دوسری روایت عمروؓ بن عثمان بن عبدالرحمن بن سعید مخزومی سے ہے کہ انھوں نے اپنے دادا سے اور انھوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار۴ مردوں اور دو۲ عورتوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو پناہ نہیں دی جاسکتی، ان دو۲ عورتوں میں سے، جو دونوں مغنیہ لونڈیاں تھیں، ایک مسلمان ہو گئی اور ایک قتل کی گئی، اس روایت کے متعلق ابو داؤد نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے شیخ ابو العلاء سے اس کی سند اچھی طرح سمجھی نہیں، یہی روایت اسی سلسلہ سے دار قطنی اواخر کتاب الحج میں ہے، اس میں سند کے آخر میں یوں ہے، عمرو بن عثمان نے اپنے باپ سے اور انھوں نے اپنے دادا سے یہ روایت سنی، اس سے ظاہر ہے کہ سند کے اسی حصہ میں ابو داؤد کو شک ہے، ابو داؤد کی تیسری روایت میں صرف ابن خطل کے قتل کا ذکر ہے، جو صحیح بخاری وغیرہ کی روایت سے بھی ثابت ہے، بیہقی نے حکم بن عبدالملک، قتادہ اور حضرت انسؓ بن مالک سے ایک روایت کی ہے، جس میں تین۳ مرد اور ایک عورت یعنی چار۴ شخصوں کے قتل کا حکم ہے، تین ۳ مرد یہ ہیں، ابن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور عورت کا نام ام سارہ تھا، عبداللہ بن سعد کے قتل کی ایک انصاری نے نذر مانی تھی، مگر حضرت عثمانؓ کی سفارش سے ان کی جاں بخشی ہوئی، اور ام سارہ وہی عورت ہے جو فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کرنے کا خط خفیہ لے چلی تھی، اس روایت میں حکم بن عبدالملک متفقاً ناقابلِ اعتبار ہے، اور اس کی اس روایت کی نسبت عقیلی نے لکھا ہے کہ کوئی تائید اس کے دفقا میں سے کسی نے نہیں کی ہے، تہذیب ابن حجر) "س"

(اور شروع میں جو روایت ہے) اس کا ایک راوی احمد بن المفضل ہے، جس کو ازدی نے منکر الحدیث لکھا ہے، اور ایک راوی اسباط بن نصر ہے، جس کی نسبت نسائی کا قول ہے کہ "قوی نہیں ہے"۔ اگرچہ صرف اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لئے کافی نہیں، لیکن واقعہ جس درجہ اہم ہے، اس کے لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لئے کافی ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ بعض سردارانِ قریش جو مخالفین اسلام کے پیش رو تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر سن کر مکہ سے بھاگ گئے، لیکن یہ صرف ابنِ اسحاق کا قیاس ہے کہ وہ اس وجہ سے بھاگے تھے کہ ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا، ان اشتہاری مفرورین میں ابن اسحاق نے عکرمہ کو بھی شمار کیا ہے، جو ابو جہل کے فرزند تھے، لیکن موطاے امام مالکؒ میں جس کی نسبت امام شافعیؒ کا قول ہے کہ آسمان کے نیچے (قرآن کے علاوہ) کوئی کتاب اس سے زیادہ صحیح نہیں، یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"حارث بن ہشام کی صاحبزادی، ام حکیم، عکرمہ بن ابو جہل کی زوجہ تھیں، وہ فتحِ مکہ کے دن اسلام لائیں، لیکن ان کے شوہر عکرمہ بن ابو جہل اسلام سے بھاگ کر یمن چلے گئے، امِ حکیم یمن گئیں اور ان کو اسلام کی دعوت دی، اور وہ مسلمان ہو گئے اور مکہ میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی، پھر ان سے بیعت لی"۔ (کتاب النکاح)

یہ بات بھی اس موقع پر خاص طور سے لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جن لوگوں کو امن دیا جاتا تھا، وہ اسلام پر مجبور نہیں کئے جاتے تھے، تمام مورخین اور اربابِ سیر نے تصریح کی ہے کہ حنین کی لڑائی میں جو فتحِ مکہ کے بعد پیش آئی لشکرِ اسلام میں مکہ کے بہت سے کفار بھی شامل تھے، جو اس وقت تک کافر تھے، اور شکست بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ پہلے حملہ میں ان ہی کافروں کے قدم اکھڑے اور اس ابتری کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم بھی نہ ٹھہر سکے۔

خزائنِ حرم

حرم میں نذور اور ہدایا کا خزانہ ایک مدت سے جمع ہوتا چلا آتا تھا، وہ محفوظ رکھا گیا، لیکن مجسمہ جات اور تصویریں برباد کر دی گئیں، ان میں

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی تھی (۱)، جس سے لوگوں نے قیاس کیا کہ کسی زمانہ میں عیسائیت کا اثر زیادہ غالب ہو گیا تھا، رنگین تصویریں جو دیواروں پر تھیں مٹانے پر بھی ان کے دھندلے نشان رہ گئے تھے، اور حضرت عبد اللہؓ بن زبیرؓ کی تعمیر تک باقی رہے (۲)۔

مکہ معظمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام پندرہ دن تک رہا، جب یہاں سے روانہ ہوئے تو حضرت معاذؓ بن جبل کو اس خدمت پر مقرر کرتے گئے کہ لوگوں کو اسلام کے مسائل اور احکام سکھائیں۔

فتحِ مکہ اور بت شکنی

فتح مکہ کا اصلی مقصد اشاعتِ توحید اور اعلاء کلمۃ اللہ تھا، کعبہ میں سیکڑوں بت تھے، جن میں ہبل بھی تھا، جو بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا، یہ انسان کی صورت کا تھا، اور یاقوتِ احمر سے بنا تھا، سب سے پہلے جس نے اس کو کعبہ میں لاکر رکھا تھا، خزیمہ بن مدرکہ تھا جو مضر کا پوتا، اور عدنان کا پرپوتا تھا، ہبل کے سامنے سات تیر رہتے تھے، جن پر "لا" و "نعم" لکھا ہوا تھا، عرب جب کوئی کام کرنا چاہتے تھے، تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے، اور "ہاں" یا "ناں" جو کچھ نکلتا اس پر عمل کرتے (۳)، جنگِ اُحد میں ابو سفیان نے اسی ہبل کی جے پکاری تھی، وہ عین کعبہ کے اندر تھا، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے تو اور بتوں کے ساتھ وہ بھی برباد کر دیا گیا۔

مکہ کے اطراف میں اور بہت سے بڑے بڑے بت تھے، جن کے لئے حج کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں، ان میں سب سے بڑے لات، مناۃ اور عزیٰ تھے، عزیٰ قریش کا اور لات اہلِ طائف کا معبود تھا، مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر نخلہ ایک مقام ہے، عزیٰ یہیں منصوب تھا، بنو شیبان اس کے متولی تھے، اہلِ عرب کا اعتقاد تھا کہ خدا جاڑوں میں "لات" کے ہاں اور گرمیوں میں "عزیٰ" کے ہاں بسر کرتا ہے، عزیٰ کے سامنے عرب وہ تمام مناسک اور رسوم بجا لاتے تھے جو کعبہ میں بجا لاتے تھے، اس کا طواف کرتے، اور اس پر قربانیاں چڑھاتے (۴)۔

مناۃ کا تخت گاہ مشلّل تھا، جو قدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات میل ادھر ہے، وہ ایک بن گھڑا پتھر تھا، ازد، غسّان، اوس اور خزرج اس کا حج کرتے تھے، عمرو بن لحی نے جو اصنام

(۱) فتح الباری ذکر فتح مکہ۔ (۲) فتح الباری ذکر فتح مکہ (اخبار مکہ ازرقی میں بہ تفصیل یہ واقعات مذکور ہیں۔) (۳) معجم البلدان ذکرِ ہبل بحوالۂ ہشام بن محمد کلبی۔ (۴) یہ تمام تفصیل زرقانی جلد دوم صفحہ ۳۰۰ میں ہے۔

قائم کئے تھے۔ یہ ان سب میں بالاتر تھا۔ اوس اور خزرج جب کعبہ کا حج کرتے تو احرام اتارنے کی رسم (بال منڈانا) اسی کے پاس آکر ادا کرتے تھے (۱)۔

قبیلۂ ہذیل کا بت سواع تھا، جو ینبع کے اطراف رباط میں تھا۔ یہ ایک پتھر تھا۔ اس کے متولی بنولحیان تھے۔

بت پرستی کے یہ وہ طلسم تھے، جن میں سارا عرب گرفتار تھا۔ اب ان کی بربادی کا وقت آپکا تھا۔ اور دفعتاً ہر جگہ خاک اڑنے لگی۔

---

(۱) معجم البلدان، ذکر مناۃ۔

ہوازن و ثقیف

غزوۂ حنین و اوطاس و طائف

شوال ۸ھ

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (توبہ - ۹: ۲۵)

حنین حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے، ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل ہے (۱)، یہ اس کے دامن میں ہے، اس مقام کو اوطاس بھی کہتے ہیں (۲)، ہوازن ایک بڑے قبیلہ کا نام ہے، جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔

اسلام کی فتوحات کا دائرہ گو وسیع ہوتا جاتا تھا، لیکن اہلِ عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا قبلۂ اعظم یعنی مکہ اب تک محفوظ ہے، ان کا خیال تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر قریش پر غالب آگئے اور مکہ فتح ہو گیا تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، مکہ جب فتح ہوا تو تمام قبائل نے خود پیش قدمی کی اور اسلام قبول کرنا شروع کیا (۳)، لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا اثر پڑا، یہ قبیلے نہایت جنگ جو اور فنونِ جنگ سے واقف تھے، اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا جاتا تھا، یہ زیادہ مضطر ہوتے تھے (۴)، کہ ان کی ریاست اور امتیاز کا خاتمہ ہوا جاتا ہے، اس بنا پر فتح مکہ (کے بعد) ہوازن (اور ثقیف) کے رؤسا نے (یہ سمجھ لیا کہ اب ان کی باری ہے، اس لئے انہوں نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا اور آپس میں) قرارداد ہو گئی کہ (مسلمانوں کے خلاف جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں) ایک عام حملہ کر دیا جائے۔

---

(۱) (یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ اغلاق ہے، مطلب یہ ہے کہ حنین زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے مشہور بازار ذوالمجاز کے پاس ہے، جو عرفہ سے تین میل ہے، ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے۔) "س" (۲) (قاضی عیاض کی یہی رائے ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیار ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے، فتح الباری وزرقانی ذکر غزوۂ ہوازن واوطاس) "س"
(۳) صحیح بخاری ذکر فتح مکہ (بعد) باب مقام النبیؐ بمکۃ۔ (۴) مارگولیوس صاحب لکھتے ہیں: "حکومتِ اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل جن کو ریگستان کی آزادی بہت عزیز تھی نہایت خائف تھے"

(اس قرارداد کے مطابق یہ قبائل) بڑے زور شور کے ساتھ خود حملہ کے لئے بڑھے، جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ اپنے تمام اہل و عیال کو لے کر آیا تھا، کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہونگی، تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔

اس معرکہ میں اگرچہ ثقیف اور ہوازن کی تمام شاخیں شریک تھیں، تاہم کعب اور کلاب الگ رہے، فوج کی سرداری کے لئے انتخاب (تو) مالک (۱) بن عوف (کیا گیا جو) قبیلۂ ہوازن کا رئیسِ اعظم تھا (لیکن مشیر کی حیثیت سے) دُرید بن الصمہؓ (کو بھی ساتھ لے لیا گیا جو) عرب کا مشہور شاعر اور قبیلۂ جشم کا سردار تھا، اس کی شاعری اور بہادری کے معرکے اب تک عرب کی تاریخ میں یادگار ہیں، لیکن اس کی عمر سو برس سے زیادہ ہو چکی تھی، اور صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، تاہم چونکہ عرب اس کو مانتا تھا اور اس کی رائے و تدبیر پر تمام ملک کو اعتماد تھا، خود مالک بن عوف نے اس سے شرکت کی درخواست کی، پلنگ پر اٹھا کر اس کو میدانِ جنگ میں لائے، اس نے پوچھا کہ یہ کون سا مقام ہے، لوگوں نے کہا "اوطاس" بولا کہ "ہاں یہ مقام جنگ کے لئے موزوں ہے، اس کی زمین نہ بہت سخت ہے، نہ اس قدر نرم کہ پاؤں دھنس جائیں"۔ پھر پوچھا کہ "یہ بچوں کے رونے کی آوازیں کیسی آرہی ہیں"۔ لوگوں نے کہا کہ "بچے اور عورتیں ساتھ آئی ہیں کہ کوئی شخص پاؤں پیچھے نہ ہٹائے"۔ بولا کہ "جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی، میدانِ جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے، بدقسمتی سے اگر شکست ہوئی تو عورتوں کی وجہ سے اور بھی ذلت ہوگی"۔

پھر پوچھا کہ "کعب اور کلاب بھی شریک ہیں یا نہیں"۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان معزز قبیلوں کا ایک شخص بھی میدانِ جنگ میں نہیں تو کہا "اگر آج کا دن عزت و شرف کا دن ہوتا تو کعب اور کلاب غیر حاضر نہ ہوتے"۔ اس کی رائے تھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام میں فوجیں جمع کی جائیں اور وہیں اعلانِ جنگ کیا جائے، لیکن مالک بن عوف نے جو ۳۰ سالہ نوجوان تھا، جوشِ شباب میں اس رائے کے قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ خرف ہو چکے، آپ کی عقل بے کار ہو چکی (۲)۔

---

(۱) (مالکؓ بن عوف غزوۂ طائف کے بعد مسلمان ہو گئے تھے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جنگ قادسیہ میں شریک اور دمشق کے حاکم ہوئے، زرقانی ج ۳ ص ۶) "س"۔ (۲) یہ تمام تفصیل طبری میں ہے، (ج ۳ ص ۱۶۵۵ تا ۱۶۵۷) "س"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (مکہ میں) ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپؐ نے تصدیق کے لئے حضرت عبداللہؓ بن ابی حدرد کو بھیجا، وہ جاسوس بن کر حنین میں آئے اور کئی دن تک فوج میں رہ کر تمام حالات تحقیق کئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریاں کیں، رسد اور سامانِ جنگ کے لئے قرض کی ضرورت پیش آئی، عبداللہ بن ربیعہ جو ابو جہل کے بے مات بھائی تھے، نہایت دولت مند تھے، ان سے تیس٣٠ ہزار درہم قرض (۱) لئے، صفوان بن امیہ جو مکہ کا رئیسِ اعظم اور مہمان نوازی میں مشہور تھا، لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلحۂ جنگ مستعار مانگے، اس نے سو۱۰۰ زرہیں اور ان کے لوازمات پیش کئے (۲)۔

شوال سنہ ۸ھ مطابق جنوری و فروری سنہ ۶۳۰ء میں اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ۱۲ ہزار تھی، اس سروسامان سے حنین پر بڑھیں کہ (بعض) صحابہؓ کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ "آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے"۔ لیکن بارگاہِ ایزدی میں یہ نازش پسند نہ تھی۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ، ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ (توبہ۔ ۹: ۲۵، ۲۶)

اور حنین کا دن یاد کرو، جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے، لیکن وہ کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت کے تنگی کرنے لگی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل کی اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور کافروں کو عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے۔

فتح کے بجائے وہلۂ اول میں مطلع صاف تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص میں سے بھی کوئی پہلو میں نہ تھا (۳)، حضرت ابو قتادہؓ جو شریکِ جنگ

---

(۱) مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۳۶، اصابہ میں امام بخاری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے، لیکن اس میں دس۱۰ ہزار کی تعداد ہے۔
(۲) موطا میں ہے کہ جب آپؐ نے اس سے ہتھیار مانگے تو اس نے کہا جبراً یا طوعاً (یعنی جبراً مانگتے ہو تو میں نہیں دیتا) آپؐ نے فرمایا جبراً نہیں طوعاً (ابوداؤد باب الضمانہ میں بھی اسی قسم کی روایت ہے) (۳) لیکن اور روایتوں میں چند اصحاب کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے، ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہے کہ یہ دو مختلف وقفوں کے حالات ہیں۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۴ پر)

تھے، ان کا بیان ہے کہ جب لوگ بھاگ نکلے تو میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ ایک مسلمان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۳) راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے، تفصیل آگے آئے گی (مصنف نے آیندہ تفصیل کا جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا نہیں ہوسکا ہے، اس لئے تفصیل کی ضرورت ہے چنانچہ اس سلسلہ میں چند باتیں قابلِ تشریح ہیں۔

۱۔ پہلی یہ کہ مصنف نے اول وہلہ میں مسلمانوں کی شکست تسلیم کی ہے، یہ ابن اسحاق وغیرہ اہلِ سیر کی رائے ہے، لیکن حدیثِ صحیح کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی، لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے، دشمن کے تیراندازوں نے موقع پاکر تیراندازی شروع کردی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی، انتشار اور پراگندگی پیدا ہوگئی، بخاری میں حضرت براءؓ کے الفاظ یہ ہیں۔

وانالما حملنا علیهم انکشفوا فاکببنا علی الغنائم فاستقبلنا بالسهام (بخاری غزوۂ حنین)	اور ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھاکر پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے، تو انہوں نے ہم کو تیروں پر دھرلیا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض سے شریک ہی ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکا دیں، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ام سلیمؓ نے جو اس جنگ میں شریک تھیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یارسول اللہ! ان طلقاء کو قتل کردیجئے، ان ہی کی وجہ سے شکست ہوئی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:۔

اقتل من بعدنا من الطلقاء انهزموا بک (غزوۃ النساء مع الرجال)	ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کردیجئے ان ہی نے آپؐ کو شکست دلوائی۔

امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

لم یحصل الفرار من جمیعهم وانما فتحه علیهم من فی قلبه مرض من مسلمی اهل مکة المؤلفة ومشرکیها الذین لم یکونوا اسلموا وانما کانت هزیمتهم فجاءة لانصبابهم علیهم دفعة واحدة ورشقهم بالسهام ولاختلاط اهل مکة معهم ممن لم یستقر الایمان فی قلبه وممن یتربص بالمسلمین الدوائر وفیهم نساء وصبیان خرجوا للغنیمة (غزوۂ حنین)	سب لوگ نہیں بھاگے تھے بلکہ مکہ کے مؤلفۃ القلوب میں جو منافق تھے، اور مکہ کے مشرکین (جو اس جنگ میں شریک ہوگئے تھے، اور جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) انہوں نے بھاگنا شروع کیا تھا، اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے ہوئی کہ دشمنوں نے ایک ساتھ تیروں کی بارش شروع کردی تھی، اور فوج میں ایسے اہلِ مکہ بھی تھے جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا، اور مسلمانوں پر مصائب کے منتظر تھے، اس میں عورتیں اور بچے بھی تھے جو غنیمت کے لئے آئے تھے۔

مورخ طبری نے اس موقع پر مکہ کے ان طلقاء کی زبان سے جو فقرے نقل کئے ہیں وہ بھی اسی راز کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ اہلِ مکہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ دل سے نہ تھے (ج ۳ ص ۱۶۶۰ لائیڈن)

متقدم مفسروں میں سے ابن جریر طبری نے لکھا ہے: ان الطلقاء انجفلوا یومئذ بالناس وجلوا عن النبی صلی اللہ علیه وسلم (ابن جریر طبری ج ۱۰ ص ۶۲)

عہد متوسط کے مفسروں میں سے ابوحیان اندلسی کے الفاظ یہ ہیں:

یقال ان الطلقاء من اهل مکة فروا وقصدوا القاء الهزیمة	کہا جاتا ہے کہ مکہ کے طلقاء بھاگے تھے۔ اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵ پر)

سینہ پر سوار ہے. میں نے عقب سے اس کے شانہ پر تلوار ماری جو زرہ کو کاٹ کر اندر اتر گئی. اس نے مڑ کر مجھ کو اس زور سے دبوچا کہ میری جان پر بن گئی. لیکن پھر وہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا. اسی اثنا میں

فی المسلمین (بحر المحیط ج ۵ ص ۲۳) شکست ہو جائے۔

متاخر مفسروں میں سے صاحب روح المعانی نے تفسیر سورۂ توبہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:-

وکان اول من انہزم الطلقاء مکرا منھم وکان ذلک سببا لوقوع الخلل وھزیمۃ غیرھم (ج ۱۰ ص ۶۶)

سب سے پہلے طلقاء مکر و فریب سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے. اس سے مسلمانوں میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہوئی.

۳. تیسری بات یہ ہے کہ پسپائی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ثابت قدم رہی، اس سلسلہ میں بنائے اشتباہ بخاری کی حضرت انسؓ والی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

فادبروا عنہ حتی بقی وحدہ ۔ (لوگ پیچھے ہٹ گئے. یہاں تک کہ آپؐ تنہا رہ گئے) مصنف نے ان الفاظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے. لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے وہاں کوئی نہ تھا. اسی لئے اسی روایت میں حضرت انسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے. لبیک یا رسول اللہ ابشر نحن معک ! (ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ آپؐ خوش رہیں کہ ہم آپؐ کے پاس ہیں) اسی باب میں حضرت انسؓ کی ایک روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے الفاظ یہ ہیں:- لبیک یا رسول اللہ وسعدیک نحن بین یدیک (بخاری غزوۂ طائف) (ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ ہم آپؐ کے سامنے ہیں.)

حافظ ابن حجر نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی اور رفقائے خاص کے پاس رہنے کی تطبیق ان الفاظ میں کی ہے:-

ویجمع بین قولہ حتی بقی وحدہ وبین الاخبار الدالۃ علی انہ بقی معہ جماعۃ بان المراد بقی وحدہ متقدما علی العدو والذین ثبتوا معہ کانوا وراءہ (ج ۸ ص ۲۳ مصر)

اور اس قول میں کہ حضورؐ تنہا رہ گئے اور ان واقعات میں جو اس پر دال ہیں کہ حضورؐ کے ساتھ صحابہؓ کی ایک جماعت تھی. تطبیق یہ ہے. کہ حضورؐ دشمن کے سامنے سب سے آگے مقام میں تھے. اور جو آپؐ کے ساتھ ثابت قدم تھے. وہ آپؐ کے پیچھے تھے.

دوسرے یہ کہ بخاری ہی میں حضرت براءؓ کی جو روایت ہے اس میں حضرت براءؓ تصریح کرتے ہیں کہ ابو سفیانؓ بن حارث اس وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے. اور آپؐ کی سواری کی لگام تھامے تھے. (غزوۂ حنین. بخاری)

مسلم میں حضرت عباسؓ کے پر زور الفاظ یہ ہیں کہ میں نے اور ابو سفیانؓ بن حارث نے حضورؐ سے علحدگی اختیار نہیں کی،

فلزمت انا وابو سفیان بن الحارث بن عبد المطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم نفارقہ (مسلم غزوۂ حنین) صحیحین کی ان روایات کے سوا روایات ذیل بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے:

۱. ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے. چار آدمیوں کا حضورؐ کی خدمت میں باقی رہنا بتایا گیا ہے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

۲. ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم راہ سو آدمی نہیں باقی رہ گئے تھے (ترمذی ابواب الجہاد باب ما جاء فی الثبات عند القتال)

۳. مسند احمد (ج اول ص ۴۵۳) وحاکم میں حضرت عبد اللہؓ بن مسعود سے مروی ہے کہ اس دن حضورؐ کے ہمراہ اسی ۸۰ آدمی باقی رہ گئے تھے. (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

۴. بیہقی نے حارثہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۲۲) (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۶ پر)

میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا، پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے۔ بولے کہ قضائے الٰہی یہی تھی (۱) شکست کے مختلف اسباب تھے، مقدمۃ الجیش میں جو حضرت خالدؓ کی افسری میں تھا، زیادہ تر فتحِ مکہ کے جدید الاسلام نوجوان تھے، وہ جوانی کے غرور میں اسلحۂ جنگ پہن کر بھی نہیں آئے تھے (۲)، فوج میں دو ہزار طلقاء یعنی وہ لوگ تھے، جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے (۳) ہوازن قدر اندازی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، میدانِ جنگ میں ان کا ایک تیر بھی خالی نہیں جاتا تھا' (۴) کفار نے معرکہ گاہ میں پہلے پہنچ کر مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھائیوں، کھوؤں اور درّوں میں جا بجا جما دیئے تھے، فوجِ اسلام نے صبح کے وقت جب خوب اجالا بھی نہیں ہوا تھا، حملہ کیا، میدانِ جنگ اس قدر نشیب میں تھا کہ پاؤں جم نہیں سکتے تھے، حملہ آوروں کا بڑھنا تھا کہ سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں، ادھر کمین گاہوں سے قدر اندازوں کے دستے نکل آئے اور تیروں کا مینھ برسا دیا، مقدمۃ الجیش ابتری کے ساتھ بے قابو ہو کر پیچھے ہٹا اور پھر تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ صحیح بخاری میں ہے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵) ابو نعیم نے دلائل میں سو۱۰۰ کی تفصیل بتلائی ہے کہ تینتیس۳۳ سے کچھ زائد مہاجرین تھے، بقیہ انصار تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

۵۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت مہاجرین، انصار اور اہلِ بیت میں سے حسب ذیل اصحاب موجود تھے،

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب، حضرت ابو سفیانؓ بن حارث، حضرت جعفرؓ ابن ابی سفیان بن حارث، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت ربیعہؓ بن حارث، حضرت اسامہؓ بن زید، حضرت ایمنؓ بن ام ایمن،

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت انسؓ کے الفاظ "بقی وحدہ" اپنے ظاہری معنی پر باقی نہیں رہ سکتے، حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ آگے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے، لیکن اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کا ظاہر کرنا مقصود ہے ورنہ حقیقت یہ نہ تھی۔

دوسری روایات میں ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں (ملاحظہ ہو زرقانی ج ۳ ص ۳۲) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس تھے، اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں حضورؐ کے پاس پہنچنے لگے، یہاں تک کہ خاصی جماعت حضور کے گرد جمع ہو گئی، اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتلائی ہے) "س"

(۱) صحیح بخاری غزوۂ حنین (ج ۱ ص ۶۱۸) "س" (۲) بخاری باب الجہاد (باب من صف اصحابہ عند الہزیمۃ ونزل عن دابتہ) "س" (۳) مصنف کا یہ فقرہ واضح نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ گو وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے، جیسا کہ عمدۃ القاری جلد ہشتم ص ۳۰۹ مصر اور شرح مسلم نووی غزوۃ النساء مع الرجال میں ہے، لیکن ہنوز وہ تازہ مسلمان تھے، راسخ الاسلام نہیں ہوئے تھے، اس لئے مہاجرین و انصار جیسا استقلال و ثبات ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ "س" (۴) بخاری باب الجہاد (باب مذکور) "س"

فادبر وا عنہ حتی بقی وحدہ (۱) یعنی سب لوگ ٹل گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے۔

تیروں کا مینھ برس رہا تھا، بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئی تھیں، لیکن ایک پیکرِ مقدس پا بر جا تھا جو تنہا ایک فوج، ایک ملک، ایک اقلیم، ایک عالم، بلکہ مجموعہ کائنات تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا یا معشر الانصار! آواز کے ساتھ صدا آئی "ہم حاضر ہیں"۔ پھر آپؐ نے بائیں جناب مڑ کر پکارا، اب بھی وہی آواز آئی، آپؐ سواری سے اتر پڑے، اور جلالِ نبوت کے لہجہ میں فرمایا "میں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں"۔ (۲)

بخاری کی دوسری روایت میں ہے،

انا النبی لا کذب	میں پیغمبر ہوں، یہ جھوٹ نہیں ہے،
انا ابن عبد المطلب	میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں،

حضرت عباسؓ نہایت بلند آواز تھے، آپؐ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو، انہوں نے نعرہ مارا:

یا معشر الانصار	او گروہِ انصار!
یا اصحاب الشجرۃ	او اصحاب الشجرۃ (بیعتِ رضوان والے)

اس پر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعتاً پلٹ پڑی، جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے، انہوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے، دفعتاً لڑائی کا رنگ بدل گیا، کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ تھی) جم کر لڑے، لیکن ان کے ستر آدمی مارے گئے، اور جب ان کا علم بردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔

شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر (کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ) طائف میں جا کر پناہ گزیں ہوئی، جس کے ساتھ سپہ سالارِ لشکر (مالک بن عوف) بھی تھا۔

اوطاس | درید بن الصمۃ کئی ہزار کی جمعیت لے کر اوطاس میں آیا، آنحضرت

---

(۱) (بخاری غزوۂ طائف) (۲) صحیح بخاری جلد دوم ص ۶۲۱ غزوۂ طائف۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ابو عامر اشعریؓ کے ماتحت) تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کے لئے بھیج دی، (حضرت ابو عامرؓ درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے، اور علم اسلام اس کے ہاتھ میں تھا، یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے چھین لیا) (۱) درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا، ربیعہؓ بن رفیع نے اس پر تلوار کا وار کیا لیکن اچٹ کر رہ گئی، اس نے کہا "تیری ماں نے تجھ کو اچھے ہتھیار نہیں دیئے"۔ پھر کہا کہ "میرے محمل میں تلوار ہے نکال لو اور جب اپنی ماں کے پاس واپس جانا تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا" ربیعہ نے جا کر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی تو اس نے کہا "خدا کی قسم درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا تھا"۔ (۲)

اسیران جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی، ان میں حضرت شیماؓ بھی تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھیں، لوگوں نے جب ان کو گرفتار کیا تو انہوں نے کہا "میں تمہارے پیغمبرؐ کی بہن ہوں"۔ لوگ تصدیق کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، انہوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی کہ ایک دفعہ بچپن میں آپؐ نے دانت سے کاٹا تھا، یہ اس کا نشان ہے"۔ فرط محبت سے آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ان کے بیٹھنے کے لئے خود ردائے مبارک بچھائی، محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ "جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے" (۳) انہوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا، چنانچہ عزت و احترام کے ساتھ پہنچا دی گئیں۔

محاصرۂ طائف

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر پناہ گزیں ہوئی، اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، طائف نہایت محفوظ مقام تھا، طائف اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی، یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا، نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہم سر تھا، عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا، ابو سفیان (حضرت امیر معاویہؓ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی، کفار مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے روسا پر اترتا، یہاں کے لوگ فن جنگ سے بھی واقف تھے، طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمۃ نے جُرش

(۱) (مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۳۹۹) (۲) طبری (ج ۳) ص ۱۶۶۶ مطبوعۂ یورپ، (۳) طبقات ابن سعد و اصابہ و طبری (جلد ۳ صفحہ ۱۶۶۸)

(یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی دبّابہ، ضبُور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا (۱)۔

یہاں ایک محفوظ قلعہ تھا، اہلِ شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی، سال بھر کی رسد کا سامان جمع کیا، چاروں طرف منجنیقیں اور جا بجا قدر انداز متعین کئے (۲)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا، حضرت خالدؓ مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیئے گئے تھے، غرض محاصرہ ہوا، اور اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبّابہ اور منجنیق استعمال کئے گئے، دبّابہ پر اہلِ قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں، اور اس شدت کی تیر باری کی کہ حملہ آوروں کو ہٹنا پڑا، بہت سے لوگ زخمی ہوئے، بیس دن تک محاصرہ رہا، لیکن شہر فتح نہ ہو سکا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوفلؓ بن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا، لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے، اگر کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی، لیکن چھوڑ دی جائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں۔

چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی، آنحضرت صلی اللہ نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے، صحابہؓ نے عرض کی آپؐ ان کو بددعا دیں، آپؐ نے یہ دعا دی (۳)

اللھم اھد ثقیفا وائت بھم — اے خدا ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔

تقسیمِ غنائم

محاصرہ چھوڑ کر آپؐ جعرانہ تشریف لائے، غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا، چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار (سے زیادہ) بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی (۴)، اسیرانِ جنگ کے متعلق آپؐ نے انتظار کیا کہ ان کے عزیز و اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے، لیکن کئی دن گذرنے پر کوئی نہ آیا، مالِ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے، چار حصے حسبِ قاعدہ اہلِ فوج کو تقسیم کئے گئے، خُمس بیت المال اور غرباء و مساکین کے لئے رکھا گیا۔

مکہ کے اکثر رؤساء، جنہوں نے حال میں اسلام قبول کیا تھا، ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے،

---

(۱) طبری (ج ۳) ص ۱۶۶۹ مطبوعۂ یورپ۔ (۲) تاریخِ خمیس ج ۲ ص ۱۲۲ و ابن سعد۔ (۳) ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۵) س" (۴) طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۰) "س"

ان ہی کو قرآن مجید میں مولفۃ القلوب کہا ہے، قرآن مجید میں جہاں زکوٰۃ کے مصارف بیان کئے ہیں، ان لوگوں کا نام بھی ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان لوگوں کو نہایت فیاضانہ انعامات دیئے جن کی تفصیل یہ ہے:

ابوسفیان، مع اولاد،	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ - اوقیہ چاندی،
حکیم بن حزام،	۲۰۰ اونٹ،
نُضیر بن حارث بن کلدہ ثقفی،	۱۰۰ اونٹ،
صفوان بن امیہ،	۱۰۰ اونٹ،
قیس بن عدی،	۱۰۰ اونٹ،
سہیل بن عمرو،	۱۰۰ اونٹ،
حویطب بن عبدالعزیٰ،	۱۰۰ اونٹ،

(ان کے علاوہ تین غیر ملکی نومسلم رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)

اقرع بن حابس تمیمی	۱۰۰ اونٹ،
عیینہ بن حصن (فزاری)	۱۰۰ اونٹ،
مالک بن عوف (نصری)	۱۰۰ اونٹ،

ان کے سوا بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے، عام تقسیم کی رو سے فوج کے حصہ میں جو آیا وہ فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں، لیکن چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا، اس لئے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس ۱۲۰ بکریاں آئیں (۱)۔

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی، عموماً اہلِ مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے، اس پر انصار کو رنج ہوا، بعضوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں (۲)، بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے (۳)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چرچے سنے تو انصار کو طلب فرمایا، ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا، جس میں لوگ جمع ہوئے، آپؐ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ تم نے ایسا کہا؟

(۱) (طبقات ابن سعد جزء مغازی ص ۱۱۰ اور زرقانی علی المواہب ج ۳ ص ۴۲) " س " (۲) صحیح بخاری غزوۂ طائف (۳) صحیح بخاری مطبوعہ مطبع نظامی صفحہ ۶۲۱۔

لوگوں نے عرض کی کہ "حضور! ہمارے سر برآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا، نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے" (۱)، صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلاکر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انہوں نے کہا "آپؐ نے جو سنا صحیح ہے"۔

آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فنِ بلاغت میں نہیں مل سکتی۔ انصار کی طرف خطاب فرماکر کہا۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو دولت مند کیا"۔

آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے، اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ "خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے" (۲)۔

آپؐ نے فرمایا نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تھا، ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔

یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر اپنے گھر آؤ"۔

انصار بے اختیار چیخ اٹھے۔ "ہم کو صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہیں"۔ اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں۔ آپؐ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں۔ میں نے ان کو جو کچھ دیا، حق کی بنا پر نہیں بلکہ تالیفِ قلب (۳) کے لئے دیا۔

حنین کے اسیرانِ جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے، ایک معزز سفارت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیرانِ جنگ رہا کر دیئے جائیں، یہ وہ قبیلہ تھا

---

(۱) صحیح بخاری ص ۶۲۰ (باب غزوہ طائف) ص "۔ (۲) صحیح بخاری صفحہ ۶۲۰ (باب غزوۂ طائف و فتح الباری جلد ۸ ص ۴۱) ۴۱ "۔ (۳) صحیح بخاری و فتح الباری، پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔

کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ اسی قبیلہ کی تھیں، رئیسِ قبیلہ (زہیر بن صُرد) نے کھڑے ہو کر تقریر کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہو کر کہا "جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں، انہی میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں، خدا کی قسم اگر سلاطینِ عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں، اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خاندانِ عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہے وہ تمہارا ہے، لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو"۔ نماز ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی، آپؐ نے فرمایا "مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے، لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کے لئے سفارش کرتا ہوں"۔ مہاجرین اور انصار بول اٹھے، ہمارا حصہ بھی حاضر ہے، اس طرح چھ ہزار دفعتاً آزاد تھے (۱)۔

واقعاتِ متفرقہ

(حضرت ماریہؓ کے بطن سے اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم رکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بچہ سے نہایت محبت تھی، ڈیڑھ سال (۱۷ یا ۱۸ سترہ یا اٹھارہ مہینے) زندہ رہا، جس دن ابراہیم نے وفات پائی، سورج گرہن ہوا، عرب کا عقیدہ تھا کہ سورج گرہن کسی عظیم الشان انسان کے موت کی علامت ہے، لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابراہیم کی موت کا نتیجہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ "سورج اور چاند خدا کی قدرت ہیں، کسی کے مرنے اور جینے سے ان میں گرہن نہیں لگتا"۔ اس کے بعد آپؐ نے کسوف کی نماز باجماعت ادا فرمائی (۲)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔

---

(۱) (طبری ج ۳ ص ۱۶۷۶ - (۲) بخاری باب کسوف)۔

%%%%%%%%%%

سنہ ۹ ھ

واقعۂ ایلاء و تخییر و غزوۂ تبوک

ایلاء اور تخییر سنہ ۹ ھ (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زاہدانہ اور تمام زخارف دنیوی سے بے گانہ زندگی بسر کرتے تھے، دو ۲ دو ۲ مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے، مدۃ العمر دو ۲ وقت برابر سیر ہو کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔

ازواج مطہرات اس جنسِ لطیف میں شامل تھیں جن کی مرغوب ترین چیز عموماً زیب و زینت اور ناز و نعمت ہے، اور گو شرف صحبت نے ان کو تمام ابنائے جنس سے ممتاز کر دیا تھا، تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی، خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحات اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور غنیمت کا سرمایہ اس قدر پہنچ گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت و آرام کے لئے کافی ہو سکتا ہے، ان واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کے صبر و قناعت کا جام لبریز ہو جاتا تھا۔

ازواج مطہرات میں بڑے بڑے گھرانوں کی خاتونیں تھیں، حضرت ام حبیبہؓ تھیں، جو رئیسِ قریش کی صاحبزادی تھیں، حضرت جویریہؓ تھیں جو قبیلۂ بنی المصطلق کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہؓ تھیں جن کا باپ خیبر کا رئیسِ اعظم تھا، حضرت عائشہؓ تھیں جو حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی تھیں، حضرت حفصہؓ تھیں جن کے والد فاروقِ اعظمؓ تھے، بشریت کے اقتضا سے ان میں منافست بھی تھی اور حریف کے مقابلہ میں اپنے رتبہ اور شان کا خیال رہتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر ایک کو جو شدید محبت تھی وہ

ع باسایہ ترا نمی پسندم کی حد تک تھی۔

---

(۱) (بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ ذو الحجہ سنہ ۵ ھ کا واقعہ ہے، اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ نزولِ حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے۔ لیکن آگے چل کر حضرت عمرؓ کی روایت میں مذکور ہے کہ جب اس حادثہ کی مبہم خبر سے مسلمانوں میں اضطراب دیکھا تو سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا، جس کی اطلاع پہلے ہو چکی تھی، غسان کا حملہ سنہ ۹ ھ میں ہونے والا تھا، حافظ ابن حجر اور محدث دمیاطی نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ یہ اوائل سنہ ۹ ھ کا واقعہ ہے (دیکھو فتح الباری جلد ۹ ص ۲۵۰) "س"۔

ایک دفعہ کئی دن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آگیا تھا، انھوں نے آپؐ کے سامنے پیش کیا، آپؐ کو شہد بہت مرغوب تھا، آپؐ نے نوش فرمایا، اس میں وقت مقررہ سے دیر ہو گئی، حضرت عائشہؓ کو رشک ہوا، حضرت حفصہؓ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمارے یا تمہارے گھر میں آئیں تو کہنا چاہیئے کہ آپؐ کے منھ سے مغافیر کی بو آتی ہے، (مغافیر کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں شہد نہ کھاؤں گا، اس پر قرآن مجید (۱) کی یہ آیت اتری:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ (تحریم: ۶۶: ۱)	اے پیغمبر! اپنی بیویوں کی خوشی کے لئے تم خدا کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو،

علامہ عینی نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے۔

فان قلت كيف جاز لعائشة و حفصة الكذب والمواطاة التى فيها ايذاء رسول الله صلى الله عليه وسلم قلت كانت عائشة صغيرة مع انها وقعت منها من غير قصد الايذاء بل على ماهو من جبلة النساء فى الغيرة على الضرائر (تفسیر سورۂ تحریم)	اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو جھوٹ بولنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازش کرنا کیوں کر جائز تھا، تو جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کم سن تھیں، اس کے علاوہ ان کا مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا نہیں تھا، بلکہ جیسا کہ عورتیں اپنی سوکنوں کے مقابلہ میں رشک سے تدبیریں اختیار کرتی ہیں اس طرح کی ایک تدبیر تھی۔

لیکن علامۂ موصوف کا جواب تسلیم کرنا مشکل ہے، اول تو یہ واقعہ ایلاء کے واقعہ کے سلسلہ میں ہے، جو سنہ ۹ھ میں واقع ہوا تھا، اس وقت حضرت عائشہؓ سترہ۱۷ برس کی ہو چکی تھیں، دوسرے حضرت عائشہؓ کم سن تھیں، لیکن اور ازواج مطہراتؓ جو اس میں شریک ہوئیں وہ تو پوری عمر کی تھیں، خود حضرت حفصہؓ کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے وقت

(۱) صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم، اس واقعہ کو بخاری کتاب الطلاق میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، جس میں یہ بھی ہے کہ اس تدبیر میں اور ازواجِ مطہرات بھی شریک کر لی گئیں، اور جس نے اول اس کا اظہار کیا وہ حضرت سودہؓ تھیں۔

۳۵ برس کی تھی۔

ہمارے نزدیک مغافیر کی بو کا اظہار کرنا کوئی جھوٹ بات نہ تھی، تمام روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لطیف المزاج تھے، اور رائحہ کی ذرا سی ناگواری کو برداشت نہیں فرما سکتے تھے (۱) مغافیر کے پھولوں میں اگر کسی قسم کی کرختگی ہو تو تعجب (۲) کی بات نہیں، البتہ ازواج مطہراتؓ کا ایکا کرنا بہ ظاہر محلِ اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن یہ کسی کا اعتقاد نہیں کہ ازواجِ مطہراتؓ معصوم تھیں، یا اپنے انجاحِ مقصد کے لئے جائز وسائل نہیں اختیار کرتی تھیں، اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہؓ سے فرمائی اور تاکید کر دی کہ کسی سے نہ کہنا، لیکن انہوں نے حضرت عائشہؓ سے کہہ دیا، اس پر یہ آیت اتری:۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَاَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَھَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَکَ ھٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (تحریم۔ ۶۶: ۳)	اور جب کہ پیغمبر نے اپنی بعض بیویوں سے راز کی بات کہی اور انہوں نے فاش کر دی اور خدا نے پیغمبر کو اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے اس کا کچھ حصہ ان سے کہا اور کچھ چھوڑ دیا، پھر جب ان سے کہا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی، پیغمبر نے کہا مجھ کو خدائے عالم خبیر نے خبر دی۔

شکر رنجیاں بڑھتی گئیں اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ نے باہم مظاہرہ کیا یعنی دونوں نے اس پر اتفاق کیا کہ دونوں مل کر زور ڈالیں، اس پر حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ کی شان میں یہ آیتیں اتریں:۔

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا وَاِنْ تَظٰھَرَا عَلَیْہِ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰہُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَھِیْرٌ ۝ (تحریم۔ ۶۶: ۴)	اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو تمہارے دل مائل ہو چکے ہیں اور اگر ان کے (یعنی رسول اللہ) کے مقابلہ میں ایکا کرو تو خدا اور جبریل اور نیک مسلمان اور سب کے بعد فرشتے رسول اللہ کے مددگار ہیں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے جن معاملات کی وجہ سے ایکا کیا تھا وہ خاص تھے، لیکن توسیعِ نفقہ کے تقاضے میں تمام ازواجِ مطہراتؓ شریک تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) (مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۲۴۹) "س" (۲) عمدۃ القاری جلد ۹ صفحہ ۲۴۶ "س"

کے سکونِ خاطر میں یہ تنگ طلبی اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپؐ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواجِ مطہرات سے نہ ملیں گے، اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں آپؐ گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آیا، آپؐ نے بالاخانہ (۱) پر تنہا نشینی اختیار کی، واقعات کے قرینہ سے لوگوں نے خیال کیا کہ آپؐ نے تمام ازواج کو طلاق دی، اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کو ہم حضرت عمرؓ کی زبان سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے دلچسپ اور پر اثر تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا ہے، اس بیان میں کچھ ابتدائی واقعات بھی آگئے ہیں، جن سے اصل معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے (۲)۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ "میں اور ایک انصاری (اوس بن خولی یا عتبان بن مالک) ہمسایہ تھے، اور معمول تھا کہ باری باری سے ایک دن بیچ دے کر ہم دونوں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے"۔

قریش کے لوگ عورتوں پر قابو رکھتے تھے اور ان پر غالب رہتے تھے، لیکن جب مدینہ میں آئے تو یہاں انصار کی عورتیں مردوں پر غالب تھیں، ان کا انداز دیکھ کر ہماری عورتوں نے بھی ان کی تقلید شروع کی، ایک دن میں نے کسی بات پر اپنی بیوی کو ڈانٹا، انہوں نے الٹ کر جواب دیا، میں نے کہا تم میری بات کا جواب دیتی ہو، بولیں تم کیا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ان کو برابر کا جواب دیتی ہیں، یہاں تک کہ دن بھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روٹھی رہتی ہیں، میں نے دل میں کہا، غضب ہو گیا، اٹھ کر حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ) کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا تو واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رات بھر روٹھی رہتی ہے، حفصہؓ نے اقرار کیا، میں نے کہا تجھ کو یہ خیال نہیں کہ رسولؐ کی ناراضی خدا کی ناراضی ہے،

---

(۱) بالاخانہ کے لئے احادیث میں مشربہ کا لفظ آیا ہے، مشربہ کے نام سے زیادہ تر مشربۂ ام ابراہیم (ماریہ) مشہور ہے، اسی لئے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ وہی بالاخانہ تھا لیکن یہ قطعاً غلط ہے، مشربۂ ام ابراہیم مدینہ سے باہر واقع تھا، حضرت عمرؓ کی جو روایت تمام صحاح میں موجود ہے، اور جس کو مصنف نے آگے نقل کیا ہے، اس سے بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا جو حضرت حفصہؓ کے گھر اور مسجدِ نبویؐ سے بالکل متصل تھا کہ حضرت عمرؓ دوڑ دوڑ کر جلدی جلدی کبھی اِدھر کبھی اُدھر جاتے تھے، ابو داؤد میں تصریح ہے کہ یہ مشربہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کا بالاخانہ تھا جو مسجدِ نبویؐ ہی سے متصل دیگر ازواجِ مطہرات کے حجروں کے برابر تھا (ابو داؤد باب الامام یصلی من قعود)" س ۷ (۲) یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب یعنی کتاب النکاح، طلاق، کتاب العلم میں باختلاف عبارت منقول ہے، صحیح مسلم باب النکاح میں بھی کئی طریق سے مذکور ہے، ان روایتوں میں باہم جزئیات میں اختلاف ہے، ہم نے تا امکان سب روایتوں کو جمع کیا ہے۔

بخدا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا خیال فرماتے ہیں ورنہ تجھ کو طلاق دے چکے ہوتے، پھر حضرت ام سلمہؓ کے پاس گیا اور ان سے بھی یہی شکایت کی، بولیں کہ عمرؓ! تم ہر معاملہ میں دخل دینے لگے، یہاں تک کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی ازواج کے معاملات میں بھی دخل دیتے ہو، میں چپ رہ گیا اور اٹھ کر چلا آیا۔

"کچھ رات گئی، میرے ہمسایہ انصاری باہر سے آئے اور بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، میں گھبرا کر اٹھا اور دروازہ کھول کر پوچھا خیر ہے؟ انہوں نے کہا غضب ہو گیا، میں نے کہا کیا غسانی (۱) مدینہ پر چڑھ آئے، بولے کہ نہیں، اس سے بھی بڑھ کر یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کو طلاق دے دی، میں صبح کو مدینہ آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز فجر ادا کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر بالاخانہ میں تنہا جا کر بیٹھ گئے، میں حفصہؓ کے پاس آیا تو دیکھا وہ بیٹھی رو رہی ہے، میں نے کہا "میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا"، حفصہؓ کے پاس سے اٹھ کر مسجد نبویؐ میں آیا، دیکھا تو صحابہ منبر کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، میں ان کے پاس بیٹھ گیا، لیکن طبیعت کو سکون نہیں ہوتا تھا، اٹھ کر بالاخانہ کے پاس آیا، اور رباح (خادم خاص) سے کہا اطلاع کرو، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہیں دیا۔

اٹھ کر پھر مسجد میں چلا آیا، اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بے تاب ہو کر بالاخانہ کے نیچے آیا، اور دربان سے دوبارہ اذن طلبی کی درخواست کی، جب کچھ جواب نہیں ملا تو میں نے پکار کر کہا رباح! میرے لئے اذن مانگ، شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہے کہ میں حفصہؓ کی سفارش کرنے آیا ہوں، خدا کی قسم رسول اللہؐ فرمائیں تو حفصہؓ کی گردن اڑادوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، اندر گیا تو دیکھا کہ آپؐ کھری چارپائی (۲) پر لیٹے ہیں اور جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں، ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہوئے تھے، ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کھونٹی پر لٹک رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبب پوچھا، میں نے عرض کی اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا، قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور پیغمبر ہو کر آپؐ کی یہ حالت ہے،

---

(۱) غسانی عرب کا ایک خاندان تھا جو شام میں رومیوں کے ماتحت بادشاہی کرتا تھا، وہ رومیوں کی تحریک سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا (۲) بعض روایتوں میں حصیر (چٹائی) کا لفظ آیا ہے اور بعض میں سریر (چارپائی)، ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ وہ تھی چارپائی، لیکن چٹائی جس سے بنی جاتی ہے، اس سے بنی ہوئی تھی۔ (فتح الباری جلد ۹ ص ۲۵۱)

آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہم آخرت"۔

میں نے عرض کی کیا آپؐ نے ازواج کو طلاق دے دی؟ فرمایا "نہیں" میں اللہ اکبر پکار اٹھا، پھر عرض کی کہ مسجد میں تمام صحابہؓ مغموم بیٹھے ہیں اجازت ہو تو جا کر خبر کر دوں کہ واقعہ غلط ہے، چونکہ ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گذر چکا تھا، آپؐ بالاخانہ سے اتر آئے (۱) اور عام باریابی کی اجازت ہو گئی، اس کے بعد آیت تخییر نازل ہوئی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَٰجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَٱلدَّارَ ٱلْءَاخِرَةَ فَإِنَّ ٱللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَٰتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (الاحزاب: ۲۱-۲۸)	(اے پیغمبر اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب و آرائش مطلوب ہے تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر بہ طریق احسن رخصت کر دوں اور اگر خدا، خدا کا رسول اور آخرت مطلوب ہے تو خدا نے تم میں سے نیکو کاروں کے لئے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے۔)

اس آیت کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ازواج مطہراتؓ کو مطلع فرمادیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں، دنیا اور آخرت، اگر تم دنیا چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم خدا اور رسول اور زندگانیِ ابدی کی طلبگار ہو تو خدا نے نکو کاروں کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

مہینہ ختم ہو چکا تھا، آپ بالاخانہ سے اترے اور چونکہ ان تمام معاملات میں حضرت عائشہؓ پیش پیش تھیں، ان کے پاس تشریف لے گئے اور مطلع فرمایا، انہوں نے کہا میں سب کچھ چھوڑ کر

---

(۱) (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق ۲۹ روز بالاخانہ پر تشریف فرما رہے، حضرت عمرؓ کا یہ مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے یا آخر روز کا، اس روایت کے جتنے طرق ہیں ان کا ابتدائی ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ یہ پہلے ہی دن کا واقعہ ہے اور آخر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ انتیسویں روز کا واقعہ ہے، مصنف مرحوم نے آخری فقروں کا لحاظ کیا ہے، اور بظاہر اس کو انتیسویں روز کا واقعہ سمجھا ہے، لیکن اس بنا پر لازم آتا ہے کہ ۲۸ دن تک گویا حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کو واقعۂ ایلاء کی اطلاع ہی نہ تھی، حالانکہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا، اس بنا پر محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ اس مکالمہ کا اکثر حصہ پہلے روز کا واقعہ ہے لیکن صرف اترنے کا بیان آخر روز کا واقعہ ہے، راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا، بخاری کی اس روایت سے جو کتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ لحال زوجھا اور کتاب اللباس باب ما کان یتجوز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اللباس میں مذکور ہے یہ صاف تصریح موجود ہے، اس بنا پر اس فقرہ کو یوں پڑھنا چاہیئے جب ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گذر چکا) "س"

خدا اور رسول کو لیتی ہوں، تمام اور ازواجِ مطہراتؓ نے بھی یہی جواب دیا۔

ایلاء، تخییر، مظاہرۂ حفصہؓ و عائشہؓ، یہ واقعات عام طور پر اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں کے واقعات ہیں، اور ان سے ایک ظاہر بین یہ دھوکہ کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ بسر کرتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، صحیح بخاری باب النکاح (باب موعظۃ الرجل ابنتہ) میں حضرت ابن عباسؓ کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے، اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرۂ ازواجِ مطہراتؓ سے انعزال، افشائے راز، آیتِ تخییر کا نزول سب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں۔

حافظ ابن حجر انعزال کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں:۔

وهذا هو اللائق بمكارم اخلاقه صلی اللہ علیہ وسلم وسعة صدره و كثرة صفحه وان ذلك لم يقع منه حتى تكرر موجبه منهن (فتح الباری جلد ۹ ص ۲۵۴)	(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق، کشادہ دلی اور کثرتِ عفو کے یہی مناسب ہے، اور آپؐ نے اس وقت تک ایسا نہیں کیا ہوگا جب تک ان سے اس قسم کی حرکتیں متعدد بار ظہور پذیر نہ ہوئیں)

مظاہرہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی ضرر رساں سازش تھی جس کا اثر بہت پرخطر تھا، آیتِ مذکور یہ ہے:

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (تحریم۔ ۶۶ : ۴)	اور اگر تم دونوں (حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ) رسولؐ کے برخلاف ایکا کرو تو خدا اس کا مولا ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور ان سب کے ساتھ فرشتے بھی مددگار ہیں۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ اگر ان دونوں کا ایکا قائم رہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کو خدا اور جبریلؑ اور نیک مسلمان موجود ہیں، اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتے بھی اعانت کے لئے تیار ہیں۔

روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے وہ نفقہ

کی توسیع چاہتی تھیں، اور اگر ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کرلی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کردی جائیں۔ لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پرخطر ہو سکتی ہے، جس کی مدافعت کے لئے ملاء اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو۔

اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا جن کی تعداد (۳۰۰) تک بیان کی گئی ہے، یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوادیں (ابن حجر نے اصابہ میں ام جلدح کے حال میں لکھا ہے وکانت تحرش بین ازواج النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم (وہ ازواجِ مطہراتؓ کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں) افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آچکی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ۱۵ دن تک حضرت عائشہؓ سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسانؓ افک میں شریک ہوگئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی حمنہ جو حضرت زینبؓ کی بہن تھیں، سازش میں آگئی تھیں، چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایک قریبی عزیز (مسطح) کو جو شریک تہمت تھے، مالی امانت سے محروم کردیا تھا، غرض اگر حضرت عائشہؓ کی برأت پر وحی نہ آجاتی تو ایک فتنۂ عظیم برپا ہوچکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواجِ مطہراتؓ کی کشیدگی خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دے کر بھڑکانا چاہا ہوگا، چونکہ مظاہرہ کے ارکانِ اعظم حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ تھیں، ان کو خیال ہوا ہوگا کہ اُن کے ذریعہ سے اُن کے والدین (حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ) کو اس سازش میں شریک کرلینا ممکن ہے، لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو رسول کی خاک پر قربان کرسکتے تھے، چنانچہ جب حضرت عمرؓ کو اذن نہ ملا تو انہوں نے پکار کر کہا کہ ارشاد ہو تو حفصہؓ کا سر لے کر آؤں۔

آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے، یعنی اگر عائشہؓ و حفصہؓ سازش بھی کریں گی اور منافقین اس سے کام لیں گے تو خدا پیغمبر کی اعانت کے لئے موجود ہے، اور خدا کے ساتھ جبریلؑ و ملائکہ بلکہ تمام عالم ہے۔

روایاتِ کاذبہ

ان واقعات میں کذابین رواۃ نے اس قدر تلبیسات اور خداعیاں کی ہیں کہ بڑے بڑے مورخین و اربابِ سیر نے یہ روایتیں اپنی تصانیف میں اسناداً درج کردیں، اس لئے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

اس قدر عموماً مسلم ہے اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہراتؓ کی خاطر سے کوئی چیز اپنے اوپر حرام کرلی تھی، اختلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں جن کو عزیزِ مصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحفتاً بھیجا تھا، ماریہ قبطیہ کی روایت تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے جن میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز جو حضرت حفصہؓ نے فاش کردیا تھا، ان ہی ماریہ قبطیہ کا راز تھا۔

اگرچہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور ناقابلِ ذکر ہیں، لیکن چونکہ یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معیارِ اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں، ان کا گلِ سرسبد یہی ہیں، اس لئے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے۔

ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ نہایت اختلاف ہے، لیکن اس قدر سب کا قدر مشترک ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موطوءۃ کنیزوں میں تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کی ناراضی کی وجہ سے ان کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔

حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں:

ووقع عند سعيد بن منصور باسناد صحيح الى مسروق قال حلف رسول الله صلى الله عليه وسلم لحفصة لايقرب امته (ص ۵۰۳ ج ۸)	اور سعید بن منصور نے سندِ صحیح کے ساتھ جو مسروق تک منتہی ہوتی ہے، یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کریں گے۔

اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند (ہیثم بن کلیب) اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

وللطبرانی من طريق الضحاک	اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ میں حضرت

عن ابن عباس قال دخلت حفصة بيتها فوجدته يطاء مارية فعاتبته (فتح الباری مطبوعۂ مصر جلد ۸ صفحہ ۵۰۳)

ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہؓ اپنے گھر میں گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ماریہؓ کے ساتھ ہم بستر دیکھا۔ اس پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاتب کیا۔

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے، ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض افترا اور بہتان ہیں۔

علامہ عینی شرح صحیح بخاری باب النکاح جلد ۹ صفحہ ۵۴۸ میں لکھتے ہیں:۔

والصحیح فی سبب نزول الآیة انه فی قصة العسل لا فی قصة مارية المروی فی غیر الصحیحین وقال النووی ولم تلت قصة مارية من طریق صحیح

اور آیت کی شانِ نزول کے باب میں صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ میں ہے، ماریہ کے قصہ کے باب میں نہیں ہے، جو صحیحین کے سوا اور کتابوں میں مذکور ہے۔ نووی نے کہا ہے کہ ماریہ کا واقعہ کسی صحیح طریقہ سے مروی نہیں ہے۔

یہ حدیث تفسیرِ ابن جریر، طبرانی، مسندِ ہثیم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ان کتابوں میں عموماً جس قسم کی رطب و یابس روایتیں مذکور ہیں، اس کے لحاظ سے جب تک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ ہو، لائق التفات نہیں، حافظ ابن حجر نے ان میں ایک طریقہ کی توثیق کی ہے یعنی وہ روایت جس کے راوی اخیر مسروق (۱) ہیں۔

لیکن اولاً تو اس روایت میں ماریہ قبطیہ کا نام مطلق نہیں، صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے، اس کے علاوہ مسروق تابعی ہیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا، اس لئے یہ روایت اصولِ حدیث کی رو سے منقطع ہے، یعنی اس کا سلسلۂ سند صحابی تک نہیں پہنچتا۔

اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے، لیکن اس

---

(۱) فتح الباری تفسیر سورۂ تحریم۔

طریقہ کے ایک اور راوی عبد الملک رقاشی ہیں جن کی نسبت دار قطنی نے لکھا ہے:

کثیر الخطاء فی الاسانید	سندوں میں اور اصل الفاظِ حدیث میں بہت خطا کرتے
والمتون یحدث عن حفظہ	ہیں اور اپنے حافظہ کی بنیاد پر حدیث بیان کرتے ہیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ ماریہ کی روایت صحاح ستہ کی کتاب میں مذکور (۱) نہیں ہے، یہ بھی تسلیم ہے کہ سورۂ تحریم کا شانِ نزول جو صحیح بخاری اور مسلم میں مذکور ہے (یعنی شہد کا واقعہ) قطعی طریقہ سے ثابت ہے، امام نووی نے جو ائمۂ محدثین میں سے ہیں، صاف تصریح کی ہے کہ ماریہ کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں، حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے جن طریقوں کو صحیح کہا ان میں سے ایک منقطع اور دوسرے کا راوی کثیر الخطاء ہے، ان واقعات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت استناد کے قابل ہے۔

یہ بحث اصولِ روایت کی بنا پر تھی، درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کد و کاوش کی حاجت نہیں، جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کیے جا سکتے، نہ کہ اس ذاتِ پاک کی طرف جو تقدس و نزاہت کا پیکر تھا، صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۱) (یعنی ماریہ کے نام سے اور مشہور لغو واقعات کے شمول کے ساتھ نہیں ورنہ نسائی باب الغیرۃ میں اس قدر مذکور ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے اصرار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لونڈی کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ لیکن اس کا ایک راوی مجروح ہے) س۔

@@@@@@@@

غزوۂ تبوکؒ

رجب ۹ سنہ ھ مطابق نومبر ۶۳۵ سنہ ء

تبوک ایک مشہور مقام ہے، جو مدینہ اور دمشق کے وسط میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ ۱۴ منزل ہے۔

جنگِ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیرِ اثر حکومت کر رہا تھا، مذہباً عیسائی تھا، اس لئے قیصر روم نے اسی کو اس مہم پر متعین کیا، مدینہ میں یہ خبریں اکثر مشہور ہوتی رہتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلاء کے واقعہ میں حضرت عمرؓ سے جب عتبانؓ بن مالک نے دفعتاً آکر یہ کہا کہ "غضب ہو گیا"۔ تو انہوں نے کہا کیوں خیر ہے؟ کیا غسانی (۱) آ گئے۔

شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغنِ زیتون بیچنے آیا کرتے تھے، انہوں نے خبر دی (۲) کہ رومیوں نے شام میں لشکر گراں جمع کیا ہے، اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں تقسیم کر دی ہیں، اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور مقدمۃ الجیش بلقاء تک آ گیا ہے، مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انتقال کیا اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں"۔ اس بنا پر ہرقل نے چالیس ۴۰ ہزار فوجیں روانہ کیں۔

بہر حال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں، اور قرائن اس قدر قوی تھے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تیاری کا حکم دیا، سوءِ اتفاق یہ کہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں، ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا (۳) منافقین جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، ان کا پردہ فاش ہو چلا، وہ خود بھی جی چراتے تھے (۴) اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ:

(۱) (بخاری ذکر واقعۂ ایلاء) (۲) مواہب لدنیہ (مع زرقانی ج ۳ ص ۶۲) (۳) مارگولیوس صاحب فرماتے ہیں کہ "چونکہ حنین میں انصار مال غنیمت سے محروم رہے تھے، اس لئے وہ بے دل ہو گئے تھے، کہ "ہم کیا لڑیں، جب فوائد جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے"، لیکن یہ مارگولیوس صاحب کا حسن ظن ہے، (قرآن نے خود بتا دیا ہے تو قیاس کی کیا حاجت ہے) (ص ۴۱۵) (۴) ابن ہشام۔

لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ (توبہ۔۹:۸۱) گرمی میں نہ نکلو،

سویلم ایک یہودی تھا اس کے گھر پر منافقین جمع ہوتے اور لوگوں کو لڑائی پر جانے سے روکتے، چونکہ ملک پر رومیوں کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قبائلِ عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی (۱)۔ صحابہؓ میں سے حضرت عثمانؓ نے دو سو ۲۰۰ اوقیہ چاندی اور دو سو ۲۰۰ اونٹ پیش کئے (۲)۔ اکثر صحابہؓ نے بڑی بڑی رقمیں لاکر حاضر کیں، تاہم بہت سے مسلمان اس بنا پر جانے سے رہ گئے کہ سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اس درد سے روئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر رحم آیا، تاہم ان کے چلنے کا کچھ سامان نہ ہوسکا، ان ہی کی شان میں سورۂ توبہ کی یہ آیتیں اتری ہیں:

وَلَا عَلَی الَّذِیْنَ اِذَا مَآ اَتَوْکَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَیْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْیُنُهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوْا مَا یُنْفِقُوْنَ (توبہ۔۹:۹۲)

اور نہ ان لوگوں پر کچھ اعتراض ہے کہ جب تمہارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجئے اور تم نے کہا کہ میرے پاس سواری کہاں ہے جس پر تم کو سوار کر سکوں تو وہ واپس گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہیں ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا جب آپؐ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر فرما کر جاتے۔ چونکہ اس غزوہ میں بخلاف اور معرکوں کے ازواجِ مطہراتؓ ساتھ نہیں گئی تھیں، اہلِ حرم کی حفاظت کے لئے کسی عزیز خاص کا رہنا ضرور تھا، اس لئے اب کی یہ منصب جناب امیر کو ملا۔ لیکن انہوں نے شکایت کی کہ "آپؐ مجھ کو بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جاتے ہیں"۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی" (۳)۔

غرض آپؐ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے، جس میں دس ہزار گھوڑے تھے (۴) راہ میں وہ عبرت ناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یعنی قومِ ثمود کے مکانات

(۱) (ابن سعد جزء المغازی ص ۱۱۹) "س" (۲) (زرقانی ج ۳ ص ۲۰) "س" (۳) صحیح بخاری غزوۂ تبوک۔ (۴) طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۹) "س"

جو پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے تھے، چونکہ اس مقام پر عذابِ الٰہی نازل ہو چکا تھا، آپؐ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پیئے اور نہ کسی کام میں لائے۔

تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی، لیکن اصلیت سے بالکل خالی بھی نہ تھی، غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا، صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں جہاں حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ مذکور ہے، لکھا ہے کہ شام سے ایک قاصد آیا اور حضرت کعبؓ بن مالک کو رئیسِ غسان کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ "میں نے سنا ہے کہ محمدؐ نے تمہاری قدر نہ کی، اس لئے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا"۔ حضرت کعبؓ گو معتوبِ نبوی تھے، لیکن انہوں نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا۔

تبوک پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس۲۰ دن تک قیام کیا، ایلہ (۱) کا سردار جس کا نام یوحنا تھا، حاضرِ خدمت ہو کر جزیہ دینا منظور کیا، ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا جس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ردائے مبارک عنایت فرمائی (۲) جربا اور اذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی، دومۃ الجندل جو دمشق سے پانچ منزل پر ہے، وہاں ایک عربی سردار جس کا نام اکیدر تھا قیصر کے زیرِ اثر تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو چار۴۰۰سو (بنیں) کی جمعیت کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا، حضرت خالدؓ نے اس کو گرفتار کیا، اور اس شرط پر رہائی دی کہ خود دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر شرائطِ صلح پیش کرے، چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں آیا، آپؐ نے اس کو امان دی۔

تبوک سے جب آپؐ واپس پھرے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالمِ شوق میں استقبال کو نکلے، یہاں تک کہ پردہ نشینانِ حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں اور لڑکیاں یہ اشعار گاتی نکلیں (۳)۔

طلع البدر علینا   من ثنیات الوداع

وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا

وجب الشکر علینا   ما دعا للہ داع

جب تک خدا کا پکارنے والا دنیا میں کوئی باقی ہے، ہم پر خدا کا شکر فرض ہے۔

---

(۱) یہ مقام خلیج عقبہ کے پاس ہے، (مارگولیوس) (۲) زرقانی بحوالہ ابن ابی شیبہ (ج ۳ ص ۸۰) "س" (۳) زرقانی ج ۳ ص ۹۲) "س"

مسجدِ ضرار

منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈال دیں، ایک مدت سے وہ اس خیال میں تھے کہ مسجد قبا کے توڑ پر وہیں ایک اور مسجد اس حیلہ سے بنائیں کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجد نبویؐ میں نہ پہنچ سکیں، یہاں آکر نماز ادا کر لیا کریں۔ ابو عامر جو انصار میں سے عیسائی ہو گیا تھا، اس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو میں قیصر کے پاس جا کر وہاں سے فوجیں لاتا ہوں کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کردوں (۱)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک تشریف لے جانے لگے تو منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لئے ایک مسجد تیار کی ہے آپؐ چل کر اس میں ایک دفعہ نماز پڑھا دیں تو مقبول ہو جائے، آپؐ نے فرمایا اس وقت میں مہم پر جا رہا ہوں، جب تبوک سے واپس پھرے تو مالک اور معنؓ بن عدی کو حکم دیا کہ جا کر مسجد میں آگ لگا دیں، اسی مسجد کی شان میں یہ آیتیں اتری ہیں:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۚ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۚ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝

(توبہ - ۹: ۱۰۸،۱۰۷)

اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد ضرار اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور رسول سے لڑتے ہیں ان کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا، اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں، محمدؐ تو کبھی اس مسجد میں جا کر نہ کھڑا ہو، وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے، وہاں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی محبوب ہے اور خدا صفائی پسند کرنے والوں کو چاہتا ہے۔

---

(۱) زرقانی بحوالہ ابن جریر (ج ۳ ص ۹۱) "س"

حجِ اسلام اور اعلانِ براءت

مکہ سنہ ۸ ھ میں فتح ہوا، (لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن و امان نہیں قائم ہوا تھا، اس لئے اس سال مشرکین ہی کے اہتمام سے ارکانِ حج انجام پائے، مسلمانوں نے حضرت عتاب بن اسید کے ساتھ جو مکہ کے امیر مقرر ہوئے تھے، فریضۂ حج ادا کیا، اب) سنہ ۹ ھ پہلا موقع ہے کہ کعبہ کفر و شرک کی ظلمت سے پاک ہو کر عبادتِ ابراہیمی کا مرکز قرار پاتا ہے، غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ذیقعدہ یا ذوالحجہ سنہ ۹ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ۳سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لئے روانہ فرمایا، ان میں حضرت ابو بکرؓ قافلہ سالار، حضرت علیؓ نقیبِ اسلام اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ (۱) وغیرہ معلم تھے، قربانی کے لئے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) بیس۲۰ اونٹ ساتھ تھے۔

قرآن نے اس حج کو حج اکبر (۲) کہا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ رسمِ حج اصل ابراہیمی سنت میں جلوہ گر ہوئی، اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خلیل میں عہدِ جاہلیت کے اختتام اور حکومت اسلام کی ابتدا کا اعلان کیا جائے، مناسک و رسومِ حج کی عام طور سے تعلیم دی جائے، زمانۂ جاہلیت کے رسوم و عادات کا ابطال کیا جائے۔

حضرت ابو بکرؓ نے مناسکِ حج کی لوگوں کو تعلیم دی، یوم النحر میں خطبہ دیا جس میں حج کے مسائل بیان کئے، اس کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے، سورۂ برات کی چالیس۴۰ آیتیں پڑھ کر سنائیں، اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں نہ داخل ہو سکے گا، نہ کوئی برہنہ اب حج کرنے پائے گا اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے، ان کے نقضِ عہد کے سبب سے آج سے چار مہینے کے بعد ٹوٹ جائیں گے، حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ نے اس اعلان کی اس زور زور سے منادی کی کہ گلا پڑ پڑ گیا (۳)۔

سورۂ براءت کی ابتدائی آیتیں جس میں خدا نے اس اعلان کا حکم فرمایا، یہ ہیں (۴):-

---

(۱) بخاری کتاب المناسک باب لایطوف عریان و باب حج ابی بکرؓ بالناس و تفسیر سورہ برات۔ (۲) سورۂ توبہ میں ہے، یوم الحج الاکبر، مصنف نے اس حج کو حج اکبر کہنے کی جو توجیہ لکھی ہے، اس کو بھی گو بعض علماء نے اختیار کیا ہے، لیکن عام خیال یہ ہے کہ خاص اسی سال کے حج کو حج اکبر نہیں کہا گیا ہے، بلکہ ہر حج عمرہ کے مقابلہ میں حجِ اکبر ہے، اور عمرہ حجِ اصغر ہے ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۱۰ ص ۴۲) "س" (۳) (مسند ابن حنبل ص ۲۹۹ جلد ۲، عام تفصیل زرقانی ج ۳ ص ۱۰۲ وغیرہ میں موجود ہے) "س" (۴) ان آیات میں یہ بیان ہے کہ مسجد حرام کے پاس (صلح حدیبیہ میں) جو معاہدے ہوئے تھے وہ ٹوٹ گئے، لیکن وہ معاہدے تو فتح مکہ سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے، اور اس کے بعد کفار سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا، مصنف نے اس بنا پر اپنے ایک مکتوب (مکاتیب شبلی حصہ دوم مکتوب نمبر ۲، ص ۵۱ - ۵۲) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۹ پر)

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۔

(توبہ۔ ۹: ۱ تا ۴)

اے مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا (اور انہوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا) ان کی خدا اور خدا کے رسول کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے' اب اے معاہدہ شکن مشرکو!) چار مہینے کی تم کو مہلت ہے' اس میں تم ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم خدا کو عاجز نہ کر سکو گے، حج اکبر کے دن لوگوں کو اعلانِ عام ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان مشرکین کا اب ذمہ دار نہیں' اگر (تم نے اے مشرکین) توبہ کرلی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے' اور اگر اب بھی پھرے رہو تو یقین کرو کہ تم خدا کو ہرا نہ سکو گے' اے پیغمبر تو کافروں کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دے، لیکن وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے اس کے ایفا میں تمہارے ساتھ کچھ کمی نہ کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں انہوں نے تمہارے دشمنوں کی مدد کی تو زمانۂ معاہدہ کو تم پورا کرو، خدا پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (توبہ۔ ۹: ۲۸)

اے مسلمانو: مشرکین تو ناپاک ہیں' اب وہ اس سال کے بعد کعبہ کے قریب نہ آئیں۔

(طبری نے بواسطہ سدی روایت کی ہے کہ اس اعلان کے بعد کفار عام طور سے مسلمان (۱) ہوگئے۔)

واقعاتِ متفرقہ (نو سال کے بعد اب ملک میں امن و امان کا دور شروع ہوا' اب حصولِ دولت کے مواقع حاصل تھے' اس بنا پر زکوٰۃ کا حکم اس سال نازل ہوا' اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۸) کہ یہ آیتیں سنہ ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہوں گی اور شاید اسی لئے مصنف نے یہ واقعات قلم انداز کر دیئے ہیں لیکن خاکسار جامع کا خیال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ معاہدہ کے متعلق یہ آیتیں گو سنہ ۸ھ میں نازل ہوئی ہوں، لیکن ان کا عام اعلان مع دیگر ضروری احکام کے جیسا کہ صحاحِ ستہ کے مستند روایات میں مذکور ہے سنہ ۹ھ کے موسمِ حج میں ہوا ہو) "س" (۱) ج ۴ ص ۱۷۲۱ "س"

تحصیلِ زکوٰۃ کے لئے عمال، قبائل میں مقرر ہوئے (۱)۔

اسلام کے سایہ میں بعض غیر مسلم قومیں بھی داخل ہو چکی تھیں، ان کے لئے جزیہ کی یہ آیت اتری:۔

حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَدٍ — تا آنکہ چھوٹے بن کر وہ

وَّھُمْ صَاغِرُوْنَ (توبہ۔ ۹: ۲۹) — جزیہ نہ ادا کریں۔

سود کی تحریم بھی اسی سال نازل ہوئی، اور اس کے ایک سال بعد بسنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلانِ عام فرمایا۔

نجاشی جس کے ظلِ حمایت میں مسلمانوں نے چند سال حبشہ میں بسر کئے، اس نے امسال انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وفات کا خود اعلان عام کردیا کہ "مسلمانو! آج تمہارے برادر صالح اصحمہ نے وفات پائی، اس کے لئے دعائے مغفرت مانگو"۔ اس کے بعد نجاشی کے لئے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی)

(۱) (طبری جلد ۳ صفحہ ۱۷۲۲) س۔

$$$$$$$$$$

غزوات پر دوبارہ نظر

کتاب کا یہ حصہ سادہ سوانحِ زندگی پر محدود ہے، بحث و تدقیقات اور رفعِ شکوک کے لئے دوسرے حصے ہیں، اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ غزوات کے متعلق جو مباحث ہیں، ان ہی حصوں میں لکھے جاتے، لیکن کتبِ سیر میں کثرت اور اہمیت دونوں حیثیتوں سے جو واقعات زیادہ تر نمایاں ہیں، صرف غزوات ہیں، اگر صرف تصانیفِ سیرت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر سوانح عمری غزوات ہی کا نام ہے، چنانچہ پہلے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ سیرت نہیں بلکہ مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں، مثلاً مغازی ابن عقبہ، مغازی ابن اسحٰق، مغازی واقدی، یہ اندازِ تحریر آج تک چلا آیا، اس لئے اگر یہ طرز بالکل بدل دیا جائے تو جو شخص کوئی قدیم تصنیف پہلے پڑھ چکا ہوگا وہ اس جدید تصنیف کو پڑھ کر سمجھے گا کہ سیرت کے بجائے کوئی اور چیز پڑھ رہا ہے۔

ان اسباب سے ہم کو بھی غزوات کو تفصیل سے لکھنا پڑا لیکن غزوات کو پڑھ کر جو سوالات دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، ان کو دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھنا ناظرین کے اضطراب کا باعث ہوگا۔

غیر مذہب والوں نے غزوات کے مقاصد اور اسباب کے سمجھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں نہ صرف بد نیتوں نے، بلکہ نیک دلوں نے بھی، لیکن یہ تعجب کی بات نہیں، اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔

عرب اور جنگ و غارت گری

اس بات میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس حقیقت کا معلوم کرنا ہے کہ عرب کی قومیت کو "جنگ و غارت گری سے کیا تعلق ہے؟

ہر قوم کے اخلاق و عادات، رسوم و معاملات، محاسن و اوصاف، معائب و مثالب، غرض اس کی کل قومی زندگی کا ایک خاص اساس الامر ہوتا ہے کہ سب چیزیں اسی سے بنتی اور اسی سے نشو و نما پاتی ہیں، عرب میں یہ چیز جنگ و غارت گری تھی، اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ عرب ایک ویران ملک تھا کسی قسم کی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی، لوگ ان پڑھ اور

جاہل تھے، خورش اور پوشش کا قدرتی سامان صرف بھیڑ، بکریاں اور اونٹ تھے کہ ان کا دودھ اور گوشت کھاتے اور بالوں کو بن کر کمل بناتے تھے، لیکن یہ جائداد بھی ہر شخص کو نصیب نہ تھی، یا تھی تو بقدر ضرورت نہ تھی، اس لئے حملہ اور غارت گری شروع ہوئی اور معاش کا سب سے بڑا بلکہ تنہا ذریعہ غارت گری قرار پایا، ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے (۱):

(وذالک انهم کانوا یکرهون	(یہ اس لئے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ
ان تتوالی علیهم ثلثة اشهر	ان پر تین ۳ ماہ متواتر اس طرح گذر جائیں
لا تمکنهم الا غارة فیها	کہ ان میں وہ غارت گری نہ کر سکیں
لان معاشهم کان من الاغارة)	کیوں کہ ان کی معاش کا ذریعہ یہی تھا۔)

چونکہ لوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں "غنم" کہتے ہیں اس لئے لوٹ کے مال کو عربی میں "غنیمت" کہنے لگے (۲)، اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج و تخت لٹ کر آیا تو اسی نام سے پکارا گیا۔

رفتہ رفتہ یہی لفظ عربی قوم، عربی زبان، عربی تاریخ کا سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ نمایاں، سب سے زیادہ وسیع الاثر لفظ بن گیا، آج بھی ایک سلطان، ایک رئیس، ایک شیخ القبائل اپنے عزیز و اقارب کو سفر کے وقت رخصت کرتا ہے تو کہتا ہے سالماً غانماً یعنی "سلامت آنا اور لوٹ کر لانا"۔ ہماری زبان میں سب سے عزیز چیز کو جو غنیمت کہتے ہیں، (مثلا آپ کا تشریف لانا نہایت غنیمت ہے) یہ وہی لفظ ہے اور عربی زبان سے آیا ہے۔

ضرورتِ معاش کی وجہ سے تمام عرب میں غارت گری اور جنگ عام ہو گئی تھی، تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے، صرف حج کے زمانہ میں مذہبی خیال سے چار مہینے مخصوص کر دیئے تھے جن کو "اشہرِ حرم" کہتے تھے، ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں، لیکن متصل تین تین ۳ مہینہ تک معاش کا معطل رہنا سخت گراں تھا، اس لئے نسیٔ ایک رسم ایجاد کر لی تھی، یعنی ان مہینوں کو حسبِ ضرورت دوسرے مہینوں سے بدل لیتے تھے۔

حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح (تفسیر سورۂ توبہ) میں لکھتے ہیں:-

کانوا یجعلون المحرم صفر او یجعلون	وہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم کر دیا کرتے تھے

(۱) جلد اول صفحہ ۴، مطبوعۂ مصر۔ (۲) (یہ مصنف کی ذاتی تحقیق ہے، جس کی تائید کتب لغت سے ہاتھ نہیں آئی) "س"

صفر المحرم لئلا یتوالی علیھم ثلثۃ اشھر لا یتعاطون فیھا القتال الخ (ج ۸ ص ۲۴۴)

تاکہ پے در پے تین۳ مہینے لڑائی سے محروم نہ ہو جائیں۔

ثار کا عقیدہ

لڑائی کا اصلی ابتدائی سبب یہ تھا، لیکن جب یہ سلسلہ چھڑا تو اور اور اسباب بھی پیدا ہو گئے اور یہ اسباب اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے اصلی سبب سے کم نہ تھے، ان میں سب سے مقدم اور شدید الاثر ثار کا قانون تھا، یعنی جب کسی قبیلہ کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کے قبیلہ کو اس کا انتقام لینا فرض ہو جاتا تھا، گو سیکڑوں برس گذر جاتے تھے اور قاتل بلکہ اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا، تاہم جب تک قاتل کے قبیلہ کے ایک آدمی کو قتل نہیں کر لیتا تھا، قومی فرض سے ادا نہیں ہو سکتا تھا، اسی کو ثار کہتے ہیں، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی قتل پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک مسلسل لڑائیاں قائم ہو جاتی تھیں، اسی طریقہ کے ابطال کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اعلان کیا تھا اور اپنے قبیلہ کے قاتلوں کا خون معاف کر دیا تھا، لیکن صحرا نشین عربوں میں آج تک یہ طریقہ قائم اور ان کے قومی خصائص کا جزء اعظم ہے۔

ثار کے متعلق عجیب عجیب قسم کے معتقدات پیدا ہو گئے تھے، مثلاً یہ کہ مقتول جب مر جاتا ہے تو اس کی روح پرند بن جاتی ہے، اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا مقامِ قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ "مجھ کو پلاؤ میں پیاسی ہوں"۔ اس پرند کو صدیٰ یا ہامہ کہتے تھے۔

ابو دواد ایادی کہتا ہے:

سلط الموت والمنون علیھم فلھم فی صدی المقابر ھام

ان پر موت مسلط ہو گئی اور مقبروں کے "صدی" میں ان کے لئے "ہام" ہے۔

ذوالاصبع العدوانی کا شعر ہے:

یا عمرو ان لا تدع شتمی و منقصتی اضر بک حیث تقول الھامۃ اسقونی

اے عمرو! اگر تو مجھ کو گالی دینا اور میری تحقیر کرنا نہ چھوڑے گا، تو میں تجھ کو اس طرح ماروں گا کہ ہامہ کہے گی کہ مجھ کو سیراب کرو۔

ایک یہ خیال تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہیں لیا جاتا اس کی قبر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے۔

عمرو بن معدی کرب کی بہن مقتول کی زبان سے کہتی ہے،

واترک فی قبر بصعدۃ مظلم — خوں بہا لوگے تو میں اندھیری قبر میں پڑا رہوں گا،

اسی بنا پر خوں بہا لینے کو عیب سمجھتے تھے، اسی شاعرہ کا مصرع ہے،

ومشوا باٰذان النعام المثلم — اور خوں بہا لینا ہے تو بوچے شترمرغ کا کان پکڑ کر لے جاؤ،

غیرت اور حمیت کی بنا پر اس بات کو عیب سمجھتے تھے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے،

ولا تراھم وان جلّت مصیبتھم — مع البکاۃ علی من مات یبکونا

گو کتنی ہی بڑی مصیبت ہو، لیکن ان کو مرنے والے پر روتا ہوا نہ دیکھو گے،

عمرو بن کلثوم:

معاذ الالٰہ ان ینوح نساء نا — علی ھالک او ان نضجّ من القتل

خدا نہ کرے کہ ہماری عورتیں مقتول پر نوحہ کریں یا ہم قتل سے گھبرا جائیں۔

مقتول پر نوحہ کرتے تھے تو اس وقت کرتے تھے جب خون کا انتقام لے لیتے تھے،

من کان مسرورا بمقتل مالک — فلیات نسوتنا بوجہ نہار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا — وہ دن کو ہماری عورتوں کے پاس آئے

یجد النساء حواسراً یندبنہ — یلطمن او جھھن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں ننگے سر نوحہ کر رہی ہیں — اور صبح کو اپنے چہروں پر دو ہتڑ مار رہی ہیں

ایک خیال یہ تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے اس کی روح زخم کی راہ سے نکلتی ہے، ورنہ ناک کی راہ سے نکلتی ہے، اور یہ نہایت عیب سمجھا جاتا تھا، اسی بنا پر بیماری سے مرنے کو "حتف انف" کہتے ہیں، یعنی "ناک کی موت" اور ایسے مرنے کو نہایت عار سمجھتے تھے۔

وما مات منّا سیّد حتف انفہ — ولا طلّ منّا حیث کان قتیل

ہمارا کوئی سردار ناک کی راہ سے نہیں مرا — اور نہ ہمارے کسی مقتول کا خون ہدر ہوا،

رفتہ رفتہ عرب کے تمام قومی مفاخر اور اخلاق و عادات کا اصلی محور جنگ بن گیا تھا، یعنی ان کے اوصاف و اخلاق میں جس چیز کا اصلی سبب تلاش کیا جائے، یہی چیز نکلتی تھی، یہی چیز تھی جس نے ایک مدّت تک قبائلِ عرب کو اسلام لانے سے باز رکھا، حضرت عمروؓ بن مالک جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور

اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا "بنو عقیل پر ہمارا ثار باقی ہے، وہ لے لیں تو اسلام لائیں" چنانچہ اسی وقت بنو عقیل پر جو اسلام لاچکے تھے، حملہ آور ہوئے اور خود حضرت عمرؓ بن مالک نے اس میں شرکت کی، گو پھر ان کو بہت ندامت ہوئی کہ ان کے ہاتھ سے ایک مسلمان مارا گیا(۱)۔

لوٹ کا مال

چونکہ، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، لڑائیوں کی اصل بنیاد ضرورتِ معاش سے شروع ہوئی تھی، اس لئے عرب کے نزدیک مالِ غنیمت سے زیادہ کوئی شے محبوب نہ تھی، اور ذرائعِ معاش میں سب سے زیادہ حلال و طیب اسی کو سمجھتے تھے، یہ خیال اس قدر دلوں میں راسخ اور رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا کہ اسلام کے بعد بھی ایک مدت تک قائم رہا اور جس طرح شارع نے ممنوعاتِ شرعیہ کو بتدریج حرام اور ممنوع کیا تھا، غنیمت کے متعلق نہایت تدریج اور آہستگی سے کام لینا پڑا۔

شراب کو جب شارع نے حرام کرنا چاہا تو پہلے یہ آیت اتری:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ	لوگ تجھ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں،
قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ (بقرہ۔ ۲: ۲۱۹)	کہہ دے کہ دونوں میں بڑا گناہ ہے،

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا:

اللهم بين لنافي الخمر بيانا شافيا	اے خدا! شراب کے متعلق ہم کو صاف احکام بتا،

پھر یہ آیت اتری:

لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى (نساء۔ ۴: ۴۳)۔	نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو،

چانچہ نماز کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک شخص منادی (۲) پکارتا کہ کوئی شخص نشہ میں نماز کو نہ آئے، پھر یہ آیت اتری،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنَّمَا الْخَمْرُ	مسلمانو! شراب، جوا، انصاب، فال کے
وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ	تیر، یہ سب ناپاک اور شیطان کے کام

---

(۱) اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرؓ بن مالک (ج ۳ ص ۱۳) "س" (۲) مسند امام احمد بن حنبل مطبوعۂ مصر (ج ۱) ص ۵۳ و ابو داؤد کتاب الاشربہ باب تحریم الخمر۔ "س"

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ • اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ • (مائدہ۔ ۵: ۹۰۔۹۱)

ہیں، توان سے بچو کہ غالباً تم فلاح پاؤ گے، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور قمار کے ذریعہ سے تم لوگوں میں عداوت اور بغض ڈالے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روکے، تو تم باز آؤ گے؟

باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی حرمت کے متعلق اس قدر تاکید و تصریح کی ضرورت خیال کی کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پیتے تھے، تڑوادیئے، لوگوں نے عرض کی کہ شراب کا سرکہ بنالیں، اس سے بھی منع فرمایا، ان سب باتوں پر بھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض لوگوں نے شرابیں پیں، اور جب ان سے باز پرس کی گئی تو انہوں نے نیک نیتی سے کہا کہ نیک اور اچھے آدمیوں کے لئے شراب کہاں حرام ہے؟ قرآن مجید میں خود شراب کی حرمت کے بعد یہ تصریح موجود ہے:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْآ (مائدہ۔ ۵: ۹۳)

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے، انہوں نے جو کچھ کھایا (یعنی شراب پی) ان پر کچھ الزام نہیں،

اس موقع پر بہت سے صحابہؓ موجود تھے، حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ ان صحابہ کی نسبت ہے جو شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے مرگئے، حضرت عمرؓ نے تصدیق کی، اور ان لوگوں کو سزا دی، چنانچہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری میں مذکور ہے:

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی چیز زمانہ دراز سے رسم و عادت میں داخل ہوجاتی ہے تو اس کے آثار اور مخفی نتائج مدتوں تک قائم رہتے ہیں، اور غنیمت کا بھی یہی حال ہے۔

سب سے پہلے جنگ بدر میں قبل اس کے کہ مالِ غنیمت یکجا جمع کیا جاتا، لوگ غنیمت میں مصروف ہوگئے، اس پر یہ آیت اتری:

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ	اگر خدا کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا
فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔	تو جو کچھ لیا اس پر تم کو عذاب ہوتا۔

(انفال - ۸ : ۶۸)

چنانچہ صحیح ترمذی تفسیر انفال میں یہ واقعہ بہ تصریح مذکور ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا کہ "جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا، اس کا مال و اسباب قاتل کو ملے گا"۔ اس بنا پر لوگوں نے مسلوبہ مال کا دعویٰ کیا، جو صحابہؓ خود لڑے نہ تھے بلکہ علم اور رایت کے محافظ تھے، ان کا دعویٰ تھا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے (۱)، اس پر یہ آیت اتری:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ	لوگ تجھ سے مال غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں
الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (انفال - ۸ : ۱)	کہہ دے غنیمت خدا اور رسول کی ہے۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدین مالِ غنیمت کا خود دعویٰ نہیں کر سکتے، اس کی تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہے، جس طرح آپؐ چاہیں تقسیم فرمائیں، اس سے اتنا ہوا کہ لڑائیوں میں ہر شخص خود لوٹ کر جو چیز چاہتا تھا، لیتا تھا، بند ہو گیا، لیکن میدانِ جنگ کے علاوہ اور موقعوں پر لوٹنا مدتوں موقوف نہیں ہوا، سنن ابی داؤد (۲) میں ایک انصاری کی روایت ہے کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے، بھوک کی سخت تکلیف ہوئی، اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں، ان کو لوٹ لائے اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ تشریف لائے اور کمان جو ہاتھ میں تھی اس سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ "لوٹ کی چیز مردہ سے بڑھ کر حلال نہیں"۔

خیبر کی لڑائی سنہ ۷ھ میں ہوئی، اس وقت تک یہ حال تھا کہ امن کے بعد لوگوں نے یہودیوں کے جانور اور پھل لوٹ لئے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت غصہ آیا، آپؐ نے تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور فرمایا،

ان اللہ تعالی لم یحل لکم ان تدخلوا	خدا نے تم لوگوں کے لئے یہ نہیں جائز کیا ہے
بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب	کہ اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ (اگر
نسائھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم	بہ اجازت) اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں کو مارو،

(۱) سنن ابی داؤد باب النفل۔ (۲) کتاب الجہاد باب فی النہی عن النہبی۔

الذی علیھم (سنن ابی داؤد باب تعشیر الذمۃ اذا اختلفوا فی التجارۃ) نہ یہ کہ ان کے پھل کھا جاؤ، جب کہ وہ تم کو وہ ادا کریں جو ان پر فرض ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ غنیمت کے ساتھ لوگوں کا جو شغف ہے کم ہو جائے لیکن مدت تک غنیمت کی محبت اور وارفتگی نہ گئی۔ غزوۂ احد میں صرف اس وجہ سے شکست ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ تیر اندازوں کو سخت تاکید فرمادی تھی کہ گو لڑائی کی کچھ حالت ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، تاہم جب فتح ہوئی تو لوگ بے اختیار لوٹ میں مصروف ہوگئے۔ ان کا ہٹنا تھا کہ دشمن نے موقع پاکر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا، حنین میں بھی شکست کی اصلی وجہ یہی تھی کہ قبل از وقت لوگوں نے غنیمت لوٹنی شروع کر دی تھی۔

"غنیمت" اس قدر محبوب تھی کہ بعض صاحبوں کو کسی کافر کے مسلمان ہونے پر اس بنا پر رنج ہوا کہ اسلام لانے کی وجہ سے اس کا مال نہ مل سکا۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے ایک سریہ میں حملہ کرنا چاہا، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے۔ انہوں نے کہا لا الہ الا اللہ کہو تو تمہاری جان اور مال بچ جائے گا۔ انہوں نے لا الہ الا اللہ کہا اور ان کو امن دے دیا گیا، جب یہ اپنے ساتھیوں میں آئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ:

احرمتنا الغنیمۃ (۱) تم نے ہم کو غنیمت سے محروم کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب یہ لوگ گئے تو آپؐ نے ان صحابی کی تحسین کی اور فرمایا کہ "تم کو ایک ایک آدمی کے بدلے (جس کو تم نے چھوڑ دیا) اس اس قدر ثواب ملے گا"

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ مدت تک لوگ یہ سمجھا کئے کہ غنیمت حاصل کرنا ثواب کا کام ہے۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد پر جانا چاہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ کچھ مال ہاتھ آئے"۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا"۔ یہ جواب انہوں نے آکر لوگوں سے بیان کیا تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور ان سے کہا کہ تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا، پھر جاکر پوچھو۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا اور وہی جواب ملا۔ لوگوں نے پھر ان کو بھیجا، اور پھر

---

(۱) ابو داؤد باب ما یقول اذا اصبح، کتاب الادب۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا (۱)۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

وحشیانہ افعال عرب میں لڑائیوں کی شدت اور وسعت نے نہایت وحشیانہ رسمیں قائم کر دی تھیں، جن میں سے چند کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اسیرانِ جنگ کو جب قتل کرتے تھے، تو چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرتے تھے، بلکہ آگ میں جلا دیتے تھے (۲)۔

۲۔ غفلت یا نیند کی حالت میں دفعتاً دشمن پر جا پڑتے تھے، اور قتل و غارت گری شروع کر دیتے تھے، یہ طریقہ عام اور کثرت سے رائج تھا، بہت سے بہادر اس خاص طریقہ میں زیادہ ممتاز تھے، اور ان کو فاتک یا فتاک کہتے تھے، تابط شرا، سلیک بن السلکہ اسی قسم کے لوگ تھے۔

۳۔ زندوں کو آگ میں جلا دیتے تھے، عمرو بن ہند (عرب کا ایک بادشاہ تھا) کے بھائی کو جب بنو تمیم نے قتل کر دیا تو اس نے منت مانی کہ ایک کے بدلے سو آدمیوں کو قتل کروں گا، چنانچہ بنو تمیم پر حملہ کیا، وہ لوگ بھاگ گئے، صرف ایک بڑھیا رہ گئی تھی، جس کا نام حمرا تھا، اس کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں ڈال دیا، اتفاق یہ کہ ایک سوار جس کا نام عمّار تھا، آنکلا، عمرو نے پوچھا تو کیوں آیا، اس نے کہا میں کئی دن کا بھوکا تھا، دھواں اٹھتے دیکھا تو سمجھا کھانا ہوگا عمرو نے حکم دیا کہ وہ بھی آگ میں ڈال دیا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی، جریر نے اپنے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

واخزاکم عمرو کما قد خزیتھم   وادرک عمار اشقی البراجم

۴۔ بچوں کو نشانہ بنا کر تیروں سے مارتے تھے، داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے ضمانت کے طور پر رکھے تھے، حذیفہ نے جو بنو ذبیان کا رئیس تھا، ان بچوں کو لے جا کر ایک وادی میں کھڑا کیا اور ان کو نشانہ بنا کر قدر اندازی کرتا تھا، اتفاق سے کوئی لڑکا نہ مرا، تو دوسرے دن پر اٹھا رکھا جاتا تھا، چنانچہ دوسرے دن یہ تفریح انگیز چاند ماری پھر شروع ہوتی تھی (۳) اور لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے۔

۵۔ قتل کا ایک یہ طریقہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الجہاد باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا۔ (۲) مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۳۳۲۔ (۳) مجمع الامثال ص ۴۰۰۔

تڑپ تڑپ کر مر جاتا، غطفان اور عامر کی لڑائی میں اسی خوف سے حکم بن الطفیل نے اپنے آپ کو خود گلا گھونٹ کر مار ڈالا، جیسا کہ عقد الفرید میں بہ تفصیل مذکور ہے۔

عرینہ کے لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بظاہر اسلام لاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام کو پکڑ لے گئے، تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے، پھر ان کی آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھوئے یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے (۱)۔

۶۔ مرنے کے بعد بھی انتقام کا جوش طرح طرح کی نفرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا، مردوں کے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک وغیرہ کاٹ لیتے تھے، ہند نے جنگ احد میں اسی رسم کے موافق حضرت حمزہؓ اور دیگر شہداء کے اعضاء کاٹ کر ہار بنایا اور گلے میں پہنا تھا۔

۷۔ منت مانتے تھے کہ دشمن پر قابو ہاتھ آئے گا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے، سلافہ کے دو بیٹے جنگ احد میں عاصم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، اس بنا پر سلافہ نے منت مانی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پئے گی (۲)، یہ بھی معمول تھا کہ مقتول کا کلیجہ نکال کر کھا جاتے تھے، ہند نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ جو نکال کر چبالیا تھا اس کا حال اوپر گذر چکا ہے۔

۸۔ حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر ڈالتے اور اس پر فخر کرتے تھے، عامر بن طفیل عرب کا مشہور بہادر اور رئیس ہوازن کہتا ہے:

بقرنا الحبالی من شنوءة بعد ما   خبطن بفیف الریح نهدا و خثعما

غزواتِ نبویؐ کے اسباب (۳) اور انواع

تفصیلِ مذکورہ بالا کے بعد ہم اس واقعہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ غزواتِ نبویؐ کن اسباب سے وجود میں آئے اور شارع علیہ السلام نے طریقۂ قدیم میں کیا اصلاحیں فرمائیں۔

مورخین نے "غزوہ" کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لئے دو چار آدمی بھی کہیں بھیج دیئے گئے تو اس کو بھی انہوں نے غزوہ میں شمار کر لیا، غزوہ کے علاوہ ایک اور لفظ ہے، یعنی "سریہ" غزوہ اور سریہ میں لوگوں کے نزدیک یہ فرق ہے کہ غزوہ میں کم سے کم

(۱) یہ واقعہ تمام کتبِ حدیث میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل ابن سعد (ج ۲ قسم اول) ص ۶۷ سے ماخوذ ہے، مسلم میں صرف آنکھوں کا اندھا کرنا مذکور ہے۔ (۲) طبقات ابن سعد جلد ۲ ص (۳۹ سریۂ مرثد بن ابی مرثد) "س" (۳) یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ بحث تمام تر تاریخی حیثیت سے ہے، جہاد کی اصل حقیقت پر بحث کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گی۔

آدمیوں کی ایک خاص تعداد ضروری ہے، سریہ میں کوئی قید نہیں، ایک آدمی بھی کہیں لڑائی کی دیکھ بھال کو بھیج دیا گیا تو یہ بھی سریہ ہے، بعضوں کے نزدیک غزوہ کے لئے یہ شرط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس اس میں شرکت کی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات کو مورخین سریہ کہتے ہیں، وہ چند قسموں پر منقسم ہے۔

۱۔ محکمۂ تفتیش یعنی دشمنوں کی نقل وحرکت کی خبر رسانی۔

۲۔ دشمنوں کے حملہ کی خبر سن کر مدافعت کے لئے پیش قدمی کرنا۔

۳۔ قریش کی تجارت کی روک ٹوک تاکہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو حج و عمرہ کی اجازت دیں۔

۴۔ امن وامان قائم کرنے کے لئے تعزیری فوجیں بھیجنا۔

۵۔ اشاعت اسلام کے لئے لوگ بھیجے گئے اور حفاظت کے خیال سے کچھ فوج ساتھ کردی گئی، اس صورت میں تاکید کردی جاتی تھی کہ تلوار سے کام نہ لیا جائے۔

غزوہ کی صرف دو صورتیں تھیں۔

۱۔ دشمنوں نے دارالاسلام پر حملہ کیا اور ان کا مقابلہ کیا گیا۔

۲۔ یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں، اور پیش قدمی کی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو لڑائیاں واقع ہوئیں یا اس قسم کے جو واقعات پیش آئے، ان ہی مختلف اغراض سے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے چلے آئے تو قریش نے فیصلہ کرلیا کہ اسلام کو مٹا دیا جائے، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف ان کے مذہب کو صدمہ پہنچے گا اور دوسری طرف تمام عرب میں ان کا جو تفوق اور اثر اور مرجعیت عام ہے سب جاتا رہے گا، اس بنا پر ایک طرف تو قریش نے خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، دوسری طرف تمام قبائلِ عرب کو بھڑکایا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہو گیا تو تمہاری آزادی بلکہ ہستی بھی فنا ہو جائے گی۔

بیعتِ عقبہ میں جب انصار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا "برادرانِ من: جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم سے

اعلانِ جنگ ہے"۔ اوپر ہم مسند دارمی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو تمام عرب مدینہ پر حملہ کے لئے تیار ہو گیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ میں مہاجرین اور انصار رات کو سوتے تھے تو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے، اوپر گذر چکا ہے (بحوالۂ (۱) ابو داؤد) کہ قریش نے عبداللہ بن ابی کو پیغام بھیجا تھا کہ "محمدؐ کو وہاں سے نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمدؐ دونوں کا فیصلہ کر دیں گے"۔

حکمۂ تفتیش

ان واقعات کی بنا پر ضرور تھا کہ اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں، اس سلسلہ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانے پر کیا جائے، چنانچہ ابتدا ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انتظام پر توجہ کی، وقتاً فوقتاً کثرت سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے، یہ ٹکڑیاں گو محض خبر رسانی کے لئے جاتی تھیں، لیکن حفاظت کی غرض سے مسلح اور جمعیت کی صورت میں جاتی تھیں۔

یہی واقعات ہیں جن کو مورخین "سرایا" سے تعبیر کرتے ہیں، اور ان کے نزدیک اس کا مقصد کسی قافلہ کا لوٹنا یا کسی جماعت پر بے خبری کی حالت میں جا پڑنا ہوتا تھا۔

ایک بڑا قرینہ اس بات کا کہ ان دستوں کے بھیجنے سے حملہ کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا یہ ہے کہ دستے اکثر دس دس بارہ بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے سے آدمی لڑنے کے لئے نہیں بھیجے جا سکتے تھے۔

سریۂ ابن جحش

مثلاً سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بھیجا اور ایک سربہ مہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولنا، دو دن کے بعد انہوں نے کھولا تو اس میں یہ الفاظ تھے:

فسر حتی تنزل نخلة بین مکة	برابر چلے جاؤ یہاں تک کہ نخلہ میں جا کر ٹھہرو جو
والطائف فترصد بها قریشا وتعلم	مکہ اور طائف کے بیچ میں ہے، اور قریش کی دیکھ
لنا من اخبارهم (طبری۔ ص ۱۲۷۴)	بھال کرتے رہو اور ان کی خبریں دریافت کرو۔

مدافعت

اس انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کوئی مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تو فوراً خبر

(۱) باب فی خبر النضیر۔

ہو جاتی اور پیش دستی کر کے فوجیں بھیج دی جاتیں، اکثر سرایا اسی قسم کے تھے اور چونکہ ہم سرایا کا ذکر زیادہ تر قلم انداز کر آئے ہیں اس لئے مثال کے طور پر چند سرایا کا ذکر کرتے ہیں، اور قدمائے اہلِ سیر کی تصریحات سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہمیں مدافعت کی غرض سے تھیں۔

سریۂ غطفان سنہ ۳ھ :-

وذلک انه بلغ رسول الله صلی الله علیه وسلم ان جمعا من بنی ثعلبة ومحارب بذی امرّ قد تجمعوا یریدون ان یصیبوا من اطراف رسول الله صلی الله علیه وسلم جمعهم رجل منهم یقال له دعثور بن الحارث الخ (طبقات ص ۲۳)

اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ قبیلۂ بنو ثعلبہ اور محارب کی ایک فوج ذوامر میں اس غرض سے جمع ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حملہ کرے، اس فوج کو ایک شخص نے فراہم کیا، جس کا نام دُعثور ہے۔

سریۂ ابوسلمہ سنہ ۴ھ :-

وذلک انه بلغ رسول الله صلی الله علیه وسلم ان طلیحة وسلمة ابنی خویلد قد سارا فی قومهما ومن اطاعهما یدعونهم الی حرب رسول الله صلی الله علیه وسلم الخ

(ابن سعد جزء ثانی قسم اول ص ۳۵)

اس سریہ کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ طلیحہ اور سلمہ (پسرانِ خویلد) دونوں اپنی قوم اور اپنے پیرؤوں کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔

(سریۂ عبداللہ بن اُنیس بہ غرض قتل سفیان بن خالد سنہ ۴ھ :-

وذلک انه بلغ رسول الله صلی الله علیه وسلم ان سفیان بن خالد الهذلی ثم اللحیانی وکان ینزل عرنه وما والاها فی ناس من قومه وغیرهم قد جمع الجموع لرسول الله صلی الله علیه وسلم

ابن انیس اس لئے بھیجے گئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ سفیان بن خالد اپنے قبیلہ کو اور باہر کے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جمع کر رہا ہے۔

غزوہ ذات الرقاع سنہ ۵ھ :

فاخبروا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان انمار وثعلبۃ قد جمعوا لہم الجموع .... فمضیٰ)

ایک جاسوس نے آکر صحابہؓ کو اطلاع کی کہ انمار اور ثعلبہ وغیرہ مسلمانوں سے لڑنے کے لئے فوجیں جمع کر رہے ہیں، آپ چل کھڑے ہوئے۔

غزوۂ دومۃ الجندل سنہ ۵ھ :۔

قالوا بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان بدومۃ الجندل جمعا کثیرا .... وانہم یریدون ان یدنوا من المدینۃ (ابن سعد ص ۴۴)

رواۃ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں ایک گروہِ کثیر جمع ہے، اور مدینہ پر بڑھنا چاہتا ہے۔

غزوۂ مریسیع سنہ ۵ھ :۔

ان بلمصطلق من خزاعۃ وہم من حلفاء بنی مدلج وکان راسہم وسیدہم الحارث بن ابی ضرار فسار فی قومہ ومن قدر علیہ من العرب فدعاہم الی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجابوہ (ابن سعد جزء ثانی قسم اول ص ۴۵)

قبیلۂ بنو مصطلق خزاعہ کی شاخ ہے اور یہ لوگ بنو مدلج کے حلیف ہیں اور ان کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا، وہ اپنی قوم کو اور نیز اور لوگوں کو جو اس کے قابو میں تھے، لے کر چلا، اور لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کی دعوت دی اور لوگوں نے منظور کی۔

سریۂ علی بن ابی طالب، بہ طرف فدک، سنہ ۶ھ :۔

بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لہم جمعا یریدون ان یمدوا یہود خیبر (ابن سعد جزء ثانی قسم اول ص ۶۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بنو سعد فدک میں یہودِ خیبر کی کمک کے لئے فوج جمع کر رہے ہیں۔

سریۂ بشیر بن سعد شوال سنہ ۷ھ :۔

بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جمعا من غطفان بالجناب قد واعدہم عیینۃ بن حصن لیکون معہم لیزحفوا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ غطفان کا ایک گروہ مقام جناب میں جمع ہے اور ان سے عیینہ ابن حصن نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہو گا۔

سریۂ عمرو بن العاصؓ۔ ذات سلاسل سنہ ۸ھ، یہ مقام مدینہ سے ۸ منزل ہے،

بلغ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان جمعا من قضاعۃ قد تجمعوا یریدون ان ید نوا الی اطراف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ قضاعہ کا ایک گروہ جمع ہوا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھے۔

قریش کی تجارت کی روک ٹوک

بخاری کے حوالہ سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ (قریش اور مسلمانوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے) ابو جہل نے حضرت معاذ انصاریؓ سے کعبہ میں یہ کہا تھا کہ اگر تم لوگ محمدؐ کو نکال نہ دو گے، تو تم کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے " انہوں نے جواب دیا تھا کہ " تم نے اگر ہم کو کعبہ میں آنے سے روکا تو ہم تمہاری شام کی تجارت روک دیں گے "۔ (مکہ سے شام کو جو قافلہ جاتا تھا، مدینہ اس کی راہ میں پڑتا تھا) کعبہ مسلمانوں کی خاص چیز تھی، کیوں کہ کعبہ جس نے تعمیر کیا تھا، مسلمان اسی کے دین (ابراہیمی) کے پیرو تھے، باوجود اس کے قریش نے مسلمانوں کو عموماً حج اور عمرہ سے روک دیا، اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروانِ تجارت روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دے دیں۔

بعض سرایا قبلِ حدیبیہ

سرایا کے ذکر میں اکثر جگہ اہلِ سیر لکھتے ہیں کہ یتعرض لعیر قریش، یعنی اس لئے فوجیں بھیجی گئیں یا خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لے گئے کہ " کاروانِ قریش کی روک ٹوک کی جائے "۔ یہ تمام مہمات اسی غرض کے لئے تھیں، لیکن چونکہ قریش تجارت کے لئے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے۔ اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے، اس لئے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آجاتا تھا، اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ جاتے تھے تو مالِ تجارت غنیمت میں ہاتھ آتا تھا، اہلِ سیر غلطی سے ان واقعات کو اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا ہی اصلی مقصد تھا۔

یہی روک ٹوک تھی جس کی بنا پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح کر لی، جس کے رو سے مسلمانوں کو چند خاص پابندیوں کے ساتھ حج کی اجازت مل گئی۔ قریش پر کاروانِ تجارت کی روک ٹوک کا اسقدر اثر پڑتا تھا کہ (حضرت ابوذر غفاریؓ نے مکہ میں جب اپنے اسلام کا اعلان کیا اور

قریش نے اس جرم میں ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا اور حضرت عباسؓ نے کہا کہ غفار کا قبیلہ تمہارے کاروانِ تجارت کے سرِ راہ واقع ہے، تمہاری اس حرکت سے برہم ہو کر وہ راستہ نہ روک دے، تو یہ تدبیر پوری کارگر ہوئی اور انہوں نے ڈر کر حضرت ابوذرؓ کو چھوڑ دیا) صلحِ حدیبیہ کے بعد قریش کی خواہش کے مطابق جب یہ طے ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے نو مسلموں کو واپس دے دیں گے، اور ان نو مسلموں نے مکہ سے بھاگ کر شام کی راہ میں اپنا ایک مستقر قائم کر لیا (اور قریش کی تجارت کی راہ کو غیر مامون کر دیا) تو قریش نے بالآخر اجازت دے دی کہ جو مسلمان چاہے مکہ سے مدینہ چلا جائے، ان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔ (پھر آیندہ سال انہوں نے مسلمانوں کو حج و عمرہ کی بھی اجازت دے دی، اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں نے قریش کے کاروان تجارت سے تعرض نہیں کیا، بلکہ خود اس کی حفاظت کے لئے فوج بھیجتے تھے) (۱)۔

امن و امان قایم کرنا

اوپر گذر چکا ہے کہ عرب میں اِس سرے سے اُس سرے تک مطلق امن و امان نہ تھا، تمام قبائل باہم لڑتے رہتے تھے، یہاں تک کہ محترم مہینوں میں بھی بہانے نکال کر مہینوں کے نام بدل دیتے تھے اور لڑتے تھے، تجارت بالکل غیر محفوظ تھی، قافلوں کا لوٹ لینا عام بات تھی، جیسا کہ بدقسمتی سے آج بھی بدو قافلوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اس لئے بھیجا تھا کہ نہ صرف وعظ و پند بلکہ دست و بازو سے بھی تمام عرب بلکہ تمام دنیا میں امن و امان قائم کریں، کیوں کہ خوں ریزی اور قتل سے زیادہ کوئی چیز خدا کو ناپسند نہیں۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اَنَّہٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا (مائدہ۔ ۵: ۳۲)	اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر معاوضہ (یا زمین میں فساد) کے قتل کر دیا، اس نے تمام عالم کو قتل کر دیا۔

(۱) فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۶۱۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (بقرہ۔ ۲: ۲۰۵)	اور جب وہ پھر کر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے، اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔
اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ۔ ۵: ۳۳)	جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیئے جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور دوسرے طرف کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے یا جلاوطن کر دیئے جائیں۔

احادیث میں ہے کہ جب حضرت عدیؓ (حاتم طائی کے بیٹے) اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ "خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک شتر سوار صنعا سے لے کر حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا یا بھیڑیے کے سوا (کہ اس کی بکریاں نہ اٹھالے جائے) اور کسی کا ڈر نہ ہوگا" (۱)۔ یہ ابو داؤد کے الفاظ ہیں، صحیح بخاری میں ہے (۲) کہ "خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور آکر کعبہ کی زیارت کرے گی، اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا"۔ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کرکے حرم تک آتی ہے، اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔

بہت سے واقعات ہیں جن کو اہلِ سیر سرایا میں شمار کرتے ہیں، وہ محض تجارت کی آزادی اور عام امن و امان قائم کرنے کی غرض سے تھے، دو تین مثالیں ہم درج کرتے ہیں۔

سریۂ زیدؓ بن حارثہ

سنہ ۶ ھ میں حضرت زیدؓ مالِ تجارت لے کر شام گئے، واپس آتے ہوئے جب وادیِ قریٰ کے قریب پہنچے تو بنو فزارہ کے لوگوں نے آکر ان کو مارا پیٹا، اور تمام مال و اسباب چھین لے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تدارک کے لئے تھوڑی سی فوج بھیجی جس نے ان لوگوں کو سزا دی (۳)۔

اسی سنہ میں اس سے پہلے حضرت دحیہ کلبیؓ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) (صحیح بخاری باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ) ص ۵۴۴ (۲) باب علامات النبوۃ۔ (۳) طبقات ابن سعد ص ۶۵ جلد غزوات۔

خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا تھا، شام سے واپس آرہے تھے، جب حِسمیٰ پہنچے تو ہُنید نے چند آدمیوں کے ساتھ ان پر ڈاکہ ڈالا اور جو کچھ ان کے پاس تھا سب چھین لیا، صرف بدن کے کپڑے (وہ بھی جو پرانے اور پھٹے تھے) چھوڑ دیئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تدارک کے لئے حضرت زیدؓ کو بھیجا (۱)۔

سریۂ دومۃ الجندل

سنہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں جو مدینہ منورہ سے شام کی جانب پندرہ منزل پر ہے "ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا ہے، جو تاجروں کو ستاتا ہے، اس کے تدارک کے لئے آپؐ خود تشریف لے گئے، مجمع منتشر ہو چکا تھا، لیکن آپؐ نے چند روز تک وہاں قیام کیا، اور انتظام کے لئے تمام اطراف میں فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھیج دیں (۲)۔

سریۂ خبط یا سیف البحر

(یہ حالت کچھ مسلمان تاجروں کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ صلحِ حدیبیہ کے بعد کفارِ قریش کے کاروانِ تجارت کی بھی اسی طرح حفاظت کی جاتی تھی، سنہ ۸ھ میں قریش کا کاروانِ تجارت شام سے واپس آرہا تھا، قبیلۂ جہینہ کی طرف سے اطمینان نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کی سرداری میں تین ۳۰۰سو مسلمانوں کی جمعیت جس میں حضرت عمرؓ بھی داخل تھے، مدینہ سے ۵ دن کی مسافت پر روانہ فرمایا، مسلمانوں نے اس فرض کو اس طرح انجام دیا کہ کھانے کو کچھ نہ رہا تو ایک ایک چھوہارے پر دن دن بھر گذار دیا (۳)۔

صحیح مسلم (۴) میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے، لیکن اس سریہ کی غرض مختلف راویوں نے مختلف بیان کی ہے، اصل راوی حضرت جابرؓ ہیں جو اس واقعہ میں شریک تھے، ایک روایت میں ہے کہ جہینہ سے لڑنے کو یہ مہم بھیجی گئی تھی، کتب مغازی میں بھی یہی مذکور ہے، دوسری روایتوں کے الفاظ یہ ہیں:۔

(۱) نتلقی عیر قریش، قافلۂ قریش سے ملنے کے لئے۔

(۲) نرصد عیر قریش، قافلۂ قریش کی دیکھ بھال کے لئے۔

اس سے مقصود عام طور سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ قافلۂ قریش کے لوٹنے کے لئے، لیکن یہ

---

(۱) ابن سعد ص ۶۳۔ (۲) ابن سعد صفحہ ۴۴ جلد غزوات (۳) (ابن سعد جز، مغازی سریۂ خبط (۴) صحیح مسلم باب اصابۃ میتۃ البحر، صحیح بخاری باب غزوۂ سیف البحر میں بھی یہ روایتیں ہیں)

صریح غلطی ہے، کیوں کہ یہ زمانہ تو صلح حدیبیہ کا تھا، اس بنا پر ان الفاظ کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ مہم قافلۂ قریش کی حفاظت اور جہینہ کو روکنے کے لئے بھیجی گئی تھی، حافظ ابن حجر کی بھی یہی تحقیق ہے) (۱)۔

غزوۂ غابہ

عرب کی جسارت اور رہزنی کی عادت کا یہ حال تھا کہ اگرچہ ہر دفعہ ان کو سخت سے سخت سزائیں ملتی تھیں، تاہم وہ کسی طرح جرائم سے باز نہیں آتے تھے، یہاں تک کہ غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا، ڈاکے ڈالتے تھے، سنہ ۴ھ میں قبیلۂ فزارہ کی آبادی میں قحط پڑا، عیینہ بن حصن جو یہاں کا رئیس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ کرم سے اس کو اجازت دی کہ اسلامی حدود میں جو سیراب تھے، مویشی چرائے، لیکن سنہ ۶ھ میں اسی عیینہ نے غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا، حملہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس[۲] اونٹنیاں لوٹ لیں، حضرت ابوذرؓ کے بیٹے جو چراگاہ کے محافظ تھے، ان کو قتل کر دیا، چنانچہ اربابِ سیر اس واقعہ کو غزوۂ غابہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

عرب کا تمام ملک جو اسلام کا دشمن ہو گیا اور اخیر فتحِ مکہ تک کفار سے جو لڑائیاں جاری رہیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ عرب کی معاش کا بڑا ذریعہ رہزنی قطاع الطریقی اور قتل و تاراج تھا، اسلام ان چیزوں کو مٹاتا تھا، اس لئے عرب اسلام سے بڑھ کر کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھ سکتے تھے۔

بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب

عرب کے قبائل دو قسم کے تھے، ایک وہ جو کسی خاص مقام پر مستقل سکونت رکھتے تھے، دوسرے وہ جو خیمہ نشین اور بادیہ گرد تھے، ان کا کوئی خاص مستقر نہ تھا، جہاں چشمہ یا سبزہ زار دیکھا، خیمے ڈال دیئے جب وہاں بھی پانی نہ رہا، تو خبر رساں کسی اور مقام کی خبر لائے، اور وہاں چلے گئے، ان قبائل کو عربی میں اصحاب الوبر کہتے ہیں، زیادہ تر جو قبائل ڈاکے ڈالا کرتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے، اسی قسم کے قبائل تھے، ان کا انتظام اور ان کی روک ٹوک سخت مشکل تھی، ان کی تعزیر کے لئے فوجیں جاتی تھیں، تو یہ پہاڑوں پر بھاگ جاتے تھے اور قابو میں نہیں آتے تھے، اس لئے مجبوراً جو فوجیں ان پر بھیجی جاتی تھیں، غفلت میں بھیجی جاتی تھیں کہ وہ بھاگ نہ جانے پائیں۔

اکثر سرایا کے بیان میں اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ

---

(۱) فتح الباری ج ۸ ص ۶۱ و ۶۲

فوجیں بھیجیں جو راتوں کو چلتی تھیں اور بے خبری کی حالت میں موقع پر پہنچ کر حملہ کرتی تھیں اور قبائل کو لوٹ لیتی تھیں۔ اس قسم کے واقعات تمام کتابوں میں کثرت سے منقول ہیں۔ اور ان ہی واقعات سے یورپ کے لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ اسلام نے دشمن پر ڈاکہ ڈالنا اور لوٹ مار کرنا جائز رکھا ہے۔ اسی بنا پر مارگولیوس نے یہ استدلال کیا ہے کہ "چونکہ بہت دنوں تک مسلمانوں کے پاس معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قبائل پر بے خبری میں حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لایا کرتے تھے"۔

لیکن جب زیادہ تفحص اور استقراء اور کدو کاوش سے تمام واقعات بہم پہنچائے جائیں تو ثابت ہو گا کہ اچانک حملہ ان ہی قوموں پر کیا جاتا تھا جن کی نسبت یہ احتمال ہوتا تھا کہ ان کو خبر ہو گی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائیں گے، چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کو خبر ہوئی اور وہ کسی طرف چل دیئے۔ اس قسم کے چند واقعات ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں، ان میں سے بعض میں آپؐ خود تشریف لے گئے۔ اور بعض میں کچھ دستے بھیج دیئے۔

غزوۂ بنو سُلیم سنہ ۳ھ (ابن سعد صفحہ ۲۴)

واغذ السیر .... فوجدهم قدتفر قوافی میا ههم فرجع	اور بہت تیزی سے بگ ٹٹ گئے۔ لیکن وہ لوگ اپنے چشموں کی طرف چل دیئے تھے (اس لئے لوٹ آئے)

غزوۂ ذات الرقاع، سنہ ۴ھ

وهربت الاعراب الی رؤس الجبال	اور اعراب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریۂ عُکاشہ، سنہ ۶ھ

وجه رسول الله صلی الله علیه وسلم عكاشة بن محصن الی الغمر فی اربعین رجلا فخرج سریعا یغذ السیر .... فهربوا (ص ۶۱)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاشہؓ بن محصن کو ۴۰ آدمیوں کے ساتھ غمر بھیجا، وہ بگ ٹٹ گئے .... لیکن وہ لوگ بھاگ گئے۔

سریہ علیؓ بن ابی طالب، الی بنی سعد سنہ ۶ھ

فبعث الیهم علی ابن ابی طالب	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو

فی مائة رجل فسار اللیل و کمن	سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا، وہ راتوں کو
النہار حتی انتہٰی الی الھمج	چلتے تھے اور دن کو چھپ رہتے تھے، یہاں
فاغاروا علیھم فاخذوا	تک کہ مقام ہمج پہنچ گئے، پھر ان لوگوں پر حملہ
خمس مائة بعیر والفی شاة	کیا اور پانچ۵۰۰ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں
وھربت بنو سعد بالظعن	لوٹیں، اور بنو سعد مستورات کو لے کر
(ص ۶۵)	بھاگ گئے۔

غزوۂ بنو لحیان سنہ ۶ھ

(فسمعت بھم بنو لحیان فھربوا	بنو لحیان نے ان کی آمد سنی تو پہاڑوں کی
فی رؤس الجبال	چوٹیوں پر بھاگ گئے،

سریۂ عمرؓ بن خطاب بہ طرف تربہ سنہ ۷ھ

فکان یسیر اللیل ویکمن النہار	راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ
فاتی الخبر ھوازن فھربوا وجاء	جاتے تھے، ہوازن کو خبر لگ گئی
عمر بن الخطاب محالھم فلم	تو وہ فرار ہو گئے حضرت عمرؓ ان
یلق منھم احدا)	کے پڑاؤ پر پہنچے تو کسی کو نہ پایا)

سریۂ کعب بن عمیر، ربیع الاول سنہ ۸ھ

اس سریہ کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ۱۵ شخصوں کو شام کی طرف بھیجا، ذات اطلاح پہنچ کر ان لوگوں کو ایک بڑی جماعت نظر آئی، ان لوگوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے انکار کیا، اور ان پر تیراندازی شروع کی، مجبور ہو کر یہ لوگ بھی لڑے، اور بالآخر سب شہید ہوئے، صرف ایک صاحب بچے، انہوں نے آکر خبر کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے انتقام لینا چاہا، لیکن وہ لوگ یہ مقام چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے، ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں:-

وھم بالبعث الیھم فبلغه	ان پر فوج بھیجنے کا ارادہ کیا، پھر
انھم قد ساروا الی موضع آخر	معلوم ہوا کہ وہ اور کہیں چلے گئے،

اشاعتِ اسلام

(ان اغراض کے علاوہ اور جو سرایا بھیجے گئے، ان کی غرض اشاعتِ اسلام

ہوتی تھی، لیکن چونکہ ملک میں امن وامان نہ تھا، اور نیز دشمنوں نے اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا رکھی تھی لیکن دعوتِ اسلام کے لئے جو سرایا جاتے تھے، ان کی زندگی ہمیشہ معرضِ خطر میں رہتی تھی۔

سریۂ بیر معونہ صفر سنہ ۴ھ میں سترؐ داعیانِ اسلام کی جماعت قبیلۂ کلاب میں رئیسِ قبیلہ کی دعوت پر اشاعت اسلام کی غرض سے بھیجی گئی۔ لیکن بیر معونہ کے قریب قبائل رعل و ذکوان کے ہاتھ سے کل کی کل شہید ہوئی۔ صرف ایک صاحب بچ گئے تھے جنھوں نے مدینہ آکر خبر کی۔

سریۂ مرثد اسی زمانہ میں یعنی صفر سنہ ۴ھ میں قبیلۂ عضل وقارہ نے تعلیم وارشاد کے لئے دعاۃ اسلام کے بھیجنے کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عاصمؓ، حضرت خبیبؓ، حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد وغیرہ دس ۱۰ صاحبوں کو اس غرض کے لئے روانہ فرمایا، مقام رجیع میں پہنچ کر بنو لحیان نے ان پر حملہ کیا، اور ایک کے سوا کل صاحب شہید کر دیئے گئے۔

غزوۂ بنی لحیان سنہ ۶ھ میں بنو لحیان کی تعزیر کے لئے مہم گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی، وہ سن گن پا کر بھاگ گئے تھے)۔

سریۂ ابن ابی العوجاءؓ سنہ ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داعیوں کی ایک جماعت جس میں پچاس آدمی شامل تھے، قبیلۂ بنی سلیم کے پاس بھیجی، اس گروہ کے سردار ابن ابی العوجاءؓ تھے، انہوں نے بنو سلیم کو دعوت دی۔ لیکن ان لوگوں نے انکار کیا اور تیر اندازی شروع کی، یہ لوگ بھی لڑے، لیکن پچاس آدمی قبیلہ کے قبیلہ کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رئیسِ فوج یعنی ابن ابی العوجاءؓ کے سوا سب شہید ہوئے۔

سریۂ کعب ابن عمیر ربیع الاول سنہ ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعبؓ بن عمیر غفاری کو پندرہ ۱۵ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ دعوتِ اسلام کے لئے ذات اطلاح کی طرف روانہ کیا، یہ مقام شام کے حدود میں وادی القریٰ سے اس طرف ہے۔ ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی۔ لیکن جواب وہی تیغ و سنان تھا، یہاں

تک کہ یہ جماعت بھی کل کی کل شہید ہوئی، صرف ایک صاحب بچ گئے جنھوں نے آکر مدینہ میں خبر کی۔

(اس بنا پر اکثر دعوت اسلام کے لئے جو سرایا بھیجے جاتے تھے، ان کے ساتھ حفاظت کی غرض سے کچھ فوج بھی ساتھ کر دی جاتی تھی، لیکن اس صورت میں بہ تصریح افسروں کو کہہ دیا جاتا تھا کہ صرف اشاعتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی بھڑائی کی اجازت نہیں، مثلاً فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا، اور ۳۰ آدمیوں کی جمعیت) ساتھ کر دی، تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی مقصود نہیں، چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں:

بعثه الی بنی جذیمة داعیا الی الاسلام ولم یبعثه مقاتلا (ص ۱۰۶)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالدؓ کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا، دعوتِ اسلام کے لئے، نہ کہ لڑنے کے لئے۔

علامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں:۔

قد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث فیما حول مکة السرایا تدعوا الی اللہ عزوجل ولم یامرھم بقتال (۱)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں سرایا بھیجے، دعوتِ اسلام کے لئے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے بھی حضرت خالدؓ نے تلوار سے کام لیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو آپؐ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر کہا "اے خدا خالدؓ نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں"۔ تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا، جنھوں نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ کتوں کا خوں بہا ادا کیا، اور اس پر مزید رقم دی (۲)، یہ واقعہ باختلافِ الفاظ حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

(اسی طرح سنہ ۱۰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو جب ۳۰۰ سواروں کے ساتھ یمن بھیجا تو آپؐ نے فرمایا:۔

فاذا نزلت بساحتھم فلا تقاتلھم حتی یقاتلوک (ابن سعد مغازی ص ۱۲۲)	جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے، تم نہ لڑنا،

(۱) تاریخ طبری (جلد ۳) ص ۱۶۴۹۔ (۲) تاریخ طبری (جلد ۳) ص ۱۶۵۱۔

(اسی سلسلہ میں وہ سرایا بھی داخل ہیں جو فتحِ مکہ کے بعد بت شکنی کے لئے اطرافِ ملک میں روانہ کئے گئے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عرب میں مختلف قبیلوں کے الگ الگ بت خانے تھے، فتحِ مکہ کے بعد جب عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کرلیا تو بتوں کی عظمت اور جباری کا جاہلانہ اور وہم پرستانہ تخیل بعض قبائل سے دفعتاً نہ مٹ سکا، اب گو وہ ان کو لائقِ پرستش نہیں سمجھتے تھے، تاہم ان کے دلوں پر ان اصنام کی دراشتاً ایک مدت سے جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی، اس سے یہ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان باطل پرستیوں کے مرکز کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیں، جاہلوں کو یقین تھا کہ ان مقدس پتھروں کا ایک ریزہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، مصائب اور بلاؤں کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔

اہلِ طائف نے بیعت کرتے ہوئے شرط پیش کی تھی کہ ان کا بت خانہ ایک سال تک ڈھایا نہ جائے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ منظور نہ فرمایا تو دوسری شرط یہ پیش کی کہ ہم ان کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑیں گے، بعض اور نو مسلم قبائل بھی اس ادائے فرض میں جھجکتے تھے، اس بنا پر ان مقامات میں چند راسخ العقیدہ اور صحیح الفہم مسلمان بھیجے گئے کہ وہ ان کی طرف سے اس فرض کو انجام دیں، چنانچہ سریۂ خالدؓ بن ولید بت خانہ عزیٰ، سریۂ عمروؓ بن العاص بت خانہ سواع، سریۂ سعد بن زید اشہلی بت خانۂ مناۃ، سریۂ ابوسفیان و مغیرہ بن شیبہ بت خانہ لات، سریۂ جریر بت خانۂ ذی الخلصہ (۱)، سریۂ طفیل بن عمرو دوسی بت خانۂ ذی الکفین اور سریۂ علیؓ بن ابی طالب بت خانۂ فلس کے توڑنے کو روانہ کئے گئے) (۲)۔

جنگی اصلاحات

جنگ افعالِ انسانی کا بدترین منظر ہے، عرب کی جنگ تو ظلم، توحش، قساوت، سفاکی، بے دردی اور درندہ پن کا تماشا گاہ تھی، لیکن اعجازِ نبوت سے یہی چیز تمام نقائص سے پاک ہو کر ایک مقدس فرضِ انسانی بن گئی۔

کسی ملک میں جب ہزاروں برس سے ظلم و غارت گری متوارث چلی آتی ہے تو شروع شروع میں مہذب سے مہذب حکومت کو بھی چند روز قدیم اصول اور طرز عمل کو اختیار کرنا پڑتا ہے جس کو طبی اصطلاح میں علاج بالمثل کہتے ہیں، آغازِ اسلام میں حملہ آور جنگ کے متعلق بعض واقعات اس قسم کے ملتے ہیں جو پہلے سے رائج تھے، مثلاً جاہلیت میں دستور تھا کہ دشمن پر بے خبری کی

---

(۱) (صحیح بخاری غزوۂ ذی الخلصہ۔ (۲) اس باب میں تمام تر واقعات ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہیں)

حالت میں جا پڑتے تھے، اور قتل و قید کرتے تھے۔ اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا، لیکن ابتداء ہی میں اگر اس پر عمل کیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ دشمن ہمیشہ دفعتاً حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو قتل کیا کرتے اور مسلمان اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکتے، یا کرتے تو پہلے ان کو خبر کرتے، جس کے بعد وہ کہیں ٹل جاتے، یا اپنی حفاظت کا سامان کر لیتے، لیکن جس قدر اسلام کو زور و قوت حاصل ہوتی گئی، اسی قدر وہ قدیم طریقے مٹتے گئے، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب کا خاتمہ ہو گیا۔

اسلام سے پہلے جنگ کا جو طریقہ تھا اور جس قسم کے وحشیانہ افعال عمل میں آتے تھے، ان کو ہم تفصیل سے اوپر لکھ آئے ہیں، ان صفحات کو دوبارہ سامنے رکھ لو اور اس کے مقابلہ میں دیکھو، اسلام نے کیا کیا اصلاحیں کیں۔

اس بات کو قطعاً روک دیا کہ عورتیں، بوڑھے، بچے، صغیر السن، نوکر، خادم لڑائیوں میں قتل کئے جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی مہم پر فوج بھیجی جاتی تو سردارِ فوج کو جو احکام دیے جاتے ان میں ایک یہ لازمی حکم بھی ہوتا (۱)، ابوداؤد میں یہ حکم ان الفاظ میں مذکور ہے:

لاتقتلوا شیخا فانیا و لا طفلا	کسی کہن سال کو، بچہ کو، کم سن کو،
ولا صغیرا و لا امراءۃ (۲)	عورت کو قتل نہ کرو۔

غزوات میں کبھی کسی عورت کی لاش آپ کی نظر سے گذرتی تو آپ نہایت سختی سے منع فرماتے، صحیح مسلم میں متعدد حدیثیں اس کے متعلق مذکور ہیں۔

اسلام سے پہلے معمول تھا کہ دشمن کو گرفتار کر لیتے تو کسی چیز سے باندھ کر اس کو تیروں کا نشانہ بناتے، یا تلوار سے قتل کرتے، عربی میں اس طریقہ کو صبر کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روک دیا۔

ایک دفعہ حضرت خالدؓ کے صاحبزادے (عبدالرحمن) نے ایک لڑائی میں چند آدمیوں کو گرفتار کر کے اسی طرح قتل کرایا تھا، حضرت ابوایوب انصاریؓ نے سنا تو کہا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ اس سے منع فرماتے تھے۔ خدا کی قسم میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا"۔ عبدالرحمن نے اسی وقت کفارۂ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کئے (۳)۔

---

(۱) صحیح مسلم باب الجہاد۔ (۲) (کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین، ابوداؤد میں یہ باب کتاب الجہاد میں مکرر ہے، یہاں پہلا باب مراد ہے) "س"۔ (۳) ابوداؤد، جلد ۲ ص ۱۰ (باب قتل الاسیر بالنبل) "س"۔

لڑائیوں میں عہد کی کچھ پابندی نہ تھی، جنگ معونہ وغیرہ میں کفار نے مسلمانوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا، یعنی قول و قسم لے کر مسلمانوں کو ساتھ لوا گئے اور گھر لے جا کر قتل کر ڈالا، قرآن مجید میں ان ہی واقعات کی طرف اشارہ ہے :

لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّۃً ... کسی مسلمان کے متعلق وہ نہ قسم کا لحاظ رکھتے ہیں، نہ ذمہ داری کا، ... ان کی قسم قسم نہیں :

اِنَّھُمْ لَا اَیْمَانَ لَھُمْ (توبہ - ۹ : ۱۰، ۱۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تاکید کی کہ جو عہد کیا جائے، ہر حال میں اس کی پابندی کی جائے، قرآن مجید میں اس کے متعلق جا بجا تاکیدی اور صاف اُحکام ہیں، عہدِ نبوت اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں پابندیِ عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے، تو بہت سے صحابہؓ مجبوریوں کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے، ان میں حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ان کے والد بھی تھے، جنگ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ان کے والد کہیں سے آ رہے تھے، کفار نے ان کو پکڑ لیا کہ تم مدینہ جا کر پھر ہمارے مقابلہ کو آؤ گے، انہوں نے کہا ہمارا مقصد صرف مدینہ جانا ہے، کفار نے ان سے عہد لے کر چھوڑ دیا، یہ لوگ مقامِ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، اور یہ دیکھ کر کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار سے مصروف جنگ ہیں، خود بھی اس سعادت کی آرزو کی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باز رکھا کہ تم معاہدہ کر چکے ہو۔

ابو رافع کو قریش نے قاصد بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا، بارگاہ نبوّت میں آکر ان پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان ہو گئے، اور عرض کی اب میں کافروں میں واپس نہ جاؤں گا، آپؐ نے فرمایا تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد کے خلاف ہے، اس وقت واپس جاؤ، پھر آجانا (۱)۔

صلح حدیبیہ میں جب حضرت ابو جندلؓ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں، آپؐ نے فرمایا ہاں، لیکن قریش سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ آئے گا تو ہم قریش کے پاس بھیج دیں گے، اس پر حضرت ابو جندلؓ

---

(۱) ابوداؤد جلد ۱ صفحہ ۳، ۲ کتاب الجہاد باب یستجن بالامام فی العہود۔ س

نے رو کر تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا، لوگ جوشِ رقت سے بے قرار ہوگئے اور قریب تھا کہ قابو سے باہر ہوجائیں، حضرت عمرؓ بے تاب ہوگئے، حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بار بار جاتے تھے، یہ سب کچھ تھا، لیکن پابندیِ عہد کی قیمت ان سب خطرات سے زیادہ تھی، حضرت ابوجندلؓ کو پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

اسلام سے پہلے قاصدوں کا قتل کر دینا ممنوع نہ تھا، صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے پاس جو قاصد بھیجا تھا، قریش نے اس کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا اور قاصد کو بھی قتل کر دینا چاہا، لیکن باہر والوں نے بچالیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کئے جائیں، مسیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپؐ نے فرمایا کہ "قاصد کا قتل کرنا دستور نہیں ورنہ تو قتل کر دیا جاتا"۔ مورخین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس دن سے یہ ایک قاعدہ بن گیا کہ قاصد قتل نہیں کئے جاتے تھے۔

اسیرانِ جنگ کے ساتھ عرب نہایت برا سلوک کرتے تھے، اور تمام قوموں میں بھی یہی طریقہ جاری تھا، جنگِ صلیبی میں یورپین سلطنتیں جب مسلمانوں کو لڑائیوں میں گرفتار کرتی تھیں تو ان سے جانوروں کی طرح کام لیتی تھیں۔

علامہ ابن جبیر حروبِ صلیبیہ کے زمانہ میں سسلی میں گذرے ہیں تو یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے، چنانچہ لکھتے ہیں:-

ومن الفجائع التی یعاینہا من حل بلادھم اسری المسلمین یرسفون فی القیود ویصرفون فی الخدمة الشاقة والاسیرات المسلمات کذلک فی اسوقھن خلاخیل الحدید فتنفطر لھم الافئدة (۱)	اور منجملہ ان دردانگیز حالات کے جو ان شہروں میں نظر آتے ہیں، اسیرانِ اسلام ہیں جو بیڑیاں پہنے نظر آتے ہیں اور جن سے سخت محنتِ شاقہ کی جاتی ہے، اور اسی طرح مسلمان عورتیں پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے پہنے سخت محنتِ شاقہ سے کام کرتی ہیں جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ جنگ کی نسبت تاکید کی کہ ان کو کسی طرح کی

(۱) رحلہ ابن جبیر مطبوعۂ لیڈن سنہ ۱۹۰۷ء ص ۳۰۷۔

تکلیف نہ پہنچنے پائے، اسیرانِ بدر کو جب آپؐ نے صحابہؓ کے حوالہ کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے، چنانچہ صحابہؓ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کرلیتے تھے، اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے، غزوۂ حنین میں چھ ہزار اسیر تھے، سب چھوڑ دیئے گئے، اور آپؐ نے ان کے پہننے کے لئے چھ ہزار جوڑے (مصر کے کپڑے کے) عنایت فرمائے، چنانچہ ابن سعد نے اس واقعہ کی تصریح کی ہے۔

حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو آپؐ نے عزت و حرمت سے مسجد کے ایک گوشہ میں اس کو مقیم کیا اور فرمایا کہ کوئی تمہارے شہر کا آجائے تو میں اس کے ساتھ تم کو رخصت کردوں، چنانچہ چند روز کے بعد سفر کا سامان کر کے ایک شخص کے ساتھ یمن بھجوا دیا۔

قرآن مجید میں جہاں خدا نے بندگانِ خاص کے اوصاف بتائے ہیں، وہاں فرمایا ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (دھر۔ ۶: ۸)	اور یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین کو، یتیم کو اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

معمول تھا کہ جب کسی قوم پر حملہ ہوتا تو اہلِ فوج چاروں طرف دور دور پھیل جاتے، جس سے راستے بند ہوجاتے، گھروں میں آنا جانا مشکل ہوجاتا، راہ گیروں کا مال و متاع لٹ جاتا، یہ طریقہ ایک مدت سے چلا آتا تھا، ایک لڑائی میں قدیم دستور کے مطابق یہی حرکتیں لوگوں سے سرزد ہوئیں، آپؐ نے منادی کرادی کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا جہاد جہاد نہیں۔

ابوداؤد میں (حضرت معاذ بن انسؓ) سے روایت ہے:

غزوت مع نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم غزوۃ کذا وکذا فضیق الناس المنازل وقطعوا الطریق فبعث النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم منادیا ینادی فی الناس ان من ضیق منزلا وقطع طریقا فلا جہاد لہ (۱)	میں فلاں غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا، لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کر ان کو تنگ کیا، لوٹا مارا، آپؐ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے، اس کا جہاد قبول نہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ حکم دیا کہ لوگ ادھر اُدھر پھیل نہ جایا کریں تو لوگ اس طرح سمٹ کر پڑاؤ ڈالتے تھے کہ ایک چادر تان دی جاتی تو سب

(۱) ابوداؤد کتاب الجہاد جلد اول ص ۳۵۴ (باب مایؤمر من انضمام العسکر) "س"

اس کے نیچے آجاتے (۱)۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مالِ غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا، اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا، جاہلیت میں تو غنیمت محبوب ترین چیز تھی، تعجب یہ ہے کہ اسلام میں بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے تھے، ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا،

رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا اجر لہ فاعظم ذلک الناس وقالو اللرجل عد لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلعلک لم تفھمہ [ابوداؤد جلد ا ص ۳۴۲ (باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا)] "س"

ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے، لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا، یہ امر لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا، اور لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جا کر پوچھو، غالباً تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا۔

بار بار لوگ دوبارہ دریافت کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہوگا، بالآخر جب آپؐ نے تیسری دفعہ بھی یہی فرمایا کہ لا اجر لہ یعنی اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا، تب لوگوں کو یقین آیا۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہؓ کو ایک قبیلہ کے مقابلہ کے لئے بھیجا، ان میں سے ایک صاحب صف سے آگے نکل گئے، قبیلہ والے روتے ہوئے آئے، انہوں نے کہا کہ لا الہ الا اللہ کہو تو بچ جاؤ گے، لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور حملہ سے بچ گئے، اس پر ساتھیوں نے ان کو ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا ابوداؤد میں صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے:

فلامنی اصحابی وقالوا حرمتنا الغنیمۃ (ابوداؤد باب مایقول اذا اصبح کتاب الادب)

مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت کی، تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا،

جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر ان کی شکایت کی تو آپؐ نے ان

(۱) ابوداؤد کتاب الجہاد (باب مایؤمر من انضمام العسکر) "س"

کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیئے گئے) کے بدلے اتنا اتنا ثواب ملے گا۔ (ابوداؤد)۔

قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت "متاع دنیوی" کا لفظ آتا تھا، اور اس کی طرف انہماک اور وارفتگی پر ملامت کی جاتی تھی۔ جنگِ اُحد میں جب اس بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اتری:

مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ — تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلب گار تھے،
مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ (آلِ عمران۔ ۳:۱۵۲) — اور کچھ آخرت کے۔

جنگِ بدر میں لوگوں نے جب اجازت سے پہلے غنیمت لوٹنی شروع کر دی (یا) بقول بعض مفسرین فدیہ کی خواہش سے لوگوں کو گرفتار کیا تو یہ آیت اتری:

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ — تم لوگ دنیا کی پونجی چاہتے ہو، اور خدا
يُرِيدُ الْآخِرَةَ (انفال۔ ۸:۶۷) — آخرت چاہتا ہے،

باوجود ان تمام تصریحات اور بار بار کی تاکید کے غزوۂ حنین میں جو سنہ ۸ھ میں واقع ہوا تھا، اس وجہ سے شکست ہوئی کہ لوگ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ صحیح بخاری غزوۂ حنین کے ذکر میں ہے:

فاقبل المسلمون علی الغنائم — تو مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے، اور
واستقبلنا بالسهام — کافروں نے ہم کو تیروں پر رکھ لیا،

اس بنا پر موقع بہ موقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلہ کو زیادہ تر تصریح سے بیان فرماتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہارِ شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا"؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من قاتل لتکون کلمة اللّٰه — جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا
هی العلیا (۱) — بول بالا ہو،

بالآخر آپؐ نے یہ فرما دیا کہ گو جہاد کسی نیت سے کیا جائے، لیکن اگر مجاہد مالِ غنیمت

---

(۱) (بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمة اللّٰه هی العلیا و صحیح مسلم کتاب الامارة) "س"

قبول کرتا ہے تو دو تہائی ثواب کم ہو جاتا ہے، پورا ثواب اسی وقت ملتا ہے جب غنیمت کو مطلق ہاتھ نہ لگائے، صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الفاظ یہ ہیں:

مامن غازیة تغزو فی سبیل اللّٰہ فیصیبون الغنیمة الا تعجلوا ثلثی اجرھم من الاٰخرة ویبقی لھم الثلث وان لم یصیبوا غنیمة تم لھم اجرھم (۱)	جو غازی خدا کی راہ میں لڑتا ہے، اور مالِ غنیمت لیتا ہے، وہ آخرت کے ثواب کا دو ثلث یہیں لے لیتا ہے اور آخرت میں اس کا حصہ صرف ایک تہائی رہ جاتا ہے، البتہ اگر غنیمت مطلق نہ لے تو اس کو آخرت میں پورا اجر ملے گا۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی دلوں سے اتر گئی، اور جہاد سے صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا، واقعۂ ذیل سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت واثلہؓ بن الاسقع ایک صحابی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک کی مہم پر روانہ ہوئے تو ان کے پاس سامان نہ تھا، مدینہ میں آواز دیتے پھرے کہ "کوئی ہے، جو ایسے شخص کو سواری دے کہ جو کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آئے گا، اس میں وہ برابر کا شریک ہو گا"۔ ایک انصاری نے سواری اور خوراک سب اپنے ذمہ لی، اس مہم میں کئی اونٹ ہاتھ آئے حضرت واثلہؓ واپس آکر انصاری کے پاس سب اونٹ لے گئے اور کہا "یہ وہ اونٹ ہیں جن کی نسبت میں نے شرط کی تھی کہ آپ بھی اس میں حصہ دار ہوں گے"۔ انہوں نے کہا "ان کو تم ہی لو، میرا شرکت سے کچھ اور ارادہ تھا"۔ (یعنی اونٹ میں نہیں بلکہ جہاد کے ثواب میں شرکت مقصود تھی) (۲)۔

دورانِ جنگ میں دشمن کے مال اور جائداد کا لوٹنا بھی عام رواج تھا، خصوصاً جب کہ رسد ٹھٹھر جاتی تھی، اور کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا، تو ہر حال میں یہ فعل جائز سمجھا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت کی اور سرے سے اس طریقہ کو روک دیا، ابو داؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے، اور غایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی، اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا، سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ

---

(۱) (صحیح مسلم کتاب الامارہ باب بیان ثواب من غزا فغنم وابو داؤد باب فی السریہ) "س" (۲) ابو داؤد کتاب الجہاد جلد ثانی (باب الرجل یکری دابتہ علی النصف او السہم "س"۔

پس، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، آپؐ موقع پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا، اور ہانڈیاں ابال کھا رہی تھیں، آپؐ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپؐ نے اس سے ہانڈیاں الٹ الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا "لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے" (۱)۔

لڑائی عبادت بن گئی

اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے، اس قدر پاک اور منزہ کر دیا کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی، جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے، جابر اور ظالم، کمزور آدمیوں پر دست ستم دراز نہ کرنے پائیں۔

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (حج۔ ۲۲: ۳۹۔۴۰)

جن لوگوں سے لوگ لڑائی کرتے ہیں، ان کو اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ ان پر ظلم کیا گیا اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس بنا پر نکال دیے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب خدا ہے۔

ملک میں ہمیشہ جو فتنہ و فساد برپا رہتا تھا، اور لوگ امن و امان سے بسر نہیں کر سکتے تھے۔ جہاد اس غرض سے تھا کہ فساد کو مٹا دے اور امن قائم کر دے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ

اور ان سے لڑو تاکہ فتنہ نہ رہے۔

(انفال۔ ۸: ۳۹)

جو لوگ خدا پر اور جزاء و سزا پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اس وجہ سے ان کے نزدیک ہر قسم کے ظلم و ستم جائز تھے، اور ان کو جائز ناجائز کی کچھ تمیز نہ تھی، جہاد سے ان کا زیر کرنا اور ان لوگوں کو اُن کے ظلم سے بچانا مقصود قرار دیا گیا۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (توبہ۔ ۹: ۲۹)

ان لوگوں سے لڑو جو نہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں، نہ قیامت پر، اور جن کاموں کو خدا اور رسول نے حرام قرار دیا ہے، اس کو حرام نہیں سمجھتے۔

جہاد میں فتح پانے اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں قرار دیا گیا کہ فاتح دولت و مال اور حکومت کا لطف اٹھائیں، بلکہ یہ غرض قرار دی گئی کہ لوگوں کو عبادت و ریاضت اور فقراء کی دستگیری کی تلقین کریں اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برے کاموں سے لوگوں

(۱) ابوداؤد کتاب الجہاد جلد ثانی (باب فی النہی عن النہبیٰ اذا کان فی الطعام قلۃ) ص۔

کو روک دیں۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج۔ ۲۲: ۴۱)

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیں تو وہ نماز کے پابند ہوں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے، اور بری باتوں سے روکیں گے۔

کسی ملک کی فتح سے جو دولت و مال ہاتھ آتا تھا، وہ فاتح کا خاص حصہ ہوتا تھا، جس کو وہ اپنے مصارف عیش میں استعمال کرتا تھا، اور دربار کے امراء درجہ بدرجہ اس سے مستفید ہوتے تھے، لیکن اس کا مصرف یہ قرار دیا:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (انفال۔ ۸: ۴۱)

اور جان لو کہ تم کو جو کچھ مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں (۱) حصہ خدا کا ہے اور رسول کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا۔

جہاد نہ صرف حقیقت کے لحاظ سے بلکہ صورتاً بھی عبادت بنا دیا گیا، مجاہدین کو تاکید تھی کہ عین جنگ کے وقت بھی خدا کا نام لیتے رہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (انفال۔ ۸: ۴۵)

مسلمانو! جب کسی گروہ سے مڈ بھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ تم کامیاب ہو گے۔

نماز میں جس طرح اٹھتے بیٹھتے تکبیر و تسبیح یعنی اللہ اکبر اور سبحان ربی الاعلی کہتے ہیں، جہاد میں بھی یہی حکم تھا، حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تھے تو اللہ اکبر کہتے تھے، اور جب نیچے اترتے تو سبحان اللہ کہتے تھے، بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تھے تو تین۳ دفعہ اللہ اکبر کہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد پر جا رہے تھے، صحابہؓ زور زور سے تہلیل و تکبیر کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " اس قدر شور سے نہیں کہنا چاہیے، کیوں کہ

---

(۱) اس پانچویں حصہ کے سوا باقی تمام مال غنیمت مجاہدین کا حق ہے۔

خدا جس کو تم پکارتے ہو وہ بہرا نہیں ہے"۔ (۱) بعینہ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو نماز میں پکار کر قرآن پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔

نکتہ

ابو داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جہاد (۲) میں دستور تھا کہ چڑھائیاں آتی تھیں تو تکبیر کہتے تھے اور اتار آتا تھا تو تسبیح پڑھتے تھے، نماز بھی اسی اصول پر قائم کی گئی، یعنی سر اٹھاتے ہیں تو اللہ اکبر اور سجدہ میں جاتے ہیں تو سبحان اللہ کہتے ہیں، اس روایت میں ادائے مطلب میں ذرا فرق آگیا ہے، جہاد کے اصول پر نماز نہیں قائم کی گئی، بلکہ جہاد میں نماز کا طریقہ ملحوظ رکھا گیا ہے، کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ نماز ابتدائے اسلام سے وجود میں آئی اور جہاد کی تاریخ ہجرت کے بعد سے شروع ہوتی ہے، بہر حال اس روایت سے اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ نماز اور جہاد دونوں میں ایسی مشابہت تھی کہ ایک کو اصل اور دوسرے کو اس کی نقل سمجھتے تھے۔

غرض وہی جنگ جو ہر طرح کے ظلم و ستم اور جہالت و وحشت کا مجموعہ تھی، اسلام کی تعلیم ربانی نے اس کو اعلائے کلمۃ اللہ، قیامِ امن، رفعِ مفاسد، نصرتِ مظلوم اور تسبیح و تہلیل کی صورت میں بدل دیا۔

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

جہاد کے معرکوں میں آپؐ کے ہاتھ میں گو تیغ و سپر اور جسم مبارک پر خود و مغفر ہوتا تھا، لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا۔

عین اس وقت جب معرکۂ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھی آرہی ہیں، عین اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سرِ مبارک سجدۂ نیاز میں ہے، معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے، فوجیں تیروں کا مینھ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، فاتحِ بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھالیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے، دفعتاً فوجوں کا

---

(۱) کتاب الجہاد باب التکبیر عندالحرب - (۲) ابو داؤد کتاب الجہاد (باب ما یقول اذا سافر) جلد ۱ ص ۲۵۷ مطبوعہ مجتبائی، اصل عبارت یہ ہے، (و کان) النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجیوشہ اذا علوا الثنایا کبروا واذا ھبطوا سبحوا فوضعت الصلوۃ علی ذلک۔

بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے۔

حنین میں دشمن نے دفعتاً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے بارہ ہزار آدمیوں میں سے ایک (۱) بھی پہلو میں نہیں، سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے رہے ہیں، لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے، اور ایک پر جلال آواز آرہی ہے،

انا النبی لا کذب — میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں۔

عین اس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعتاً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امامِ نماز ہے، فوجیں صفوفِ نماز ہیں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش و خروش، تہور و جاں بازی، غیظ و غضب، اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے، صفیں دو دو رکعتیں ادا کر کے دشمن کے مقابلہ پر چلی جاتی ہیں، ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ دو رکعتیں ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں، اور مشغولینِ جنگ آکر بقیہ نمازیں پوری کر لیتے ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں، امام (رسولؐ) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے۔

تعلیم و ارشاد، ہدایت و تلقین، تہذیب و تزکیہ کا کام ہر وقت جاری ہے، عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چور ہیں، مالِ غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں، ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں "یا رسول اللہ! آج میں نے مالِ غنیمت سے جس قدر نفع اٹھایا، کبھی نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ ہاتھ آئے"۔ (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپؐ فرماتے ہیں کہ "میں اس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں"؟ وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں، کیا؟ ارشاد ہوتا ہے، "نمازِ فرض کے بعد دو رکعتیں" (۲)۔

تم المجلد الاول من السیرۃ النبویۃ علی صاحبہا الصلوۃ و التحیۃ

---

(۱) (چند خاص رفقاء کے سوا) "س" (۲) ابوداؤد باب التجارۃ فی الغزو۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اشاریہ و کتابیات

سیرۃ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم

(حصہ اوّل)

مرتبہ

روحی طیبی، کراچی

و

محمد عارف عمری

(رفیق دارالمصنفین)

اشخاص

(ش)

(ص)

(غ)

کتب

مقامات

کتابیات

(۱) القرآن الکریم

(۲) احکام القرآن ۔ قاضی ابو بکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی المتوفی ۶۳۰ھ / ۱۲۳۲ء ۔ مطبوعہ مطبعہ السعادہ، مصر ۔ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء

(۳) البحر المحیط ۔ اثیر الدین محمد بن یوسف الشہیر بابن حیان المتوفی ۷۴۵ھ / ۱۳۴۴ء ۔ مطبعہ السعادہ ۔ مصر ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء

(۴) اخبارِ مکہ ۔ ابو الولید محمد بن عبداللہ ازرقی ۔ مطبعہ ماجدیہ ۔ مکہ مکرمہ ۔ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء ۔ اس کتاب کا حوالہ جامع سیرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حواشی میں ہے ۔

(۵) ارشاد الساری شرح صحیح البخاری ۔ احمد بن محمد بن ابی بکر القسطلانی الشافعی ۔ مطبعہ بولاق ، مصر ۔ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء

(۶) اسباب النزول ۔ علی بن احمد بن محمد الواحدی ۔ قاہرہ ، مصر ۔ ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء

(۷) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ۔ ابو عمر یوسف بن عبداللہ النمری القرطبی المتوفی ۴۶۳ھ / ۱۰۷۰ء ۔ دائرۃ المعارف ، حیدر آباد ۔ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء

(۸) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ۔ ابو الحسن علی بن عبدالکریم الجزری المعروف بابن الاثیر المتوفی ۶۳۰ھ / ۱۲۳۲ء ۔ مطبعہ وہبیہ ، مصر ۔ ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء

(۹) الاصابہ فی تمییز الصحابہ ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ۔ بشپ کالج پریس ۔ کلکتہ ۔ ۱۸۵۶ء ۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا دوسرا نسخہ مطبوعہ مطبعہ السعادہ ، مصر ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء بھی مصنفؒ کے پیشِ نظر تھا ۔

(۱۰) الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ۔ مطبعہ خیریہ ، مصر ۔ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء ۔ بر حاشیہ خلاصۃ الکلام فی بیان امراء البلد الحرام از سید زینی دحلان ۔

(۱۱) الانساب ۔ ابو سعد عبدالکریم السمعانی المتوفی ۵۶۲ھ / ۱۱۶۶ء ۔ عکسی مخطوطہ ۱۹۱۳ء ۔

(۱۲) انساب الاشراف۔ احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری۔ مطبع و سنِ اشاعت نامعلوم۔
(۱۳) انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون المعروف بالسیرۃ الحلبیہ۔ علی بن برہان الدین الحلبی الشافعی۔ مطبعہ ازہریہ، مصر۔ ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء
(۱۴) البدایہ والنہایہ (تاریخ ابن کثیر) ابوالفداء اسمٰعیل بن عمر القرشی المعروف بابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ / ۱۳۷۲ء۔ مطبعہ علمیہ، مصر۔ ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء سیرۃ النبی کی تالیف کے وقت تک یہ کتاب طبع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی مصنفؒ کو اس کا کوئی قلمی نسخہ دستیاب تھا، بعد میں جامعِ سیرت نے اس سے حوالے دیئے ہیں۔
(۱۵) تاریخ الخمیس فی انفس نفیس۔ حسین بن محمد الدیار بکری۔ مطبعہ وہبیہ، مصر۔ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء
(۱۶) تاریخ الرسل والملوک (تاریخ طبری) ابوجعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ / ۹۲۲ء۔ مطبعہ بریل، لائیڈن۔ ۱۸۷۹ء
(۱۷) تاریخ یعقوبی۔ احمد بن ابی یعقوب بن جعفر المعروف بالیعقوبی۔ مطبعہ بریل، لائیڈن ۱۸۸۳ء
(۱۸) التاریخ الکبیر (تاریخ ابن عساکر) ابوالقاسم علی بن الحسن بن العساکر المتوفی ۵۱۷ھ / ۱۱۲۳ء۔ مطبعہ روضۃ الشام۔ ۱۳۲۹ھ / ۱۱۹۱ء
(۱۹) التاریخ الصغیر۔ محمد ابن اسمٰعیل بخاریؒ۔ مطبعہ انوار احمدی، الٰہ آباد۔ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء
(۲۰) التاریخ الکبیر۔ محمد ابن اسمٰعیل بخاریؒ۔ یہ کتاب مصنفؒ کی نظر سے جامع ایاصوفیہ میں گذری تھی، ۱۳۶۰ھ میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے طبع ہوئی ہے۔
(۲۱) تاریخی جغرافیہ عرب۔ ریونڈ فارسٹر۔
(۲۲) تذکرۃ الحفاظ۔ شمس الدین الذہبی المتوفی ۷۴۶ھ / ۱۳۴۵ء۔ دائرۃ المعارف، حیدر آباد۔
(۲۳) ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری۔ (عربی ترجمہ) مطبوعہ مصر۔
(۲۴) ترجمہ سیرت ابن اسحاق محمد ابن اسحاق واقدی۔ قلمی محفوظ کتب خانہ دارالمصنفین اعظم گڈھ
(۲۵) تفسیر ابن جریر الطبری۔ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری۔ مطبعہ میمنیہ، مصر۔ ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء
(۲۶) تفسیر ابن کثیر۔ حافظ اسمٰعیل قرشی۔ مطبعہ عامرہ، قاہرہ۔ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء، برحاشیہ فتح البیان
(۲۷) تفسیر جلالین۔ امام محلی و امام سیوطی۔ مطبعہ میمنیہ، مصر۔ ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء
(۲۸) تقریب التہذیب۔ حافظ ابن حجرؒ۔ مطبعہ احمدی۔ ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء
(۲۹) تمدن عرب۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان، مترجمہ مولوی سید علی بلگرامی۔ مفید عام پریس، آگرہ ۱۸۹۸ء

(۳۰) التوسل والوسیلہ۔ علامہ ابن تیمیہؒ۔ مطبعہ المنار، مصر، ۱۳۲۷ھ

(۳۱) تہذیب التہذیب۔ ابن حجر عسقلانیؒ۔ دائرۃ المعارف، حیدر آباد ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۹ء

(۳۲) تہذیب الاسماء واللغات۔ ابو زکریا محی الدین بن شرف النووی المتوفی ۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء۔
ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر۔

(۳۳) الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ۔ مطبعہ النیل، مصر ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء

(۳۴) الخصائص الکبریٰ۔ امام جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء۔ دائرۃ المعارف، حیدر آباد،
۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء

(۳۵) خلاصۃ تہذیب تہذیب الکمال فی اسماء الرجال۔ صفی الدین احمد بن عبداللہ الخزرجی۔
مطبعہ کبریٰ میریہ، بمصر ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء۔

(۳۶) رحلۃ ابن جبیر۔ محمد بن احمد بن جبیر کنانی متوفی ۶۱۲ھ / ۱۲۱۵ء۔ مطبعہ بریل، لائیڈن ۱۹۰۷ء

(۳۷) روح المعانی۔ علامہ شہاب الدین سید محمد آلوسی۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر۔ ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء

(۳۸) الروض الانف۔ ابو القاسم عبدالرحمٰن احمد السہیلی متوفی ۵۸۱ھ / ۱۱۸۵ء۔ قلمی۔

(۳۹) الریاض النضرۃ فی مناقب العشرہ۔ ابو جعفر احمد الشہیر بالمحب الطبری۔ مطبعہ حسینیہ۔
۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء۔

(۴۰) زاد المعاد فی ہدی خیر العباد۔ حافظ شمس الدین المعروف بابن القیم۔ المتوفی ۷۵۱ھ ۱۳۵۰ء
مطبعہ نظامی کانپور۔ ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء

(۴۱) سنن ابو داؤد۔ امام ابو داؤد السجستانی۔ مطبعہ محمدی، دہلی ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء

(۴۲) سنن ابن ماجہ۔ ابو عبداللہ محمد ابن یزید بن ماجہ قزوینی المتوفی ۲۷۵ھ / ۱۸۸۸ء۔ اصح المطابع لکھنو

(۴۳) سنن نسائی۔ امام نسائی۔ مطبعہ ناصری، دہلی ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء نظامی پریس سے مطبوعہ نسخہ کا
بھی حوالہ ہے۔

(۴۴) سیرۃ النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ ابو محمد عبدالملک بن ہشام۔ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء،
برحاشیہ زاد المعاد اس کے علاوہ مصر کے دو اور نسخے مطبوعہ ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء و ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۷ء، کے
بھی حوالے کتاب میں ہیں۔

(۴۵) سیرت گازرونی۔ شیخ ظہیر الدین گازرونی متوفی ۶۹۴ھ / ۱۲۹۴ء۔ قلمی۔

(۴۶) سیرت منظوم۔ حافظ زین الدین عراقی۔

(۴۷) شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ۔ محمد بن عبدالباقی زرقانی۔ مکتبہ یسیریہ، مصر ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۰ء

(۴۸) شرح سیر کبیر۔ محمد بن احمد سرخسی المتوفی ۴۸۳ھ / ۱۰۹۰ء۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد۔ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء

(۴۹) شرح معانی الآثار۔ ابو جعفر طحاوی۔ مطبع مصطفائی، لکھنو۔ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء

(۵۰) شمائل ترمذی۔ محمد بن عیسی ترمذی۔ مطبعہ بولاق، مصر ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء

(۵۱) صحیح بخاری۔ محمد بن اسمعیل بخاریؒ۔ مطبعہ کرزن گزٹ۔ ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۸ء۔ مطبع نظامی کانپور سے چھپے ہوئے ایک نسخہ کا بھی حوالہ کتاب میں درج ہے۔

(۵۲) صحیح مسلم۔ امام مسلم بن حجاج نیشاپوری۔ مطبع نولکشور، لکھنو ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء

(۵۳) صفۃ جزیرۃ العرب۔ ابو محمد الحسن بن محمد ہمدانی المتوفی ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء۔ مطبعہ بریل، لائیڈن۔ ۱۸۸۴ء

(۵۴) طبقات الامم۔ قاضی صاعد بن احمد اندلسی متوفی ۴۶۲ھ / ۱۰۶۹ء۔ مطبعہ کیتھولک، بیروت۔ ۱۹۱۲ء

(۵۵) العقد الفرید۔ شہاب الدین احمد المعروف بابن عبدربہ۔ مطبعہ عامرہ شرفیہ، مصر ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء

(۵۶) عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری۔ بدر الدین محمد بن احمد العینی۔ مطبعہ عامرہ، مصر۔ ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء

(۵۷) عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر۔ ابو الفتح محمد بن محمد المعروف بابن سید الناس اندلسی متوفی ۸۳۱ھ / ۱۴۳۷ء۔ قلمی۔ مصنف کے پیش نظر اس کتاب کے قلمی نسخہ کی دوسری جلد تھی جو کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں بھی ہے اور یہ کتاب ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء میں مکتبہ قدسی، قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے۔

(۵۸) العہد الجدید (آسمانی کتاب) مطبعہ ادبیہ، بیروت۔ ۱۸۸۶ء

(۵۹) فتح الباری شرح صحیح بخاری۔ ابو الفضل احمد بن حجر عسقلانی۔ مطبعہ الکبریٰ المیریہ، مصر ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء۔

(۶۰) فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث۔ شمس الدین السخاوی متوفی ۹۰۲ھ / ۱۴۹۶ء۔ مطبعہ انوار احمدی، لکھنو ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء۔

(۶۱) فتوح البلدان۔ ابو العباس احمد بن یحیی بلاذری متوفی ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء۔ مطبعہ بریل، لائیڈن ۱۸۶۶

(۶۲) الکامل فی التاریخ۔ عز الدین محمد المعروف بابن الاثیر متوفی ۶۳۰ھ / ۱۲۳۲ء۔ مطبعہ بریل، لائیڈن۔ ۱۸۶۶ء

(۶۳) کتاب الامالی۔ ابو علی اسمٰعیل القالی المتوفی ۳۵۶ھ / ۹۶۶ء۔ مطبعہ الامیریہ، مصر ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء

(۶۴) کتاب الاموال۔ ابو عبید القاسم بن سلام متوفی ۲۲۴ھ / ۸۳۸ء۔ مصر۔

(۶۵) کتاب التنبیہ والاشراف۔ علامہ مسعودی۔ مطبع بریل، لائیڈن ۱۸۹۴ء۔

(۶۶) کتاب الثقات۔ حافظ محمد تمیمی بستی متوفی ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء۔ یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ غالباً مصنفؒ کے پیش نظر اس کا کوئی قلمی نسخہ تھا۔

(۶۷) کتاب الطبقات الکبیرات۔ محمد بن سعد کاتب واقدی۔ مطبعہ بریل، لائیڈن ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء

(۶۸) کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر (تاریخ ابن خلدون) عبدالرحمن بن محمد خلدون۔ دار الطباعہ عامرہ، مصر ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء

(۶۹) کتاب الفہرست۔ ابن ندیم۔ مطبعہ رحمانیہ، مصر ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء

(۷۰) الکتاب المقدس۔ مطبع مدرسہ آکسفورڈ، لندن۔ ۱۸۹۰ء

(۷۱) کتاب المغازی من کتب المصنف۔ ابن ابی شیبہ۔ قلمی۔

(۷۲) کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون۔ ملا کاتب چلبی مشہور بہ حاجی خلیفہ۔ مطبعۃ العالم ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء

(۷۳) اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ۔ امام سیوطی۔ مطبعہ ادبیہ، مصر۔ ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء

(۷۴) لباب النقول فی اسباب النزول۔ امام سیوطی۔ مطبعہ میمنیہ مصر ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء، برحاشیہ تفسیر جلالین

(۷۵) لسان المیزان۔ حافظ ابن حجرؒ۔ دائرۃ المعارف، حیدر آباد ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء

(۷۶) مجمع الامثال۔ کرمانی۔ ایران۔

(۷۷) مختصر جامع بیان العلم وفضلہ۔ ابو عمر بن عبد البر النمری۔ مطبعہ الموسوعات، مصر ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء

(۷۸) المختصر فی سیرۃ سید البشر (سیرت دمیاطی) حافظ عبد المومن دمیاطی متوفی ۷۰۵ھ / ۱۳۰۵ء قلمی۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مصنفؒ کی نظر سے پٹنہ کے کتب خانہ میں گذرا تھا۔

(۷۹) مستدرک حاکم۔ محمد بن عبد اللہ المعروف بالحاکم النیشاپوری۔ مطبعہ العلوم (۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء) مطبعہ مجتبائی (۱۲۲۸ھ / ۱۸۱۳ء) دائرۃ المعارف حیدر آباد (۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۶ء)

(۸۰) مسند ابی داؤد الطیالسی۔ حافظ سلیمان بن داؤد بن الجارود۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء

(۸۱) مسند امام احمد بن حنبل۔ امام احمدؒ۔ مطبعہ میمنیہ، مصر۔ ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۵ء

(۸۲) مشتبہ النسبۃ۔ ابو محمد عبد الغنی الازدی متوفی ۴۰۹ھ / ۱۰۱۸ء، مطبعہ انوار احمدی الہ آباد ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء

(۸۳) المشتبہ فی اسماء الرجال ۔ امام ذہبی ۔ مطبعہ بریل، لائیڈن ۔ ۱۸۶۳ء
(۸۴) المعارف ۔ ابن قتیبہ دینوری ۔ مطبعہ اسلامیہ، مصر ۔ ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء
(۸۵) المعجم الصغیر ۔ ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی ۔ مطبعہ انصاری، دہلی ۔ ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء
(۸۶) معجم البلدان ۔ شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت الحموی ۔ مطبعہ السعادہ، مصر ۔ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء
(۸۷) المغازی ۔ ابو عبداللہ محمد بن عمر الواقدی ۔ بشپ مشن پریس، کلکتہ ۔ ۱۸۸۵ء
(۸۸) الملل والنحل ۔ ابو الفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی المتوفی ۵۴۸ھ / ۱۱۸۲ء ۔ مطبعہ ادبیہ، مصر ۔ ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء ۔ برحاشیہ الفصل فی الملل والاہواء والنحل، ابن حزم ۔
(۸۹) المنار فی الاصول ۔ عبداللہ بن احمد ابو البرکات النسفی ۔ قلمی ۔
(۹۰) المواہب اللدنیہ ۔ احمد بن محمد القسطلانی ۔ مکتبہ یسیریہ، مصر ۔ ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء ۔
(۹۱) المؤتلف و المختلف فی اسماء نقلۃ الحدیث ۔ ابو محمد عبدالغنی بن سعید الازدی ۔ مطبعہ انوارِ احمدی، الٰہ آباد ۔ ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء
(۹۲) الموضوعات الکبیر ۔ ملا علی قاری ہروی ۔ مطبعہ مجتبائی، دہلی ۔ ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء
(۹۳) الموطا ۔ امام مالک بن انس ۔ مطبعہ السعادہ، مصر ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء برحاشیہ المنتقیٰ شرح موطا ۔
(۹۴) معرکہ مذہب و سائنس ۔ ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر، مترجمہ مولانا ظفر علی خاں ۔ رفاہِ عام اسٹیم پریس، لاہور ۔ ۱۹۱۰ء
(۹۵) میزان الاعتدال فی نقد الرجال ۔ حافظ شمس الدین ذہبی ۔ مطبعہ السعادہ، مصر ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء
(۹۶) نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ ۔ جمال الدین عبداللہ زیلعی ۔ مطبعہ علوی، لکھنو ۔ ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء
(۹۷) نور الانوار شرح منار ۔ ملا جیون امیٹھوی ۔ مطبعہ علی بخش ۔ ۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء
(۹۸) نور العین فی تلخیص سیر الامین المامون ۔ (ترجمہ فارسی کتاب سیرت حلبیہ) مطبعہ محمدی ۔
(۹۹) نور النبراس فی سیرۃ ابن سید الناس ۔ ابراہیم بن محمد ۔ مصنفؒ کے عہد میں اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء میں تھا ۔
(۱۰۰) وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ نور الدین علی بن سید السمہودی المتوفی ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء ۔ مطبعۃ الآداب ۔ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء

REFERENCE OF ENGLISH BOOKS

1. *Encyclopaedia Britanica, Article "Arab" By, G.W.Theacher. 11th Edition. 1910-11.*

2. *-Do- Article "Islam" By. Wilhousen.*

3. *Encyclopaedia of Ethics.*

4. *Dictionary of the Bible, By, Dr.Histenges.*

5. *Life of Mohammed, By. Margoleos, 1905.*

6. *Life of Mohammed, By, W.Muir, 1912.*

7. *Gold mines of Median, By, Berten.*

8. *A Literary History of Arabs, By, R.A.Nicholson, London, 1907.*

9. *Historian's History of the World. By, Prof.Nowldeke.1908.*

10. *Mohammed & Mohammedanism, By, Bosworth Smith.*

11. *A Literary History of Persia, By, E.G.Brown, 1909.*

12. *Heroes & Hero-Worship, By, Carlyle, 1846.*

Allama Shibli Nomani

SEERAT-UN-NABI

Vol. I

DARUL-MUSANNEFIN
SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH-276001 U. P. (INDIA)